مرتب و مدوّن
ضیاء الدین لاہوری

متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ لاہور۔ فون: ۲-۵۴۲۷۹۰۱-۰۴۲

اظہارِ تشکر

"خود نوشت حیاتِ سرسید" کی ترتیب و تدوین میں متعدد ذاتی کتب خانوں کے علاوہ مندرجہ ذیل لائبریریوں سے خصوصی استفادہ کیا گیا:

لاہور: پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ پنجاب پبلک لائبریری۔ عجائب گھر لائبریری۔ دار السلام لائبریری۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری۔ برٹش کونسل لائبریری۔ مجلس ترقی ادب لائبریری

کراچی: انجمن ترقی اردو لائبریری۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس لائبریری۔ ادارہ ہمدرد لائبریری۔

لندن: رائل ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری۔ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز (لندن یونیورسٹی) لائبریری۔ برٹش (میوزیم) لائبریری۔ انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز۔

مرتب و مدون کتاب ہٰذا استفادہ کی سہولتیں بہم پہنچانے پر متذکرہ بالا لائبریریوں کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہے اور ان کارکنوں کا بھی جنھوں نے متعلقہ مواد کی تلاش اور عکسی نقول فراہم کرنے میں اس کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔

عرضِ ناشر

ضیاء الدین لاہوری نے برصغیر کی نامور شخصیت سرسید احمد خاں کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر خاصی تحقیق کی ہے۔ متنازعہ امور میں حقائق تک پہنچنے کا اُن کا اپنا انداز ہے جو تحقیق کے شعبہ میں ایک اہم جہت متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اصل تاریخی دستاویزات کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور جب اُن تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو متعلقہ موضوعات کی تحریریں چن چن کر سامنے لاتے ہیں۔ اُن کے پیش کردہ حوالے خود بولتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اس طرح وہ ایسے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جنھیں پیشہ ور اہل قلم قارئین کی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں یا تحریفات کے ذریعے اصل معانی کو کچھ کا کچھ بنا ڈالتے ہیں۔ تحقیق میں انشاپردازی کے ذریعے من پسند نتائج اخذ کرنا اُن کے ہاں جائز نہیں۔

ضیاء الدین لاہوری نے سرسید کی اپنی تحریروں اور تقریروں کے متن سے ان کی حیات اور افکار سے متعلق اہم اقتباسات الگ الگ اس طرح ترتیب دیے ہیں کہ وہ سرسید کی "خودنوشت" کا روپ دھار گئے ہیں۔ اس صورت میں وہ بعض ایسے حقائق منظر عام پر لائے ہیں جو اکثر قارئین کے لیے سخت حیرت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ "خودنوشت حیات سرسید" اور "خودنوشت افکار سرسید" کے نام سے فاضل مرتب و مدوّن کی یہ کاوش سنجیدہ اہل علم میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے۔ جمعیۃ پبلی کیشنز ان تالیفات کی اشاعت نو پیش کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقائق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد ریاض درانی

متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول وحدت روڈ لاہور

فون 042-5427901-2

مرتب ومدوّن پر ایک نظر

(ضیاءالدین لاہوری)

پیدائش:

لاہور ۱۹۳۵ء

تعلیم:

ایم اے (ایجوکیشن) ۱۹۶۶ء

انسٹیٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ پنجاب یونیورسٹی' لاہور

پیشہ:

تعلیم وتحقیق

مطبوعہ تصانیف:

سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، خودنوشت حیاتِ سرسید، خودنوشت افکارِ سرسید نقشِ سرسید، آثارِ سرسید، کتابیاتِ سرسید، سرسید اوراُن کی تحریک، جوہرِ تقویم رویت ہلال موجودہ دور میں، بہادر شاہ کے شب وروز، مغلیہ دہلی کے آخری ایام ۱۸۵۷ء کے چند کردار، Hijra & Christian Calendars

موضوعاتِ تحقیق:

سرسید اور تحریک علی گڑھ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، اسلامی تقویم، رویت ہلال

نقل وطن اور تحقیقی کام:

محکمہ تعلیم وسائنس انگلستان کی منظوری سے ۱۹۷۰ء میں برطانیہ میں آباد ہونے کے حقوق حاصل ہوئے۔ ۱۹۹۷ء تک چودہ مختصر دورانیوں کے قیام کے بعد واپس وطن میں اہل خانہ کے ساتھ رہائش اختیار کرلی۔ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے علاوہ سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن یونیورسٹی، اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں سے بھرپور استفادہ کیا اور تحقیقی مقالے تحریر کیے جو پاک وہند کے موقر علمی جرائد میں طبع ہوئے۔

چند خیالات

(ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری)

سرسید احمد خاں انیسویں صدی کی ایک پرعظمت شخصیت تھے۔ ان کے اثرات بیسویں صدی میں بھی چھائے رہے ہیں۔ علم وفن کے الگ الگ دائروں میں بعض شخصیات کے مقاماتِ بلند سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن زندگی کے مختلف گوشوں کو متاثر کرنے والی شخصیت اور اہل علم اور اصحابِ فکر کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شخصیت سرسید کے سوا کوئی اور نہیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حالی نے ''حیاتِ جاوید'' لکھ کر سرسید کی شخصیت' سوانح' افکار وسیرت اور خدمات کے تذکرے کا باب بند کر دیا اور قلم توڑ دیا ہے۔ اگرچہ اسی دائرہ فکر کے بعض اہل نظر مثلاً نواب صدر یار جنگ' حبیب الرحمن خاں شروانی' شیخ عبدالقادر لاہوری' علامہ شبلی نعمانی اور متعدد دوسرے اہل علم ونظر نے اسی وقت اس کے بیان کی صحت' اس کی جامعیت اور خاتمیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا لیکن ہر کام اپنی تکمیل اور انجام کے لیے ایک وقت کا رہین منت ہوتا ہے۔ وہ حقائق اور جن امور کی تفصیل اور پس منظر تلاش کرنے سے حالی کی نگاہ قاصر اور بیان کرنے میں قلم ناکام رہا تھا' ان کے اظہار و بیان کے لیے زمانے کو ضیاء الدین لاہوری کا انتظار تھا۔ ضیاء الدین لاہوری اور ہم سب حالی کے نیازمند ہیں۔ وہ قوم کے فکری رہنما تھے' وہ تہذیب کا مجسمہ اور شرافت کا پیکر تھے' وہ قوم کے بہت بڑے محسن اور کئی جہات سے عظیم تھے' لیکن جب وہ ''حیاتِ جاوید' کی تالیف کا سروسامان کر رہے تھے تو تاریخ نے بہت سے حقائق سے پردہ نہیں ہٹایا تھا۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ سرسید کے فضائل وکمالات اور خدمات کے تذکرے کے ساتھ ان کے گھر سے نکالے جانے' بیٹے کے ہاتھوں بے عزتی اور دوست کے گھر میں وفات پانے اور غیروں کے دیے ہوئے کفن میں دفن ہونے کے شرمناک واقعات کا بھی کسی نہ کسی انداز میں ذکر ضرور کر دیتے اور جس طرح ان کی تفسیر سے خود اختلاف ظاہر کر دیا ہے اور وقار الملک' محسن الملک' ڈپٹی نذیر احمد کے ایرادات کا ذکر کیا ہے' نیز تعلیم کے نتائج اور اس کے پھل کی کڑواہٹ کا بھی کسی نہ کسی حد تک دل پر جبر کر کے اظہار کر دیا ہے' انگریزوں کی خدمت گزاریوں کی تفصیل بیان کی ہے اور ان کی بعض ناکامیوں اور حسرتوں کی پامالی کا بیان کیا ہے' وہ بہت سے ان واقعات وحوادث کا بیان بھی کر دیتے

ہیں جن کی تفصیل ضیاء الدین لاہوری نے اپنی کتابوں میں بیان کی ہے۔

ضیاء الدین لاہوری اس دور میں سرسید کے سب سے بڑے محقق ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں ان کی تحقیق کا سب سے بڑا موضوع سرسید کی شخصیت، سوانح اور علوم و افکار رہے ہیں۔ سرسید پر انہوں نے چار کتابیں اور بیسیوں مقالے لکھے ہیں۔ یہاں ان کی دو کتابوں کے مطالب زیر غور ہیں۔ خودنوشت حیات سرسید اور خودنوشت افکار سرسید۔ کتابیں مرتب کر دینا اور ان کا شائع ہو جانا آج کے دور میں مشکل نہیں رہا۔ چند کتابیں سامنے رکھیں اور ایک نئی کتاب بنا دی لیکن محترم ضیاء الدین لاہوری نے ان کتابوں کا مواد فراہم کرنے میں ایک قرن بتا دیا ہے۔ برس ہا برس تک انڈیا آفس، برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کی لائبریریوں میں سینکڑوں کتابوں، فائلوں اور دستاویزوں کی خاک چھانی ہے اور پاکستان کے تاریخی علمی خزائن سے استفادہ سے اور مواد کی تنقید اور غور و فکر کے بعد یہ کتابیں مرتب کی ہیں..... سرسید کی شخصیت، ان کے سوانح، ان کے افکار، زندگی کے حوادث اور سیرت و خدمات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے بارے میں سرسید نے کچھ بیان کیا ہو یا اُن کے قلم سے نکلا ہو اور ان کتابوں میں اپنے محل میں سلک تالیف میں اسے نہایت سلیقے سے پرو نہ دیا گیا ہو۔ جو کچھ ہے سرسید کی زبان اور ان کے قلم سے ہے۔ مؤلف نے کوئی جملہ اپنی طرف سے نہیں لکھا، کسی بات پر خوب و زشت کا حکم نہیں لگایا، ان کی کسی بات کو تختۂ مشق اور ہدف تنقید نہیں بنایا۔ خودنوشت حیات اور افکار کی دو جلدیں تعارف و مقدمات وغیرہ کو چھوڑ کر چھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہیں، ان کے مواد کو اپنی تحریر و تبصرے کے شرک سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ غلط یا صحیح، اچھا یا برا جو کچھ ہے خواہ آپ کو پسند آئے خواہ نہ آئے، سرسید کا ہے اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ کتابیں سب مل کر بھی حالی کی "حیات جاوید" کی ضخامت کے تقریباً نصف کو پہنچتی ہیں لیکن مباحث کے تنوع، مضامین کی کثرت، واقعات کی جامعیت، اندراجات کی صحت اور درجہ استناد میں ان کا پایۂ تحقیق و جہت اعتبار "حیات جاوید" سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کتابوں پر طویل و مختصر پچاسوں تبصرے آ چکے ہیں لیکن ابھی تک کوئی ناقد و مبصر اس کے کسی حوالے پر انگلی نہیں رکھ سکا کہ وہ غلط ہے یا اس میں کسی قسم کی قطع و برید کی گئی ہے۔ ان کتابوں پر مختلف اہل قلم نے تنقید و تبصرہ کی نگاہ ڈالی ہے..... لیکن سب چند ایک بے قراریوں اور غصہ و اشتعال کے سوا ابھی تک کوئی ایسی تحریر سامنے نہیں آئی جس میں ان کتابوں کے کسی حوالے کو چیلنج کیا گیا ہو۔

([illegible] کی ایک تقریب منعقدہ ۱۹۹۹ء میں ہونے والے خطاب سے چند اقتباسات)

فہرست مضامین

مزید جھڑپوں میں چودھریوں پر آفت

نوابی لشکر کا روڑکی پر ناکام حملہ

انگریزی فوج باقاعدہ میدان عمل میں

باغیوں کی مکمل پسپائی

نواب اور چودھریوں کی سپاہ کا حال

اخلاق و اوصاف

قومی ہمدردی کے کاموں کا آغاز

لندن کا سفر

بمبئی میں مصروفیات

بحری سفر کا آغاز

یورپین اسٹاف کے متعلق اعتراضات

کالج کے چند اہم مقاصد

کالج میں غبن

فکرِ مستقبل

انجمن سازی

تصنیف و تالیف

تصانیف کا مختصر تعارف

مصنف کی لائف پر تالیفات

مطاعن و فتاویٰ

کفر کے فتوے

مولوی، ملانوں، پیروں کا کردار

قابلِ ذکر واقعات

تعصب کے مظاہر

علمی مجلسیں

واقعاتِ نادرۃ الوجود

قومی مسائل

دہلی کی باتیں

متفرق

مسمریزم کے مشاہدات

چند خواب

ذاتی اوصاف

شکل و شباہت اور طرزِ بود و باش

عادات و خصائل

حرفِ آخر

کتابیات

مطالعہ سرسید کے ماخذ

تصویریں اور عکسی نقول

یادگار تصاویر

تصانیفِ سرسید سے چند اہم مطبوعہ اقتباسات کے عکس

رسائل اور تصانیف کے سرورق

مخطوطہ جات

"سر" کے خطاب کا حصول

قصہ مفتیانِ حرمین شریفین کے فتووں کا

نقشہ جات

متفرق

حیاتِ سرسید کے چند اہم خاکے

حرفے چند

(ڈاکٹر تحسین فراقی)

اکبر کے نورتن اور اردو کے پنج تن' تاریخ اور ادب کی دنیا میں خوب جانے پہچانے ہیں۔ موخر الذکر عناصرِ پنج گانہ میں اولین حیثیت سرسید کی ہے جو دراصل اس اجتماعِ لطیف کے گلِ سرسبد کہے جا سکتے ہیں۔ اپنی انگلیوں کی آخری پوروں تک اس زندہ اور متحرک آدمی نے برعظیم کی دنیا بدل دی (اور بعض کے خیال میں عاقبت خراب کر ڈالی!)

سرسید کے نانا ایک قابلِ اعتماد خیر خواہ ہونے کے باعث انگریزی حکومت سے اعلیٰ منصب پاتے رہے جبکہ ان کی بیٹی یعنی سید احمد خاں کی والدہ بدعات سے کوسوں دور ایک تعقل پسند خاتون تھیں۔ سرسید کو انگریز سے وفاداری' اس کے مفادات کی محافظت اور تعقل پسندی ورثے میں ملیں۔ اس باب میں وہ وفادار ملازم اور سعادت مند فرزند ثابت ہوئے۔ جنگِ آزادی کو انہوں نے ہمیشہ غدر کہا۔ اسے ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال قرار دیا۔ انگریز کے خلاف جنگ لڑنے والے ان کے نزدیک نہایت جاہل' بدمعاش' بے علم' حرامزادے' نمک حرام اور نامحمود تھے۔ ان کے نزدیک آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ مالیخولیا کا مریض تھا اور ملکہ معظمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ تھا۔ دورانِ جنگ سرسید نے انگریزی حکام کے لئے پرچہ نویسی کی خدمات بھی بہ طیبِ خاطر اور جزوِ ایمان سمجھ کر انجام دیں۔ ان کے خیال میں تو ایسے نازک وقت میں سرکارِ انگلشیہ کی طرفداری سب ہندوستانیوں پر واجب تھی۔ اس وفاداری کے عوض ان کو صدر الصدور کے عہدے پر ترقی دی گئی اور دو سو روپیہ ماہانہ پنشن مقرر کی گئی۔

یہ اور اس طرح کی نہایت بیش قیمت معلومات سرسید کی اپنی تصانیف میں بکھری پڑی تھیں جنہیں یکجا کرنے کا خیال گوشہ نشین' درویش صفت اور بے باک نگار ضیاء الدین لاہوری کو سوجھا اور انہوں نے اسے سرسید کی خود نوشت سوانح کا روپ دے دیا۔ ضیاء الدین لاہوری سرسید کے متخصص کی حیثیت سے اردو دنیا میں خوب معروف ہیں۔ انہوں نے مصلحتوں کی پروا کئے بغیر خود سرسید کی مختلف تصانیف اور ان کی بعض سوانح سے ریزہ ریزہ معلومات اور اقتباسات چن کر ان کو ایک عمدہ اور چشم کشا آپ بیتی کا روپ دیا ہے اور اس میں ایک ایسی نامیاتی وحدت پیدا کر دی ہے کہ ان کی اس مسیحائی پر اہلِ ادب کو حیرت ہو گی۔

مجھے یقین ہے کہ جہاں ایک طرف یہ قابلِ قدر تالیف برعظیم کی اس انقلاب انگیز شخصیت کے غیر جانبدارانہ مطالعے میں بے حد معاون ہو گی وہیں مجھے اندیشہ ہے کہ سرسید کے بے مغز عشاق اور اپنے گنبدِ دستار کے لئے اینٹیں اکٹھی کرنے والے فتویٰ فروش دونوں کو یہ علمی کاوش ایک آنکھ نہیں بھائے گی۔ مگر کیا کیا جائے' حق تو ہمیشہ سے کڑوا ہے اور تلخی سے موافقت کئے بغیر تجلی کا ظہور ممکن نہیں ہوتا!

واقعہ یہ ہے کہ زیرِ نظر تالیف فاضل مولف کے پچیس تیس سالہ مطالعہ سرسید کا حاصل ہے اور اس میں ان کی حیات و میلانات کے کم و بیش سارے تموجات بند ہیں:

رشتہ بہ رشتہ' نخ بہ نخ' تار بہ تار' پو بہ پو

عرضِ احوال

(از مُرتّب)

انگریز برصغیر میں ڈیڑھ صدی کے لگ بھگ بلاشرکتِ غیرے حکمران رہا۔ اس سے قبل بھی اس نے ایک طویل عرصہ تک مغل تاجداروں کی انتظامیہ کے روپ میں ہم پر بالواسطہ حکومت کی۔ دوسرے الفاظ میں ہماری متعدد نسلیں کسی نہ کسی صورت اس کی غلامی میں جکڑی رہیں۔ محکومی کا یہ طویل دور ہماری قوم کے عمومی مزاج پر بھی غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتا رہا۔ اپنی حکومت کو دوام بخشنے کے لئے اس نے بڑی مکارانہ حکمتِ عملی اختیار کی جس سے بعض تعلیمی منصوبوں کے ذریعہ عوام میں آزادی کے جذبہ کو کچلنا بھی شامل تھا۔ علم کی مختلف اصناف میں آمیزش کی گئی۔ اس ملاوٹ شدہ تعلیم کا جو ٹکڑا ہمارے سامنے پھینکا گیا ہم نے برضاوخوشی یا بمجبوری اٹھالیا۔ کسی کے حلق میں وہ آسانی کے ساتھ اتر گیا اور کسی نے نگلتے ہوئے اس میں ملے ہوئے زہر کی کڑواہٹ محسوس کرلی۔ انگریز نے اپنے مقاصد پورا کرنے کے لئے ہماری قوم کے مراعات یافتہ طبقے کے بعض "سیانے" افراد پر ملمع سازی کی اور انہیں مذہبی رہنماؤں اور قومی ہمدردوں کے بھیس میں ہم میں چھوڑ دیا۔ جو صحیح معنوں میں ہمدرد تھے ان کی صورتوں کو اس پروردہ طبقے کے ذریعہ مسخ کر کے ہمارے سامنے پیش کیا اور اس طرح ان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹانے کی

بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہوا اور اپنے خاص الخاص کارندوں کو نہ صرف ہمارے ہی ہاتھوں سے قومی رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا بلکہ ان کی شہرت کو چار چاند بخشنے کے لئے کل ذرائع استعمال کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے حقیقی رہنماؤں کو ہمارے ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش کی جن میں سے بہت سوں کو ہم واقعی بھلا بیٹھے یا ان کی بلند شخصیتی کو منفی انداز میں قبول کیا۔

۱۸۵۷ء کے دل خراش واقعات کو ہمارے تعلیمی اداروں میں عموماً "غدر" کے نام سے پڑھایا جاتا رہا۔ آزادی کے حصول سے کچھ عرصہ بعد جب ہم نے گذشتہ تاریخ کو اپنے قومی تقاضوں کے مطابق مرتب کرنا شروع کیا تو یہ لفظ "جنگِ آزادی" کے نام سے موسوم ہوا۔ انگریز کے "فسادی اور غادر" ہمارے "مجاہد" قرار پائے اور "سرکشی" کی داستانیں "سرفروشی" کی کہانیاں تسلیم ہوئیں۔ رفتہ رفتہ ہماری تاریخ کے وہ حصے بھی اجاگر ہونے لگے جنہیں ہم بالکل فراموش کر چکے تھے۔ اس شعور کے ساتھ انگریز کے بہت سے نامی گرامی خیر خواہ' جو ہمارے ذہنوں پر قومی رہنماؤں کی صورت میں زبردستی حاوی کر دیئے گئے تھے' نقاب کشائی کی دسترس سے محفوظ رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان پر مزید ملمع چڑھا کر اس کی مصنوعی چمک سے دوسروں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نظریاتی الجھنوں کا شکار ہوگئے۔ اس ضمن میں تضادِ خیالی کے الزام سے بچنے کے لئے ایک نہایت ہی آسان اور مؤثر مطلاح "مصلحتِ وقت" یا "حالات کا تقاضا" کی آڑلی گئی جس کے تحت ہمارے لئے ہر وہ امر جائز قرار پایا جو ہماری نظریاتی وابستگی کے دعووں کی نفی کرتا ہو۔ یہ اصطلاح صرف حقائق کو چھپا کر ہی نہیں استعمال کی گئی بلکہ اس کے لئے واقعات کو غلط رنگ میں پیش کرنا یا خود ساختہ واقعات کو اپنے مقاصد کی بنیاد بنانا ہماری ضرورت بن گئی۔ اس کوشش میں وہ لوگ اور ان کے ہمدرد حلقے پیش پیش رہے جن کے اسلاف کو ان کے غیر ملکی آقاؤں نے اپنے حق میں انجام دی گئی خصوصی خدمات کے عوض نسلاً بعد نسل انعامات سے نوازا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان شخصیتوں کو ان کے اصلی چہروں کے ساتھ پیش کر کے اپنے خاندانی بزرگوں اور ان کے ہم ضمیر افراد کی "نیک نامی" پر بٹا لگائیں۔ "دانشور" کہلوانے کے شوقین پیشہ ور مصنفین اور دیگر مضمون نگار دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس صورتِ حال کو مزید تقویت پہنچانے کا باعث ہوئے' لہٰذا نئی نسلیں جو یہی باتیں سن سن کر جوان ہوئیں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ حقائق کی غیر موجودگی میں وہ بھی ان شخصیات کے گن گانے لگیں۔

ہماری قوم کی اکثریت کے مزاج کو اغراض پسند طبقوں نے شخصیتوں کے معاملے میں نہایت حساس بنا ڈالا ہے۔ نہ ہم دل میں کسی کے لئے عقیدت پیدا کر لیں تو اسے پوجنے کی حد کو جا

تو پہنچتے ہیں اور اس کے برعکس نفرت کرنے پر اتریں تو نہ صرف یہ کہ موت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے بلکہ اس کی لاش پر بھی مسلسل لٹھ مار مار کر اپنے جذبات کو تسکین پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ شخصیات بھی عام لوگوں کی طرح گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں اور ہر انسان خوبیوں اور کمزوریوں کا حامل ہوتا ہے۔ کسی میں ایک پلہ بھاری ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔ ایک فرد میں چند ایسی خوبیاں ہیں جو دوسرے میں بالکل موجود نہیں جبکہ دوسرا جن خوبیوں کا مالک ہے پہلا ان سے عاری ہے۔ پھر دو افراد بعض خوبیوں او کمزوریوں میں یکساں بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ بدنام لوگوں میں بھی بعض ایسے اوصاف بدرجۂ اتم پائے جا سکتے ہیں جن کا نشان بعض نیک نام افراد میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔ اسی طرح نیک نام لوگ بھی بعض ایسے افعال کے مرتکب ہو سکتے ہیں جن کی ان سے قطعاً توقع نہ کی جا سکتی ہو' کیونکہ کمزوریاں بہرحال انسانی فطرت کا ایک حصہ ہیں۔ اخلاقی طور پر کسی فرد کے عیوب تلاش کرتے رہنا کسی طور مستحسن نہیں مگر شخصیت پرستی کے زیرِ اثر پسندیدہ افراد کے عیوب کو خوبیوں کے کھاتے میں ڈالنا اور ناپسندیدگی کی صورت میں کسی کی خوبیوں کو عیوب کے طور پر بیان کرنا اس سے کہیں زیادہ ظلم ہے۔ شخصیات کے اقوال و افعال قوم کے مجموعی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا صورت میں قوم کے افراد "منفی صلاحیتوں" کو خوبیاں سمجھ کر اپنانے کی کوشش کریں گے اور حقیقی خوبیوں سے احتراز کرنے لگیں گے۔ یوں وہ محاسن و قبائح کی شناخت کھو بیٹھیں گے اور یہ غلط حکمتِ عملی بالآخر بحیثیتِ مجموعی قوم کے کردار کو بگاڑ کر ان کی تباہی پر منتج ہوگی۔

اختلاف رائے کوئی بری شے نہیں۔ انبیاءِ کرام علیہم السلام اور چند بزرگانِ دین" کو چھوڑ کر کوئی شخصیت ایسی نہیں جس سے ہم مکمل طور پر اتفاق کر سکیں۔ بہت سی نامور ہستیاں بعض معاملات میں ایک دوسرے کی سخت مخالف ہونے کے باوجود عام لوگوں کے لئے قابلِ احترام ہوتی ہیں' مگر یہ عجیب معیار ہے کہ اگر زید ہمارا پسندیدہ شخص نہیں تو وہ جو کہے اس کا قول مردود ٹھہرے لیکن وہی بات انہی حالات کے تحت انہی الفاظ میں بکر بیان کرے تو چونکہ مؤخرالذکر ہمیں پسند ہے اس لئے اس کا وہی قول مستحسن قرار پائے' بلکہ اسے ایسا ثابت کرنے کے لئے ہم حقائق کو توڑ مروڑ کر رکھ دیں۔ یوں اپنی نگاہوں میں تو ہم ان شخصیات کے ساتھ عقیدت یا نفرت کے اظہار کی انتہا کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں مگر حقیقتاً ان سے انصاف نہیں کر پاتے کہ جن مقاصد کی خاطر انہوں نے اپنی زندگیاں وقف کیں ہم نے اپنی مرضی کے مطابق ان کی ایسی تاویلیں کیں جو آن کے نصب العین کی نفی کرتی ہیں۔ اچھائی یا برائی میں تمیز کرنے کا ہم نے یہ غیر حقیقی معیار قائم کر رکھا ہے کہ ہماری پسندیدہ شخصیت کی ہر بات اچھی ہے اور مخالف کی ہر بات

بری۔ یا پھر ہم ان سے ایسی اچھائیاں یا برائیاں منسوب کر دیتے ہیں جو ان میں موجود ہی نہیں ہوتیں۔ اس مقصد کے لئے ہم مہارت آرائی کے فن سے کام لے کر خوب خوب توجیہہ سازی کرتے ہیں اور دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں تاکہ اپنی منطق سے دوسروں کو مرعوب کیا جا سکے۔ اس مسلسل بے بنیاد عمل سے ہم کسی شخصیت کی ایک خود ساختہ تصویر دوسروں کی نگاہوں میں اس طرح بٹھا دیتے ہیں کہ ایک عرصہ بعد عام لوگ اسے ہی حقیقی تصویر سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس نفسیاتی حربے سے کام لیتے ہیں کہ "جھوٹ بولو، خوب بولو، اتنا بولو کہ اس پر سچ کا گمان ہونے لگے"۔ یہ تدبیر جلد یا بدیر پختہ ذہنوں پر بھی کارگر ہو جاتی ہے جبکہ زیر تعلیم ناپختہ ذہن اس کا شکار نہایت آسانی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو پھر سچی بات بیان کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اس قسم کی جسارت کرے تو ہم جذباتی نعروں کے سہارے اس کی ایسی درگت بناتے ہیں کہ بیچارے کو خاموش رہتے ہی بن پڑتی ہے۔ ان حالات میں آئندہ کے لئے کوئی شخص اس معاملہ میں حقائق پیش کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا اور یوں سچائی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت بعض قومی معاملات میں ایک مدت سے تدریسی کتب اور ذرائع ابلاغ کی وساطت سے قوم کی ذہنی تطہیر کی جا رہی ہے اور اس طرح جو "دانشور" طبقہ تیار کیا جاتا ہے وہ نادانستگی میں بعض مخصوص دروغ بیانیوں کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوئے ان کی پرورش اس انداز میں کرتا ہے کہ یہ ہماری تاریخ کی ایک ناقابلِ تردید سچائی سمجھ لی جاتی ہیں، جبکہ اس ماحول کے زیر اثر تربیت پانے والے اساتذہ کرام تعلیمی نصاب کی روشنی میں یہی خیالات نئی نسل کو منتقل کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

سر سید احمد خاں ماضی قریب کی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی ترجمانی کرتے ہوئے ہم نے حق و صداقت سے کام نہیں لیا۔ اگر ہمیں اپنے نظریہ کے مطابق ان کے بعض اقوال و افعال سے اصولی اختلاف ہے تو سخن طرازی کے جوہر دکھا کر ان کی ہر اچھی بات کو بھی رد کر ڈالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ڈھیروں ثواب کما لیا۔ اس کے برعکس اگر ان کے عقیدت مند ہوئے تو حسین الفاظ کی بندش کے ساتھ ان کے ہر کام کی عظمت بیان کر کے یہ خیال کرتے ہیں کہ حق ادا کر دیا مگر اس ادائے حق میں ہم بعض حقائق کو بری طرح مسخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ہماری کیفیت کچھ یوں ہوتی ہے کہ پیشہ ور مضمون نگاروں کی مانند ان کے ایک دو مقالات سرسری طور پر پڑھے، اگر خدا نے توفیق دی تو ان کی شخصیت کے متعلق مخصوص طرز فکر کے حامل ایک آدھ مقالہ کا ہلکا سا مطالعہ کیا اور ان کی مدد سے ایک نیا مقالہ لکھ ڈالا۔ یوں جو لقمہ اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے ملا، اسے نگلا اور پھر نیا رنگ دے کر اسے دوسروں کے لئے اگل دیا۔ اپنے مقالوں کی پیداوار میں کمی کے خدشہ کے پیشِ نظر ہم نے ان کی اصل تصانیف کے مطالعہ کی زحمت تو گوارا نہ کی مگر اس عہد کی ایک حقیقی

تصویر پیش کرنے کا دعویٰ کر دیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ ہر ایک نے دوسروں پر عبارت آرائی میں سبقت لے جانے کی کوشش کی اور اس طرح دانشوری کے چسکے میں ہم نے انشا پردازی کے زور سے برصغیر کے اُس دور کی تاریخ کا حلیہ بگاڑ ڈالا۔ مثال کے طور پر جب ہم ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ذکر کرتے ہیں تو سرسید کی قومی خدمات کا زمانہ ہمیشہ اس واقعہ کے بعد سے شروع کرتے ہیں اور خاص اس جنگ کے دوران انہوں نے مسلمانوں کے ضمن میں جو خصوصی ردِ عمل اپنایا اس کا ذکر ارادتاً گول کر جاتے ہیں حالانکہ انہوں نے اپنی تالیف "سرکشی ضلع بجنور" میں اس کا بالتفصیل ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سرسید اپنی جن خدمات پر عمر بھر فخر کرتے رہے ہم ان کا تذکرہ غالباً اپنی ہتک سمجھتے ہیں اور جس نظریہ کے خلاف وہ آخر دم تک وعظ کہتے رہے انہیں اسی کا خالق قرار دینے لگتے ہیں۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں پر کئے جانے والے انگریزوں کے مظالم کو بڑے دردناک انداز میں بیان کر کے اس سلسلہ میں سرسید کی خدمات کا اظہار بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ جنگِ آزادی کو اپنی تمام تر کوششوں سے ناکام کروانے اور بیچارے مسلمانوں کو اس عتاب کا نشانہ بننے کے حالات پیدا کرنے میں اسی ملت کے بعض "محسنانِ عظیم" نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔

سرسید برصغیر میں انیسویں صدی کی ایک نہایت اہم شخصیت کے طور پر معروف ہیں۔ وہ ایک ادیب، انشاپرداز، صحافی، سیاستدان، مؤرخ، فلسفی، عالمِ دین، مُفسّر، مُفکّر، مُبصّر، مُقرّر اور قانون دان ہی نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ ان کا شمار تعلیمی ماہرین میں بھی کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ کالج اور سرسید کا نام ہمیشہ لازم و ملزوم رہیں گے۔ ان سے منسوب تحریک علی گڑھ ان کی شہرت کو بلند و ارفع کرنے کا سبب بنی۔ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک خاص نہج پر چلا کر انہوں نے بڑا نام پیدا کیا اور ریفارمر بھی کہلوائے۔ وہ ایک باعمل انسان تھے، جو کہتے تھے اسے کر کے بھی دکھلاتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ اپنے عزائم کی تکمیل کے لئے انہوں نے متنازعہ فیہ شخصیت بننا گوارا کر لیا مگر جو چاہا سو کیا۔ مخالفین کی گھن گرج کے درمیان بھی وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے مشن میں ہمہ تن مصروف رہے۔ ان کے بعض کام کسی کی نظر میں کتنے ہی غلط ہوں، ان کی ہمت اور ثابت قدمی کے اصل اسباب ان کے پیچھے وقت کی سیاہ و سفید کی مالک "قوتِ عظمیٰ" کا مکمل تعاون ہی کیوں نہ بتایا جائے، مخالفتوں کے شدید طوفان میں قابلِ رشک جوش و خروش کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہنا ان کے عزم و حوصلہ کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ وہ جس کام کو اپنے طور پر درست سمجھتے تمام رکاوٹوں کو پھلانگتے ہوئے کر گزرتے۔ خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ جزئیات کی حد تک بھی اپنی رائے پر وثوق رکھتے، اپنی رائے کی مخالفت میں کسی تجویز کو

خاطر میں نہ لاتے اور چٹان کی طرح ڈٹ کر ہمیشہ اپنے ہی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے۔ فنی توجیہات میں وہ ایک کامیاب ترین فرد تھے اور اس میں انھیں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ان کی توجیہات سے کوئی اتفاق کرے یا اختلاف' حقیقت یہ ہے کہ وہ اس فن پر مکمل عبور رکھتے تھے اور اس گُر سے کام لے کر وہ بڑے بڑے معرکہ آرا پہلوانوں کو نہایت چالاکی کے ساتھ چت کر لیا کرتے تھے۔ ان کی عملی زندگی کا ابتدائی زمانہ زبردست مناظرہ بازی کا حامل رہا اور ان کے مذکورہ وصف کے پُر تاثیر ہونے کے باوجود ایک حلقہ بڑے زور و شور سے ان کے خلاف سرگرم عمل رہا۔ مختصراً سرسید انیسویں صدی کی ایک ایسی ہنگامہ خیز اور پُر عمل مسلسل تحریک کا نام ہے جو مسلمانوں کی قومی بھلائی اور ترقی کے نام پر ایک مدت تک جاری رہی اور جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر نہایت اہم مثبت اور منفی اثرات مرتب کئے۔

تاریخی شخصیتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے تصویر کے دونوں رخ مدِ نظر رکھنا ضروری ہوتے ہیں۔ دوسری طرح ہمیں پسند آئے یا نہ آئے ہم حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ اس عمل کو دوسروں کی عیب جوئی' ان میں کیڑے نکالنا یا گڑے مردے اکھاڑنا سے تعبیر کرنا سچائی سے فرار کی کوشش کے مترادف ہے۔ عام حالات میں یہ کام واقعی گناہ تصور کئے جاتے ہیں مگر تاریخ نویسی میں یہ قباحت کے زمرے میں نہیں آتے۔ گزشتہ واقعات کی تاریخ بیان کرنا دراصل گڑے مردے اکھاڑنا ہی تو ہے۔ تاریخ سے ہم سبق سیکھتے ہیں اور یہ ہمیں صحیح راہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ علاوہ ازیں اصل واقعات کی کرید سے ہمیں اپنے بزرگوں کی گزشتہ غلطیوں کی نشان دہی ہوتی ہے اور ہم آئندہ کے لئے ان کے اعادہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ سرسید نے ایک موقع پر اس کی اہمیت یوں اجاگر کی ہے :۔

> "جب میں اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ راستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے اور اس سبب سے وہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہو گا"۔
>
> (خطباتِ سرسید (۱)' ص ۸۳)

اسی طرح ایک اور موقع پر انھوں نے کہا :۔

> "دنیا میں گزرے ہوئے واقعات سے ہم کو عبرت پکڑنی چاہئے"۔
>
> (مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید' ص ۸۴)

چند لمحوں کیلئے اگر تاریخی واقعات کے بیان کو منفی انداز میں گڑے مردے اکھاڑنا ہی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ کوئی درست پیمانہ نہیں کہ اپنے مخالفین کے گڑے مردے اکھاڑنے کا

عمل ایک وصف ہو جبکہ ہماری پسندیدہ شخصیتوں کے خلاف دوسروں کا یہی عمل بنیادی طور پر غلط قرار پائے۔ کسی نے بڑی ہی سچ بات کہی ہے کہ "تاریخ تاریخ ہوا کرتی ہے' بے شک عقیدتیں مجروح کیوں نہ ہوں" اور دراصل اندھی عقیدت ہی سچائی قبول کرنے کو مانع ہوتی ہے۔

سرسید جس خاص مشن کو لے کر چلے تھے اس کے بعض نکات میں انہوں نے اپنی زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کی مگر ان کے انتقال کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا اور وہی کچھ ہوا جسے قوم نے اپنے مفاد میں بہتر سمجھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم خود ساختہ تاویلوں کے سہارے یہ دعویٰ کریں کہ وہی کچھ ہوا جو سرسید چاہتے تھے۔ وہ کیا چاہتے تھے؟ اس دور میں جب کہ انشاپردازوں کے رنگ آمیز مقالوں سے متاثر ہو کر ہمارے ذہن بعض غیر حقیقی توجیہات کو قبول کر چکے ہیں ہمیں دوسروں کی آرا پر انحصار کرنے کی بجائے خود ان کے اپنے الفاظ کو تلاش کرنا ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے نہ گھبرائیں' دن کو دن کہیں اور رات کو رات۔ اگر ہم نادانستہ طور پر پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں تو حقیقت معلوم کر کے ہمیں ان خیالات سے رجوع کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ خود سرسید کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ رجوعات سے بھرا پڑا ہے' بلکہ کئی مرتبہ تو انہوں نے رجوع در رجوع سے کام لیا ہے۔ جب بھی ان کے نظریات میں تبدیلی آئی انہوں نے بڑی جرات سے کام لے کر اپنے سابقہ افکار کو باطل ٹھہرایا اور ذرا بھی سبکی محسوس نہ کی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے برملا کہتے تھے۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر اپنے خیالات' جنہیں بعض مصلحتوں کے تحت ہم آج چھپاتے پھرتے ہیں' بڑے دھڑلے کے ساتھ پیش کئے اور اپنے جن گذشتہ امور کو غلطیاں سمجھا ان کا اعلانیہ اقرار کیا۔ مثال کے طور پر اردو ادب کے عناصر خمسہ کا یہ عظیم فرد بحیثیت ممبر لیجسلیٹو کونسل ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمشن کے سامنے بیان دیتا ہے کہ

> "میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سود مند رہے گا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ (یادداشت) ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہلِ ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان پر ہی محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی' بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے۔ اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے' لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور ا[illegible]

غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ قائم کی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کیا مگر انجام کار اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا"۔

(حیاتِ جاوید، حصہ اول ص ۲۳۶)

سرسید زمین کی گردش کے نظریے کے خلاف اپنی ایک تصنیف کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ہم نے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام ہے "قولِ متین فی ابطالِ حرکتِ زمین" اور فخر کرتے تھے کہ نہایت خوبی سے ہم نے حرکتِ زمین کا ابطال کیا ہے مگر جب غور کیا تو جانا کہ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"۔

(آخری مضامین ص ۴۸)

اسی طرح اپنی ایک تصنیف "جلاء القلوب بذکر المحبوب" کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:۔

"اب افسوس ہوتا ہے کہ اس میں بہت سی نامعتبر بلکہ لغو باتیں ہیں"

(تصانیفِ احمدیہ حصہ اول، جلد اول ص ۱۹)

اس کے علاوہ ایک اور تصنیف "راہِ سنت در ردِّ بدعت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اُمورِ معاشرت و تمدن کو بعض نے مذہب میں شامل کر لیا ہے اس کو صحیح نہیں مانتا بلکہ جہل و غلطی جانتا ہوں"۔

(تصانیفِ احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص ۱۳۵)

یوں اپنی غلطیوں کا علانیہ اعتراف کر کے اس سلسلے میں سرسید نے عالی کردار کا حامل ہونے کا ثبوت مہیا کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ

"میں جس مسئلہ کو حق اور سچ سمجھتا ہوں بلا خوف اس کو کرتا ہوں۔ بقول شخصے "از خدا شرم دار و از خلق شرم مدار" ان مسائل میں سے جب کوئی مسئلہ کسی صاحب کی تحریر یا تقریر سے غلط ثابت ہو جاوے تو مجھ کو اس کا اقرار کرنے اور توبہ کرنے میں ایک لمحہ کی بھی [illegible] نہ ہوگی"۔

(تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۱۴۳)

ہماری حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ سرسید کی تو جگالی کرتے ہوئے دوسروں کو ان کے کردار کی پیروی کی تلقین کرتے ہیں مگر خود اپنی غلطی کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ "کڑوا کڑوا تھو تھو میٹھا میٹھا ہپ ہپ" کے مصداق ان کے خیالات سے صرف وہ اقتباسات چنتے ہیں جو ہمارے

مقصد کے ہوں یا پھر ان خیالات کے حوالے پیش کرتے ہیں جن سے وہ رجوع کر چکے تھے (بلکہ ایک عرصہ تک ان کا رد کرتے رہے) اور ان پر اپنی دانشوری کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ جب سرسید کی ان باتوں کا ذکر آتا ہے جن سے ہم متفق نہیں تو بے سروپا توجیہات سے کام لے کر انہیں "مصلحتِ وقت" یا "حالات کا تقاضا" کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ تسلیم کہ مصلحتِ وقت کے تقاضے کے تحت حالات کے مطابق بعض پالیسیاں اختیار کی جاتی ہیں مگر وہ محض وقتی ہوتی ہیں جبکہ بنیادی اصول اور عقیدے اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں۔ سرسید کے اپنے بیانات کے مطابق ان کے تمام افعال ان کے افکار و نظریات کے تابع تھے جن کی بنیاد اصولوں پر تھی نہ کہ وقتی مصلحتوں پر۔ انہوں نے جو حکمتِ عملی اختیار کی قرآن و حدیث کے حوالے دے کر مستقل اعتبار سے کی' لہٰذا یہ جواز کہ ان کی حکمتِ عملیاں حالات کے تقاضے کے تحت مرتب کی گئی تھیں حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

قابلِ احترام شخصیتوں کی بعض باتوں سے اختلاف کرنا کوئی قابلِ نفرین امر نہیں۔ سرسید کی اپنی تحریروں میں اس کے جا بجا ثبوت ملتے ہیں۔ امام غزالیؒ' امام فخرالدین رازیؒ' شاہ ولی اللہؒ اور بعض دوسرے اکابرینِ دین کا احترام ذکر کرنے کے باوجود وہ ان بزرگوں کی بعض تحریروں پر سختی سے تنقید کرتے ہیں۔ سرسید ہی کی صحبت کے زیرِ اثر ان کے دستِ راست نواب محسن الملک اپنے قائد سے اختلاف کی کیفیت کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> "سید صاحب نے کبھی دعوئ پیغمبری نہیں کیا اور نہ اس بات پر اقرار کہ خواہ مخواہ لوگ ان کے ہم عقیدہ ہوں' لہٰذا اصلی اور سچی بات کو ہم تسلیم کرتے رہے اور بری بات کو ان کی نہ مانتے تھے اور صاف ان کے روبرو انکار کر دیتے تھے"۔
>
> (مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک' ص ۴۱۲)
>
> ایک اور موقع پر انہوں نے بیان کیا۔
>
> "مرحوم سرسید کے خیالات کا سب سے زیادہ جاننے والا اور ماننے والا میں ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص ان کا عقیدت مند اور عزت کرنے والا نہ ہو گا لیکن ان کی رائے مثل قرآن و حدیث کے نہ تھی' وہ نبی نہ تھے' وہ معصوم نہ تھے' ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی۔ جب ان کا کوئی قول پیش کیا جائے جو خلافِ حدیث ہو تو ہم باوجود ان کی عزت' عظمت و اقتدار کے سرِ مو تسلیم نہ کریں گے۔ اگرچہ یہ سچ ہے (کہ) سرسید نہایت عالی دماغ اور دور اندیش مدبر تھے اور وہ شب و روز قومی ترقی کے خیالات میں مستغرق و منہمک رہتے تھے۔ وہ جو رائے قائم کرتے بعد غور کامل کے'

جو خیالات ظاہر کرتا اس کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالتے اور اس وجہ سے کوئی دانش
مند شخص بلا ایک سرسید کے خیالات سے اختلاف نہیں کر سکتا لیکن زمانہ کی حالت ہمیشہ
بدلتی رہتی ہے "اقتضائے زمانہ ہمیشہ دانش مندوں کو اپنے واجب الاحترام بزرگوں کی
رائے سے اختلاف کرنے اور جدید تجاویز پیش کرنے کو مجبور کرتا ہے....."

(مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک ص ۲۲۳)

سرسید ہی کے ایک نامور معتقد نواب حاجی محمد اسماعیل خاں نے مولوی سراج الدین احمد
سے سرسید کی جو سوانح حیات لکھوائی 'خود سرسید نے اس بناء پر مسترد کر دی کہ

"مولوی سراج الدین نے جو کچھ لکھا تھا وہ چھاپہ ہونے کے قابل نہ تھا۔
بعض واقعات اس میں صحیح نہ تھے اور طرز بیان درست نہ تھا۔ لائف ایک مدح نامہ
نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہونی چاہئے کہ اس شخص کی بھلائی برائی سب کا نمونہ ہو اور الفاظ
مدح وذم اس سے زائد معنوں پر دلالت کرنے والے نہ ہوں جو درحقیقت اس میں
ہو۔ میری نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم و فاضل اکمل ہیں کیسی غلط بات ہے"۔

(مکتوبات سرسید 'جلد دوم 'ص ۱۷۵)

یعنی جس بے جا مدح کو سرسید خود اپنے متعلق ناپسند کرتے ہیں ہم اس عمل کو انہی پر آزما کر خوش
ہوتے ہیں۔

ہمارے دانش ور ہمیں آج تک تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھاتے چلے آرہے ہیں جو
ہمارے ذہنوں میں اس قدر سمویا جا چکا ہے کہ جب ہمیں اس کے ساتھ اس کا دوسرا رخ بھی
دکھانے کی کوشش کی جائے تو ذہن قبول نہیں کرتا۔ ہم اعتقاد کے باعث سمجھتے ہیں کہ ہمارے
واجب الاحترام بزرگ ایسا کہہ یا کر نہیں سکتے اور اگر واقعی ایسا ہے تو اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت
ضرور ہے۔ پھر اس کے جواز میں تاویلات ایجاد کرنے لگتے ہیں اور خود ساختہ دلائل کے انبار لگا
دیتے ہیں۔ یہ طرز عمل ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے جس کے نتیجے میں ذہنی تضاد کا شکار ہو کر آج ہم
جس دوراہے پر چل رہے ہیں اس نے ہماری حالت کو مضحکہ خیز بنا کر رکھ دیا ہے' حقائق کو جان
لینے کے باوجود ہم اپنے سابقہ خیالات سے رجوع نہیں کر سکتے اور اپنی دانش وری کا بھرم قائم
رکھنے کے لئے پرانے ہی راگ الاپتے رہتے ہیں۔

حقیقت کی جستجو نے مجھے مطالعہ سرسید پر آمادہ کیا۔ اس مقصد کیلئے مجھے ان کی اصل
تصانیف کی تلاش ہوئی۔ لاہور کی متعدد لائبریریوں میں چھان پھٹک کی مگر بہت سی کتابیں دستیاب
نہ ہو سکیں۔ پھر قدیم کتب فروشوں کی جانب رجوع کیا تو چند کتابیں حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد

کتابوں کے کباڑیوں کے ہاں چکر لگانا قاعدہ معمول بنالیا۔ کبھی کبھار کوئی نایاب کتاب مل جاتی تو منہ مانگے دام ادا کر کے خرید لیتا۔ سالہا سال تک یہ تگ و دو جاری رہی۔ اسی دوران بعض نجی کتب خانوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ بہت سے کرم فرماؤں نے خلوص کے ساتھ تعاون کیا۔ بعضوں نے مایوس بھی کیا مگر میں نے حوصلہ نہ ہارا اور تصانیفِ سرسید سے اہم اقتباسات مختلف موضوعات کے تحت اکٹھے کرتا رہا۔ ایک مرحلہ پر جمع شدہ مواد کو دیکھ کر ذہن میں آیا کہ اگر خوب محنت کی جائے تو اس سے سرسید کی ایک بہترین آپ بیتی تیار ہو سکتی ہے۔ یہی خیال اس تجویز کا محرک ہوا کہ سرسید کی تحریروں، تقریروں اور بیانات کی مدد سے ان کی خودنوشت ترتیب دی جائے تاکہ دوسروں کی توجیہات کے رحم و کرم پر پڑے رہنے کی بجائے خود ان کی زبانی ان کے مشن کی صحیح معلومات میسر آئیں، حقائق کے متلاشی افراد کو دلچسپ انداز میں جامع اور مستند حوالہ جات کی کتاب مل جائے اور اس دور کی صورتِ حال کا درست تجزیہ ہو سکے۔ لاہور کے بعد وطنِ عزیز کے دوسرے شہروں کی لائبریریوں میں بھی جاتا رہا۔ حسنِ اتفاق سے اسی دوران مجھے روزگار کے سلسلے میں ایک عرصہ تک لندن میں رہائش پذیر ہونے کا موقع میسر آیا۔ ہمارے سابق حکمرانوں کے اس دیس میں خوش قسمتی سے سرسید کی تصانیف اور اس دَور کے حالات پر مشتمل کتابوں کے قدیم ترین نسخے محفوظ ہیں۔ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی لائبریریوں میں خوب ورق گردانی کی۔

کسی شخصیت کی تحریروں اور تقریروں سے مکمل خودنوشت ترتیب دینا ایک نیا تجربہ تھا جو میں نے اپنے ذمے لیا۔ میرے سامنے اس نوعیت کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہ تھا جسے دیکھ کر میں اس عظیم ذمہ داری سے آسانی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتا، خاص کر اس صورت حال میں کہ سرسید کے نظریات میں رجوع بلکہ رجوع در رجوع کا عمل ایک مدت تک جاری رہا اور اصل نظریات وہی تصور کئے جاتے ہیں جن کا حامل ایک انسان اپنی عمر کے آخری دَور میں ہو۔ یوں سرسید کے آخری نظریات کے تعین کیلئے بڑی کاوش کرنا پڑی۔ پھر ایک ہی موضوع پر مختلف اقتباسات کا طرزِ بیان مختلف ہے۔ کہیں واقعات ماضی میں بیان کئے گئے ہیں کہیں حال میں، ایک تحریر میں مصالحانہ انداز کا عکس ہے جبکہ اس سے ہی متعلقہ دوسری میں مناظرانہ رنگ جھلک رہا ہے۔ گذشتہ واقعات کو زمانہ ماضی میں بیان کرنا ضروری ہوتا ہے لہٰذا زمانہ حال میں بیان کئے گئے اہم واقعات کو شامل کرنے کیلئے کوئی مناسب انداز سوچنا پڑا۔ پھر ان تمام اقتباسات کو اس طرح ترتیب دینا کہ اہم نکات بھی نہ چھوٹنے پائیں اور قاری کو ایک مسلسل عبارت کی چاشنی بھی

محسوس ہوا ایک کٹھن کام اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ میں ان مضامین کو اس انداز میں ترتیب دینے میں معروف رہا جس سے یوں احساس ہو کہ گویا سرسید نے یہ تحریریں اپنے آخری ایام میں واقعی ایک خودنوشت کے طور پر قلم بند کیں۔ اقتباسات کی ترتیب ' حواشی اور عنوانات میں اضافہ و ترمیم اور کانٹ چھانٹ کے بیسیوں مرحلے آئے ' دن رات مسلسل اس جنون میں صرف کئے اور بالآخر رُبع صدی کے عرصہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ میں اس معاملے میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔

اس ترتیب و تدوین میں مندرجہ ذیل نکات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

۱..... حوالہ جات اصل ماخذوں سے نقل کئے گئے ہیں اور بالواسطہ حوالوں سے گریز کیا گیا ہے سوائے چند ایک کے جن کے ماخذ سخت کوشش کے باوجود نہ مل سکے۔

۲..... تصانیفِ سرسید کی اول اشاعتوں کو ترجیح دی گئی ہے جہاں وہ دستیاب نہ ہو سکیں وہاں جو بھی قدیم نسخہ میسر آیا اس سے استفادہ کیا گیا۔

۳..... بعض تحریریں جو پہلی بار مختلف جرائد میں شائع ہوئیں اور بعد میں انہیں الگ کتابی صورت دی گئی یا وہ سرسید کے مضامین ' تقریروں یا خطوط کے مجموعوں میں شامل ہوئیں انہیں مذکورہ کتب کے حوالے سے ہی بیان کیا گیا ہے تاکہ قاری کو حوالے ڈھونڈنے میں دشواری نہ ہو۔

۴..... مرتبہ مجموعوں کے ضمن میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ حوالہ جات اوّل مُرتب کردہ مجموعوں سے لئے جائیں۔ جہاں بعد میں مُرتب ہونے والے مجموعوں میں اضافے ہوئے وہاں صرف اضافی حوالے متذکرہ مجموعوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔

۵..... بعض حوالے جن کا صحیح ماخذ تلاش نہیں کیا جا سکا یا وہ سرسید کی کسی مجلسی گفتگو کا حصہ تھے انہیں ان کے معتمد راویوں کے حوالے سے درج کیا گیا ہے۔

۶..... مختلف حوالوں کو ایک عنوان کے تحت اس ترتیب سے درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے درمیان مسلسل عبارت کی مانند ربط محسوس ہو۔ اس کے باوجود مختصر ترین حوالوں کو بھی الگ پیرے کی صورت دی گئی ہے تاکہ ہر حوالے کا انفرادی حیثیت سے تجزیہ کیا جا سکے۔

۷..... ہر حوالے کا اشارہ مکمل اقتباس کے آخری حرف پر دیا گیا ہے۔ مسلسل طویل عبارتوں میں بھی ہر پیرے کے بعد اشارہ موجود ہے۔ صفحات اور اشاروں کی ترتیب کے ساتھ تمام ماخذ خودنوشت کے متن کے بعد یک جا کر دیئے گئے ہیں۔

۸..... حوالہ جاتی کتب کی مکمل تفصیلات کتاب کے آخر میں اتفاقی ترتیب کے مطابق دی گئی ہیں۔

۹..... طویل واقعات کے بیان میں صرف ان حصوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں سرسید متحرک

دکھائی دیتے ہیں یا ان کے تاثرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بعض اقتباسات جن میں وہ ہمیں متحرک دکھائی نہیں دیتے اس لئے شامل کیئے گئے ہیں تاکہ طویل واقعات میں تسلسل کو برقرار رکھے' گزشتہ واقعات کے نتائج واضح کرنے یا آئندہ واقعات کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملے یا پھر ان میں سرسید کا کوئی خاص طرزِ تحریر ظاہر کرنا مقصود ہے۔

۱۰...... بعض اہم اقتباسات' جن میں طرزِ تخاطب کا انداز تھا' بوجہ مجبوری شامل نہیں کیئے جا سکے کیونکہ کتاب کی نوعیت کے مطابق وہ عبارت میں موزوں نہیں ہو سکتے تھے البتہ بعض اقتباسات مناسب عنوانات کے تحت نمونہ کے طور پر شامل کر دیئے گئے ہیں یا انہیں حواشی میں کھپا دیا گیا ہے۔

۱۱...... عنوانات تجویز کرتے وقت سرسید کے ذاتی خیالات کے مطابق مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۲...... سرسید کے الفاظ میں جہاں کہیں خاص صورتِ حال کے ضمن میں تشنگی محسوس ہوئی یا مزید وضاحت مطلوب تھی وہاں حواشی میں زیادہ تر الطاف حسین حالی کی "حیاتِ جاوید" سے حوالے دیئے گئے ہیں کیونکہ وہ سرسید کی مستند ترین سوانح حیات تصور کی جاتی ہے یا پھر سرسید کی ان ہم عصر شخصیات کے بیانات سے وضاحت کی گئی ہے جن کا شمار سرسید کے دوستوں میں ہوتا تھا یا ان کے کاموں میں براہ راست شریک رہیں۔ بعض تشریحات کو عنوانات میں سمو دیا گیا ہے۔

۱۳...... کسی حوالے کی تکرار نہیں کی گئی اگرچہ موضوع کے اعتبار سے اسے متعدد عنوانات میں کھپایا جا سکتا ہو۔

سرسید کی سوانح حیات خود ان کے اپنے الفاظ میں آپ کے سامنے ہے۔ ہر شخص اپنے نظریات میں مختار ہے۔ ان میں سے جو باتیں آپ کو قبول ہیں ان کی داد سرسید ہی کو دیجئے اور جن سے آپ متفق نہیں ان کی نقاب کشائی کیلئے مجھے نہ کوسئے۔ میں نے تو صرف اس قدر گستاخی کی ہے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ اس کام پر وقف کر کے تصویر کے دونوں رخ منظرِ عام پر لانے کا فریضہ انجام دیا ہے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں شخصیت پرستی کے فسوں سے آزاد ہو سکیں۔ دیانت داری کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی شخصیتوں کے صحیح مقام کا تعین ان کے اقوال و افعال کی روشنی میں کریں اور جذباتی انشاپردازی کے زور سے اپنی مرضی کے مطابق ان کی تصویریں بنانے یا بگاڑنے سے احتراز کریں۔

میں آخر میں اپنے ان تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے کسی بھی مرحلہ پر اس کام میں خلوص کے ساتھ مجھ سے تعاون کیا۔ خاص طور پر بزرگوار شخصیت جناب

حکیم محمود احمد برکاتی کا بے حد ممنون ہوں کہ ان کی شفقت اور رہنمائی نے میرے کام کو آسان کیا۔ محبی جناب ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی مسلسل نوازشات اور عنایات مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی۔ میرے نامساعد حالات میں برخوردار خالد اعجاز مفتی مجھے ہمیشہ حوصلہ دیتے رہے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ان کی مساعی نے اہم کردار ادا کیا۔

الفائق، "آصف بلاک"
اقبال ٹاؤن لاہور
۱۹۹۳ء

ضیاء الدین لاہوری

"خود نوشت حیاتِ سر سید" جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، سر سید احمد خاں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے۔ اگر ان کے مذہبی، تہذیبی و تمدنی، تعلیمی، سیاسی اور تاریخی افکار و نظریات اور معتقدات بھی اس میں شامل کر دیے جاتے تو کتاب کی ضخامت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا۔ مذکورہ موضوعات پر سر سید کے نظریات اسی پیرائے میں الگ الگ عنوانات کے ساتھ "خود نوشت افکارِ سر سید" میں مرتب کیے گئے ہیں۔

ض۔ ل

ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل۔ ایل۔ ڈی

مولف کتاب ہذا (17 اکتوبر 1817ء تا 27 مارچ 1898ء)

حیاتِ سرسید کی چند اہم تاریخیں

کوائف ملازمت

عہدہ	مقام	از
سررشتہ دار	کچہری صدر امین دہلی	1838ء
نائب منشی	دفتر کمشنری آگرہ	فروری 1839ء
منصف	مین پوری	24 دسمبر 1841ء
	فتح پور سیکری	10 جنوری 1842ء
	دہلی	18 فروری 1846ء
صدر امین	بجنور	13 جنوری 1855ء
صدر الصدور	مراد آباد	جولائی 1858ء
	غازی پور	12 مئی 1862ء
	علی گڑھ	1864ء
جج سمال کاز کورٹ	بنارس	15 اگست 1867ء
پنشن کا حصول		1876ء

اعزازات

نامزدگی ممبر لیجسلیٹو کونسل وائسرائے ہند (1878ء تا 1880ء)

ایضاً (1880ء تا 1882ء)

نامزدگی ممبر سول سروس کمیشن (1887ء......)

خطابات

جواد الدولہ، عارف جنگ (از شاہِ دہلی) 1842ء

سی۔ ایس۔ آئی 6 اگست 1869ء

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ("سر") 14 مئی 1888ء

اعزازی ڈپلوما و ڈگری

ڈپلوما اعزازی رکنیت رائل ایشیاٹک سوسائٹی برطانیہ (4 جولائی 1864ء)

ڈاکٹر آف لاز (ایل۔ ایل۔ ڈی) ایڈنبرا یونیورسٹی (18 اپریل 1889ء)

(ماخذ: حیات جاوید از حالی)

حرفِ اوّل

(سر سیّد احمد خاں)

میری سرگزشت کا لُبِّ لُباب

میری تمام سرگزشت کے بیان کو یہ ایک شعر کافی ہے۔

طفلیٔ و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است
چوں بپائے خود رواں گشتیم سرگرداں شدیم[1]

میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کیڈیاں کھیلیں' کنکوے اڑائے' کبوتر پالے' ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری' کافر اور بے دین کہلائے' اور رکھا ہی کیا ہے![2]

کیا کیا خیالات ہماری قوم میں ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کیسی کیسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر نہ تھیں! جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے' جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے' جب صوفی تھے تو رومی سے بر تر تھے' اور اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غم خوار۔[3]

ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کے داروئے بے ہوشی نے ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا' ان کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا' دل پتھر ہو گئے تھے' دماغ قابو میں نہیں رہا تھا' ہاتھ پاؤں سست ہو گئے تھے' زندہ تھے پر

مُردوں سے بدتر تھے' اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے۔[14]

ایک دن تھا کہ ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے .... زمانہ نے جھنجھوڑا اور جگایا۔[15]

اس وقت ضرورت تھی کہ قوم کو جگایا جائے اور قوم پر جو زوال آگیا ہے اور جو زوال شدید آنے والا ہے اس کو جتلایا جائے۔[16]

اس میں خدا کا بدلہ تو نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے مگر قوم کی طرف کا بدلہ اسی وقت سے معلوم تھا .... کافر' مرتد' ملحد' زندیق' اسلام کا دشمن' مسلمانوں کا ہاجی' قوم کا عیب جو' دین دنیا سے آزاد کہتا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا' اور ہم پر اس مثل کا صادق آنا کہ "دھوبی کا کتا گھر نہ گھاٹ کا" مگر شکر ہے کہ ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا اور ہمیشہ ہمارے دل میں یہی آیا کہ اے خدا' ان پر رحم کر کیونکہ وہ نہیں جانتے۔[17]

اے دوستو! جب میں نے یہ خیال کیا تھا کہ قوم اچھی حالت میں نہیں ہے' اس کے واسطے کچھ کرنا چاہئے تو میں نے یہ خیال کر لیا تھا کہ اس میں سخت مخالفتیں ہوں گی مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ جوں جوں مجھ پر تہمتیں لگائی گئیں' گالیاں دی گئیں' مکہ سے کفر کے فتوے منگوائے گئے میری محبت اپنے مخالفوں کی طرف بڑھتی گئی اور میری کوشش کو ترقی ہوتی گئی کیونکہ میں سمجھتا رہا کہ میرے مخالف جو کچھ کرتے ہیں' ناسمجھی سے کرتے ہیں۔[18]

ہمارے کاموں کی بہ نسبت ہماری ذات اور ہمارے ذاتی خیالات سے لوگوں نے بہت بحث کی لیکن اب وہ بھی بہت ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ بہت لوگ' سوائے چند متعصبین کے' سمجھ گئے ہیں کہ ہم اسلام کی اور مسلمانوں کی کیسی خیر خواہی کرتے ہیں' آفتاب اسلام کو' جس کی شعاعیں گرد و غبار کے سبب دھندلی ہو گئی ہیں اور جس کی کرنیں ہم تک نہیں پہنچتیں' کس طرح روشن اور چمکتا ہوا کرنا چاہتے ہیں!![19]

اب ہماری یہ مثل ہے۔

لو آج میر مسجد جامع کے ہیں امام
داغ شراب دھوتے تھے کل جانماز کا

خاندان

ذاتی کوائف

اسم و القاب

سید احمد حسینی الحسنی المخاطب بخطاب جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ(1)★

تعارف بہ رشتۂ بزرگاں

سید احمد خاں بیٹا سید محمد متقی خاں بہادر مرحوم اور پوتا جواد الدولہ جواد علی خاں بہادر مرحوم اور نواسا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ مغفور کا۔(2)

تاریخ پیدائش

پنجم ذی الحج ۱۲۳۲ ہجری مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ عیسوی(3)

جائے پیدائش

میری پیدائش دلی کی ہے اور میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔

دلّی جو ایک شہر تھا رشکِ جنان و خُلد
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے(4)

★ حالی لکھتے ہیں: "جب سر سید پیدا ہوئے تو ان کے والد نے شاہ غلام علی صاحب سے نام رکھنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب ہی نے بڑے بھائی کا نام محمد رکھا تھا ان کا نام احمد رکھا" (حیاتِ جاوید، حصہ اول ص 34)

مذہب' وطن اور نسل

میں مسلمان ہوں' ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرب کی نسل سے ہوں۔

پیشہ اور موروثی خطاب

جب سے میں نے ہوش سنبھالا گورنمنٹ انگلشیہ کی نوکری اختیار کی۔

میری ددھیال میں سے کوئی شخص برٹش گورنمنٹ کا نوکر نہیں تھا البتہ سلاطین مغلیہ کے نوکر تھے اور پشت در پشت منصب و خطاب پاتے رہے' یہاں تک کہ میں نے بھی اس معزول کم بخت بادشاہ★ سے اپنے خاندان کی رسم بموجب موروثی خطاب پایا تھا۔

میرے پدری اجداد نے سلطنت مغلیہ کی خدمات' خصوصاً صیغہ فوج میں' ذمہ داری کے معزز عہدوں پر وفاداری اور محبت سے کیں' اور میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں کہ سب آرڈینیٹ جوڈیشل عہدہ پر برٹش سروس میں داخل ہوا۔●

میرے نانا نے گورنمنٹ انگلشیہ کی نوکری کی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں گورنمنٹ کی طرف سے وکیل ہو کر گئے تھے ایران کو' جب کہ حاجی خلیل خان سفیر شاہ ایران بمبئی میں مارا گیا تھا۔ اور جب اس خدمت کو انجام کر کے پھرے تو پولیٹیکل ایجنٹ ہوئے آوا میں۔

اجدادِ پدری

سلسلہ نسب

میں نہایت ناچیز ہوں مگر اس رسولؐ کی ذریت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے۔

چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالم تاب کے ذروں میں سے ہوں اس لئے اپنے نسب نامہ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرورِ دو جہاںؐ سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور سرورِ عالمؐ میں ہے اور جس کے سبب "لحمک لحمی ودمک دمی" کا ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے بھی معزز ہو

★۔ معزول کم بخت بادشاہ سے سرسید کی مراد آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر سے ہے۔

●۔ "سید احمد خاں پہلے 1837ء میں مقام آگرہ کی کمشنری میں منشی مقرر ہوئے تھے۔ بعد اس کے 1841ء میں منصف ہوئے' اور 1855ء میں ترقی ان کی اوپر عہدہ صدر امینی کے ہوئی اور اس عہدہ پر بہ رضامندی و خوشنودی حکام بالادستوں کے کام کرتے رہے" (رپورٹ نمبر 56 مورخہ 5 جون 1858ء از الیگزینڈر شیکسپیئر کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور بنام کمشنر روہیل کھنڈ مشمولہ لائل محمڈنز آف انڈیا' حصہ اول' ص

(23

جائے۔

گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ
ذرۂ آفتاب تابانیم

(۱) محمد رسول اللہ صلعم

(۲) فاطمہ زہرا/امیرالمومنین علی ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب (۳) امام حسین (۴) امام زین العابدین (۵) امام محمد باقر (۶) امام جعفر صادق (۷) امام موسیٰ کاظم (۸) امام علی موسیٰ رضا (۹) امام محمد تقی (۱۰) سید موسیٰ مرقع (۱۱) سید ابی عبداللہ احمد (۱۲) سید محمد اعرج (۱۳) سید محمد احمد (۱۴) سید احمد (۱۵) سید احمد (۱۶) سید موسیٰ (۱۷) سید محمد (۱۸) سید علی (۱۹) سید جعفر (۲۰) سید محمد (۲۱) سید عیسیٰ (۲۲) سید ابوالفتح (۲۳) سید علی (۲۴) سید یار حسین (۲۵) سید کاظم الدین حسین (۲۶) سید جعفر (۲۷) سید باقر (۲۸) سید موسیٰ (۲۹) سید شرف الدین حسین (۳۰) سید ابراہیم (۳۱) سید حافظ احمد (۳۲) سید عزیز (۳۳) سید محمد دوست (۳۴) سید برہان (۳۵) سید محمد عماد (۳۶) سید محمد ہادی (۳۷) سید محمد متقی (۳۸) سید احمد مؤلف[۱]

وطن

اگرچہ میرے بزرگ عرب کے رہنے والے ہیں مگر اکبر اول کے عہد میں ہرات سے ہندوستان میں آرہے۔[۲]

سلطنتِ مغلیہ کی خدمات

جس وقت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ تخت شاہی پر رونق افروز ہوا اس نے اپنی بلند خیالی کے باعث ہر شہر اور ہر قریہ سے سادات کے بزرگ اور شرفائے نامدار طلب کئے اور انھیں مناصب ہائے جلیلہ عطا کئے۔ میرے نویں دادا سید شرف الدین حسین خاں بہادر نے' جو اس علاقہ کے ارکان سلطنت میں سے تھے' سامانِ سفر باندھا اور اپنے اعزو اقربا کے ساتھ ہندوستان آگئے اور احکام شاہی کے تحت ہندوستان کے ولایت بدر کے صوبہ دار' جسے انگریزی میں گورنر جنرل کہتے ہیں' مقرر ہوئے اور اعلیٰ امتیازی حیثیت حاصل کی۔ انہوں نے یہاں ایک عمر گزاری اور "میر بدری" کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے بعد میرے ساتویں دادا حافظ احمد الدین خان بہادر' شہاب الدین محمد شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں مراد آباد کے صوبہ دار کی حیثیت میں

حکمران ہوئے اور میرے پانچویں دادا میر محمد دوست نے اپنے اوقات بابرکات حضرت محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کی ہمرکابی میں بسر کئے۔ اتفاقاً اطرافِ دکن میں ایک مہم پیش آئی کہ اس کی تحصیل ارکان سلطنت کے لئے سخت دشوار ہوئی۔ بالآخر حکم سلطانی سے جناب موصوف کو اسے فتح کرنے پر مامور کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوئی کہ لشکرِ سلطانی فتحیاب ہوا اور مخالف فوج مغلوب ہوئی۔ اس کے صلے میں بارگاہ سلطانی سے انہیں "یکہ بہادر" کا خطاب عطا کیا گیا اور پھر خود اپنی درخواست پر ہرات کی صوبہ داری کا عہدہ پا کر سربلندی حاصل کی۔ عرش منزل عزیز الدین عالمگیر ثانی کے عہد میں میرے جد امجد میر ہادی نے ۱۹ ذی الحج ۲ جلوسی مطابق ۱۱۶۸ ہجری نبوی صلعم کو خطاب جواد علی خاں بہادر اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار سے امتیاز فرمایا اور حضرت فردوس منزل سلطان عالی گوہر شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں عہدہ احتساب و کرور ضمیمہ ۱۵ جلوسی مطابق ۱۱۸۸ ہجری میں عہدہ قضا' جسے فی زمانہ انگریزی زبان میں سیشن جج کہتے ہیں' پر مسند افروز ہوئے۔(1)

سید ہادی فارسی شعر کہتے تھے اور ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانہ میں تلف ہو گیا۔(2)

میرے والد سید محمد متقی خاں کو اپنے والد بزرگوار کی زندگی ہی میں دربار حضرت فردوس منزل سے خطاب خانی عطا ہوا اور تمام عمر نہایت عزت سے بسر کی۔ وہ حضرت عرش آرام گاہ محمد اکبر شاہ کے مقربین میں شامل تھے۔(3)★

★ حالی لکھتے ہیں: "اگرچہ شاہ عالم کے زمانہ میں اور ان کے بعد اکبر شاہ کے زمانہ میں جو درجہ دربار عام اور دربار خاص میں ان کے والد کا تھا وہی درجہ میر متقی کا بھی رہا' مگر چونکہ بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تھی اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ جن لوگوں کو خطاب اور منصب دے اس کے لوازمات بھی دے سکے اس لئے جب سید ہادی کے بعد ان کا خطاب اور منصب میر متقی کو دیا جانا تجویز ہوا تو انہوں نے اس کو قبول کرنا مصلحت نہ سمجھا' مگر چونکہ ان کو اکبر شاہ کے ساتھ شہزادگی کے زمانہ سے نہایت خلوص اور خصوصیت تھی اس لئے شاہ عالم کے انتقال کے بعد ان کا رسوخ دربار میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مثمن برج سے پیوست جو مکان "خواب گاہ" کے نام سے مشہور تھا اور جہاں خاص خاص لوگوں کے سوا کوئی نہ جا سکتا تھا' میر متقی برابر وہاں جاتے تھے۔ سرسید کہتے تھے کہ میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور نیز تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں۔" (حیات جاوید' حصہ اول ص 17)

سرسید کے عزیز دوست کرنل گراہم' جنہوں نے سرسید کی زندگی ہی میں اور سب سے اول ان کی سوانح حیات

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

اجدادِ مادری

مشہور بزرگ اور ان کا نقلِ وطن

خواجہ فریدالدین احمد خاں...... حضرت خواجہ یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں جن کا مزار مرد میں ہے اور شاہ ہمدان کے لقب سے مشہور ہیں..... خواجہ یوسف ابن ایوب ابن یوسف الہمدانی اولیائے کبار میں تھے...... ان کے انتقال کے بعد ان کی اولاد مرو سے کشمیر میں جا بسی تھی..... خواجہ فریدالدین احمد ۱۱۶۱ ہجری مطابق ۱۷۴۷ء کے دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ اشرف تھا۔ ان کے دادا خواجہ عبدالعزیز کشمیر سے بطریق تجارت دلی میں آئے تھے اور کشمیری مال کی تجارت کرتے تھے اور ریشم کی تجارت کا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ اخیر کو انھوں نے دلی ہی میں توطن اختیار کر لیا تھا۔[۹]

نانا کے فقیر منش بھائی

خواجہ اشرف کے آٹھ بیٹے تھے...... ان میں سے جو سب سے بڑے نامی ہوئے اور جن کو ہزاروں آدمیوں نے سجدہ کیا اور معبود اللہ کہا وہ خواجہ نجیب الدین تھے۔ وہ ابتدائی عمر سے رسول شاہی فقیر ہو گئے تھے جو سہروردی خاندان میں ایک نیا فرقہ رسول شاہ جی کے پیروؤں کا پیدا ہو گیا تھا اور مولوی محمد حنیف 'جو رسول شاہ جی کے جانشین تھے' خواجہ نجیب الدین ان کے چیلے ہو گئے تھے اور انکے پیر نے فدا حسین ان کا نام رکھ دیا تھا۔ شاہ فدا حسین نے تمام علمی کتابیں اپنے پیر سے پڑھیں اور جب تحصیل پوری ہو گئی تو اپنے مرشد کے حکم سے کل کتابیں کنوئیں میں ڈال دیں۔ ان کا مشرب اور عمل وحدت الوجود پر تھا اور وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی مونچھ کا صفایا' ایک لنگوٹی باندھے اور سارے بدن پر کوئلے کی راکھ ملے ہوئے' جو بھبوت کہلاتی تھی' بیٹھے رہتے تھے۔ اگر حجرے سے باہر نکلتے تو ایک تہمت گھٹنوں تک لپیٹ لیتے تھے اور سر پر ایک مثلث رومال باندھ لیتے تھے۔[۱۰]

---

(۹) پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

لکھنے کا افتخار حاصل کیا' تحریر کرتے ہیں: "سید احمد کے والد سید محمد متقی بادشاہ کے عزیز ترین دوست تھے اور بادشاہ کی موجودگی میں صرف انہیں ہی بیٹھنے کی اجازت تھی۔ شاہی آداب کے تحت کسی کے لئے بھی بیٹھنا منع تھا لہٰذا بادشاہ' جو ایک چھوٹے سے مربع چبوترے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا تھا' خاموشی کے ساتھ اپنا ایک پاؤں پیچھے لٹکا دیا کرتا اور سید محمد متقی مٹھیاں بھرنے کے بہانے زمین پر بیٹھ جاتے۔ اس طرح جہاں شاہی آداب برقرار رہتے وہاں اس کے ساتھ انہیں بیٹھنے کی سہولت بھی میسر آ جاتی تھی۔" (دی لائف اینڈ ورک آف سر سید احمد خاں ص 3 - 4)

وہ نہایت خوش بیان اور خوش تقریر تھے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میری والدہ کو' جو اُن کی بھتیجی تھیں' اپنے پاس بلا کر ایسی عمدہ تقریر کی کہ اب تک اس کا لطف میرے دل میں نہیں بھولا۔[۱]

ان کا مزار الور میں بدسطل شاہیوں کے تکیہ میں ہے جو چنبیلی باغ کہلاتا ہے۔[۲]

نانا کا تذکرہ

شادی اور اولاد

دلی میں ایک اور کشمیری خاندان خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد میں کشمیر سے آکر آباد ہوا تھا۔ خواجہ فریدالدین احمد کی شادی غالباً ۱۱۹۳ ہجری مطابق ۱۷۷۹ء میں خواجہ محمد مراد احراری کی بیٹی سے ہوئی..... خواجہ فریدالدین احمد کی ایک ہی بیوی تھیں اور ان سے پانچ اولادیں پیدا ہوئی تھیں' دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور یہ اولادیں تین تین برس کے فاصلہ سے غالباً ۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء کے پیدا ہو چکی تھیں۔[۳]

انگریزوں کی ملازمت

اس زمانہ میں مدرسہ کلکتہ میں' جس کو حکام انگریزی نے قائم کیا تھا' ایک سپرنٹنڈنٹ مقرر کرنے کی ضرورت تھی جس کی تنخواہ سات سو روپیہ تھی۔ لکھنؤ میں جو حکام انگریزی تھے انہوں نے خواجہ فریدالدین احمد کی سفارش اس عہدہ کے لئے کی اور اس پر ان کا تقرر ہو گیا...... خواجہ فریدالدین احمد نے کلکتہ میں پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا اور اپنا کام کرتے رہے۔[۴]

اس زمانہ میں نواب مہدی علی خاں حشمت جنگ سرکار انگریزی کی طرف سے بوشہر میں سفیر تھے مگر سرکار انگریزی نے کسی سبب ان کو اس عہدہ سے علیحدہ کر کے واپس بلا لیا..... اور گورنر جنرل کے حکم سے خواجہ فریدالدین احمد بطور سفیر مستقل کے روانہ ہوئے۔[۵]

اس سفارت کے انجام دینے کے بعد خواجہ فریدالدین احمد بوشہر سے کلکتہ واپس آئے۔ اس وقت کوئی پولیٹیکل امور گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت آوا واقع برہما میں درپیش تھا۔ اس کے طے کرنے کو خواجہ فریدالدین احمد گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے بطور ایجنٹ مقرر ہو کر آوا میں گئے۔[۶]

جب اس خدمت کو بھی انجام دے کر اپنے وطن میں آئے تو وزیر ہوئے اکبر شاہ ثانی کے اور یا اللہ درجہ اور خطاب معہ وزیر اعظم کو مغلیہ سلطنت میں ملتا تھا۔[۷]

مغلیہ وزیر ہونے کا پس منظر

اکبر شاہ کے عہد میں...... خرچ آمدنی سے بہت زیادہ تھا۔ قرضہ ہو گیا تھا اور تنخواہیں ملازمین اور شہزادوں کی دو دو مہینے تین تین مہینے تک نہیں تقسیم ہوتی تھیں۔ اکبر شاہ کو ان خرابیوں کے رفع ہونے کی نہایت فکر تھی اور اس بات کا بھی خیال تھا کہ دلی اور اس کے مضافات میں خالص بادشاہ کی حکمرانی رہنی چاہئے اور انگریزوں کو محاصل ملک سے تین لاکھ روپیہ ماہواری دینا لازم ہے۔ سید محمد متقی خاں ابن جواد الدولہ جواد علی خاں ' مؤلف اس رسالہ کے والد اور خواجہ فریدالدین احمد کے داماد ' کو دربار شاہی میں پشتینی رسوخ تھا اور اکبر شاہ سے ان کے زمانۂ شہزادگی سے بہت زیادہ راہ و رسم تھی اور بادشاہ کبھی کبھی ان کو بھائی متقی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ اکبر شاہ نے سید محمد متقی سے چاہا کہ وہ انتظام امورِ بادشاہت اپنے ہاتھ میں لیں اور ان خرابیوں کا انتظام کریں۔ سید محمد متقی نے تو اس سے عذر کیا مگر اپنے خسر خواجہ فریدالدین احمد کا اور ان کی سفارت ایران اور اس کی کامیابی کا ذکر کیا اور یہ صلاح دی کہ ان کو بلا کر وزیر کیا جائے تو غالباً سب امور کا انتظام ہو جائے۔ اکبر شاہ نے اس صلاح کو پسند کیا اور خواجہ فریدالدین کو کلکتہ سے بلانے کا حکم دیا اور وہ کلکتہ سے اسی سال یعنی ۱۲۳۱ ہجری مطابق ۱۸۱۵ء کے دلی میں آئے ' بادشاہ کی ملازمت کی ' اکبر شاہ نے ان کو وزیر مقرر کیا' خلعتِ وزارت اور خطاب دبیرالدولہ امین الملک مصلح جنگ کا عطا کیا۔[9]

شکایتوں کے باعث استعفیٰ

خواجہ فریدالدین احمد نے اپنے ایامِ وزارت میں ' اس وجہ سے کہ بادشاہ قرض دار ہو گئے تھے ' قرضہ ادا کرنے اور اخراجات برابر کرنے کی تین تدبیریں کیں۔ تمام شہزادگان و بیگمات و ملازمان و عملۂ شاہی کی تنخواہوں سے دس روپیہ فی صدی تنخواہ کم کر دی اور دو مطبخ یعنی شاہی باورچی خانے ' جو بڑے خاصہ اور چھوٹے خاصہ کے نام سے موسوم تھے اور جن کا روزانہ صَرف کثیر تھا اور اسی کے ساتھ بعض دیگر غیر ضروری کارخانہ جات کو موقوف کر دیا اور تیسرا کام یہ کیا کہ دیوانِ عام کی چھت ' جس میں تانبے کی موٹی چادریں بطور چھت گیری کے لگا کر اس پر پیتل کی ڈنڈیوں و پھولوں سے ' جن پر سنہری ملمع تھا ' بطور خاتم بندی کے بنائی گئی تھی اور جس کو بہ عہد شاہ عالم ۱۱۷۳ ہجری مطابق ۱۷۵۹ء کے بھاؤ مرہٹہ نے اکھاڑ ڈالا تھا اور لے نہ جا سکا تھا اور وہ سب اکھڑی ہوئی پڑی تھی اور پھر اس کا بنانا بنظر حالاتِ شاہی غیر ممکن تھا ' اس کا سونا الگ اتروا لیا اور جس قدر تانبا تھا شاہی ٹکسال میں اس کے پیسے بنوا ڈالے (غدر سے پہلے تک یہ پیسے دلی میں مروج

تھے) اور بیش فروخت کر دیا اور اس تدبیر سے کئی لاکھ روپیہ قرض شاہی ادا کیا۔ ان انتظاموں سے آمدنی اور خرچ برابر ہو گیا اور تنخواہیں ماہوار ملنے کا انتظام ہو گیا مگر شہزادے اور بیگمات اور درباری سب اس بات سے کہ ان کی تنخواہیں کم ہو گئی تھیں، نہایت ناراض تھے اور خاصوں اور کارخانہ جات کی موقوفی عام شکایت کا باعث تھی۔ ان اسباب سے ہر شخص نے بادشاہ کے پاس شکایتیں شروع کیں۔ دیوانِ عام کی چھت کی نسبت جو کچھ کیا گیا تھا وہ بادشاہ کی اجازت اور مرضی سے کیا گیا تھا مگر تمام لوگ چرچا کرتے تھے کہ دیوانِ خاص کی چاندی کی چھت نادر شاہ نے لوٹ لی اور دیوانِ عام کی تانبے کی چھت خواجہ فرید نے۔ رفتہ رفتہ ان شکایتوں کا اثر بادشاہ کے دل پر بھی ہوا اور دبیر الدولہ نے عہدۂ وزارت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا مناسب نہ جانا یا یہ کہ وہ زیادہ اپنے ہاتھ میں نہ رکھ سکتے تھے، انہوں نے اس عہدہ سے استعفیٰ دیا اور چند روز بعد پھر کلکتہ کو چلے گئے۔[۱]

دوبارہ تقرری

ان واقعات کے چند روز بعد بادشاہ نے پھر واسطے اضافہ پیشکش کے تحریک کرنی چاہی اور اس باب میں ایک مراسلہ بنام گورنر جنرل تیار کیا گیا جس میں زیادہ تر شکایت اس بات کی تھی کہ آمدنی واسطے اخراجات ضروری کے کافی نہیں ہے۔ سید محمد متقی نے موقع پا کر بادشاہ سے عرض کیا..... کہ خواجہ فرید کا علیحدہ کر دینا مصلحت نہیں تھا۔ اگر اس میں کچھ سعی و کوشش ہو سکے گی تو دبیر الدولہ ہی کی تدبیر و کوشش سے ہو سکے گی۔ بادشاہ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس بات کو پسند کیا اور دبیر الدولہ کے کلکتہ سے بلانے کو حکم دیا۔ چنانچہ وہ کلکتہ سے آئے اور دوبارہ ۱۲۳۵ ہجری مطابق ۱۸۱۹ء کے بدستور اپنے عہدہ سابق پر مامور ہوئے۔[۲]

دوبارہ استعفیٰ

اس دفعہ کے تقرر میں بھی نواب دبیر الدولہ نے در حقیقت ماہواری پنشن کے اضافہ کی، جو بنام پیشکش بادشاہ کے لئے مقرر تھی، کوئی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ لیت و لعل کرتے رہے جس کے سبب سے بادشاہ کی کبیدگی خاطر بڑھتی جاتی تھی۔ جو لوگ ان کے مخالف تھے انہوں نے بادشاہ کے دل میں یہ بات جمائی کہ دبیر الدولہ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں اور اس لئے اس میں کوشش نہیں کرتے اور لوگوں کو بھی تعجب تھا کہ وہ کیوں اس میں تساہل کرتے جاتے ہیں۔ آخر کار بادشاہ نے یہ بات چاہی کہ وزارت کے کام میں اور شخصوں کو بھی دبیر الدولہ کے شریک کیا جائے۔ اس شراکت کے تین شخص خواہاں ہوئے..... دبیر الدولہ ان کی شرکت میں کام کرنا منظور نہیں کرتے تھے۔ چند روز اسی طرح فقرہ بازیاں اور تدبیریں رہیں۔ آخر کار بصلاح جنرل آکٹرلونی کے، جو ریذیڈنٹ تھے اور دبیر الدولہ سے نہایت دوستی رکھتے تھے، ۱۸۲۲ء مطابق

۱۲۳۸ ہجری کے دبیر الدولہ نے استعفیٰ دے دیا۔ اس دفعہ غالباً تین برس یا ساڑھے تین برس تک انہوں نے وزارت کا کام انجام دیا۔[۵]

رنجیت سنگھ کی دعوتِ وزارت

وزارت سے استعفیٰ دینے کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنے معتمد اور تیس ہزار روپیہ بطور سفر خرچ دبیر الدولہ کے پاس بھیجا اور لاہور بلایا۔ سب لوگوں کی کمال خواہش تھی کہ وہ منظور کرلیں مگر ان کی بڑی بیٹی 'یعنی والدۂ راقم' نے کہا کہ "خدا نے آپ کو اس قدر دیا ہے کہ جس طرح پر چاہیں آپ آرام کر سکتے ہیں اور اگر اس سے کچھ اَور زیادہ ہو جائے تو بھی جو آرام و آسائش آپ کو اب ہے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہو سکتی۔ خود لاہور میں جانا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سلطنت کے اختیارات لینا اور ہم سب کا انگریزوں کی عمل داری میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کیا اتفاقات پیش آئیں اور کیا انقلابات ہوں اور کس قسم کی مشکلات پیش آجائیں۔ پس اس زمانہ ضعیفی میں 'کہ آپ کی طبیعت بھی علیل رہتی ہے' وہاں جانا میں پسند نہیں کرتی"۔ دبیر الدولہ کے دل پر اس بات نے ایسا اثر کیا کہ جانے سے انکار کر دیا اور سفر خرچ واپس کیا اور پھر اخیر عمر تک باوجودیکہ پھر بادشاہ کی طرف سے ایک دفعہ تحریک ہوئی مگر کوئی تعلق اختیار نہیں کیا۔[۵]

ڈاڑھی مونچھ کا صفایا

نواب دبیر الدولہ در حقیقت حکیم مشرب یا صوفی مذہب تھے۔ کسی زمانہ میں مکا شاہ کے 'جو نہایت معزز چیلے رسول شاہ جی کے تھے' مرید ہوئے تھے۔ رسول شاہیوں کے جو مرید تھے ان کو خواہ مخواہ یہ ضرور نہ تھا کہ تجرد اختیار کریں اور ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دیں بلکہ وہ بھی ان کے مریدوں میں داخل تھے جو تاہل کرتے تھے اور دنیا داروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی حال نواب دبیر الدولہ کا تھا 'مگر دو برس قبل اپنی وفات کے ان کو خیال ہوا کہ ایک دفعہ تو اپنے مرشد کے طریقہ میں پورے طور پر داخل ہونا چاہئے۔ حجام جو حاضر ہوا اس سے کہا کہ ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دے۔ اس نے اس نورانی اور نہایت خوبصورت ڈاڑھی اور مونچھوں کو مونڈ دیا۔ شہر میں اس کا بڑا چرچا ہوا اور لوگوں نے نہایت تعجب کیا مگر ان کو اس کی پروا نہ تھی۔ ایک دفعہ کے سوا پھر ڈاڑھی مونچھ کا صفایا نہیں کیا اور جب انتقال ہوا ہے تو ڈاڑھی کسی قدر بڑی ہو گئی تھی۔[۵]

انتقال

خواجہ فرید الدین احمد نے ایسی خوش زندگی بسر کر کے ۱۴ محرم ۱۲۴۴ ہجری مطابق ۱۸۲۸ء

کے انتقال کیا۔ وہاں ترکمان دروازہ پچ نسخ کتب میں، جو ایک مشہور تکیہ شاہ فدا حسین کا تھا،
دفن کیے گئے۔ ان کی قبر نہایت عمدہ نفیس عمارت سے مزین کی گئی۔ ان کے انتقال سے ان کی رسم سوم و
چہلم میں ہزار ہا روپیہ خرچ کیا۔ ان کے مزار پر سال با سال تک بسنت چڑھتی تھی اور ایسا عمدہ و
نفیس میلہ بسبب قرب شہر کے ہوتا تھا کہ تمام درگاہوں میں جو بسنتیں ہوتی تھیں سب ملتوی ہو گئی
تھیں۔①★

ان کے انتقال کے کئی دن بعد مسٹر کرمل بروک، جو اس زمانہ میں دہلی میں ریذیڈنٹ تھے
بعد مسٹر نولین، جو اسسٹنٹ ریذیڈنٹ تھے، بطور ماتم پرسی کے آئے۔ اس وقت دبیر الدولہ کے
بیٹے اور داماد اور پوتے اور نواسے سب موجود تھے۔ ان سب کو مخاطب کر کے کلماتِ تعزیت کے
اور بذریعہ پیغام کے کلمات محل سرا میں ان کی بیٹیوں کو کہلا بھیجے۔ چھوٹے بچوں کے ساتھ، جو
اس وقت موجود تھے، نہایت مہربانی سے پیش آئے اور دبیر الدولہ کی وفات پر نہایت تاسف ظاہر
کیا۔②

تصانیف و تحریریں

خواجہ فرید الدین احمد کا دستور تھا کہ وہ برابر اپنا روزنامچہ لکھا کرتے تھے اور عہدِ شباب سے
ان کے انتقال سے دو ہفتہ پیشتر کا روزنامچہ لکھا ہوا موجود تھا اور راقم نے بارہا اس کو بطور ایک دلچسپ
تاریخ کے پڑھا تھا مگر افسوس ہے کہ زمانہ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ روزنامچہ تلف ہو گیا۔③
ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ تحفہ نعمانیہ صنعت اصطرلاب میں ہمارے پاس موجود
ہے۔④

ان کے تصنیف کیے ہوئے متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے علم ہیئت اور آلاتِ رصد میں
تھے جو غدر میں ضائع ہو گئے مگر ان کے تصنیف کیے ہوئے اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تین
رسالے، ایک صنعت اصطرلاب کا، دوسرا صنعت پر کار تناسب کا اور تیسرا اعمال پر کار تناسب کا
بعنایت وزیر الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خاں بہادر سی آئی ای وزیر اعظم ریاست پٹیالہ ہم
کو دستیاب ہوئے ہیں جن کو ہم نے کتب خانہ مدرسۃ العلوم میں داخل کر دیا ہے۔⑤

★ حالی لکھتے ہیں کہ اس میلے میں سرسید "اپنے اعزہ و عزیزوں کے ساتھ منتظم ہوتے تھے" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 43)

بچپن

چند یادیں

عام صحبتوں سے دُوری

بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب میری والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنائی اور وہیں آ رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان میں تھی، جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا، اسی لئے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔[1]

کھیل کود اور شرارتیں

ایک بار میں نے اپنے ایک رشتہ دار بھائی کو، جو استنجا کر رہا تھا، چپکے چپکے اس کے پیچھے جا کر چت کر دیا۔ اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ وہ پتھر لے کر مجھے مارنے کو دوڑا اور کئی پتھر پھینکے مگر میں بچ بچ گیا۔ آخر سب بھائیوں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی۔ اسی طرح ایک بار میں شطرنج کھیلتے میں ایک اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مکے سے اس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی اور کئی دن بعد اچھی ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی مگر آخر کو سب ایک ہو جاتے تھے۔[2]

کھیل کود میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آکر تصفیہ کر دیتا اور جس کی طرف سے چیند معلوم ہوتی اس کو برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چیند کرنا بے ایمانی کی بات ہے' کبھی چیند مت کرو اور جو چیند کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔ ★[1]

گاؤں کے مزے دار کھانے

اس عمر میں گاؤں میں جا کر رہنا' جنگل میں پھرنا' عمدہ دودھ اور دہی اور تازہ تازہ گھی اور جانگنوں کے ہاتھ کی پکی ہوئی باجرے یا مکئی کی روٹیاں کھانا نہایت ہی مزا دیتا تھا۔ ★[2]

گھریلو خادمہ کی موت کا رنج

"مجھے خوب یاد ہے' ماں بی بی کے مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسہ کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا نہایت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے' بہت اچھے مکان میں رہتی ہے' بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی بڑے آرام سے گزرتی ہے' تم کچھ رنج مت کرو"۔ مجھ کو ان کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا ماں بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا

★ حالی لکھتے ہیں: "بچپن میں سرسید پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل بندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ خود ان کے ماموں' ان کی خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لئے کافی تھے ... ان کے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو ... ابتدا میں وہ اکثر گیند بلا' کبڈی' گیڑیاں' آنکھ مچولی' چیل چلو وغیرہ کھیلتے تھے۔ اگرچہ گیڑیاں کھیلنے کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر ان کے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ آپس میں سب بھائی مل کر گیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 35 - 36)

★ حالی لکھتے ہیں: "دلی سے سات کوس مغل پور ایک جاٹوں کا گاؤں ہے' وہاں سرسید کے والد کی کچھ ملک بطور معافی کے تھی۔ اگر کبھی فصل کے موقع پر ان کے والد مغل پور جاتے تو ان کو بھی اکثر اپنے ساتھ لے جاتے اور ایک ایک ہفتہ گاؤں میں رہتے تھے۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 39)

★ حالی لکھتے ہیں: "سرسید کو مسماۃ ماں بی بی نے' جو ایک قدیم خیر خواہ خادمہ ان کے گھرانے کی تھی' پالا تھا اس لئے ان کو ماں بی بی سے نہایت محبت تھی۔ وہ پانچ برس کے تھے جب ماں بی بی کا انتقال ہوا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 35)

کہ میرا تمام زیور سید کا ہے مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں؟" میں نے کہا "ہاں بھیج دو"۔ والدہ نے وہ سب گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔[1]

شاہ غلام علی کی شفقت

آپ کا اصلی نام عبداللہ اور عرف غلام علی تھا...... آپ نے مرزا جانِ جاناں مظہر علیہ الرحمۃ سے بیعت کی اور...... اپنے وقت کے شیخ الشیوخ اور صاحبِ ارشاد ہوئے۔[2]

میرے تمام خاندان کو اور خصوصاً جناب والد ماجد کو آپ سے نہایت اعتقاد تھا اور میرے جناب والد ماجد اور میرے بڑے بھائی جناب احتشام الدولہ سید محمد خاں بہادر مرحوم کو ان ہی سے بیعت تھی اور آپ کی میرے خاندان پر اس قدر شفقت و محبت تھی کہ میرے والد ماجد کو اپنے فرزند سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ میرے والد ماجد بھی آپ کی صحبت کی برکت سے آزاد مزاج اور وارستہ طبع تھے۔ کبھی کبھی بموجب اس مصرع کے۔

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

کوئی بات گستاخانہ عرض کرتے یا کوئی حرکت آپ کے خلاف مرضی سرزد ہوتی تو آپ بارہا ارشاد فرماتے کہ "اگرچہ میں نے اپنے تئیں غمِ زن و فرزند سے دور رکھا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی نہ ہوئی کہ اس شخص کی محبت اپنے فرزندوں سے سوا دے دی، جو چاہو سو کہو اور جو چاہو سو کرو۔ میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے۔ لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغر سن میں، جو چاہتا سو کہتا اور جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گوارا فرماتے۔ میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا۔[3]

شاہ صاحب کو بھی ہم سب سے ایسی ہی محبت تھی جیسے حقیقی دادا کو اپنے پوتوں سے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب نے تاہل اختیار نہیں کیا تھا اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو خدا تعالیٰ نے مجھے اولاد کے جھگڑوں سے آزاد کر رکھا ہے، لیکن متقی کی اولاد کی محبت ایسی دے دی ہے کہ اس کے بچوں کی تکلیف یا بیماری مجھ کو بے چین کر دیتی ہے۔[4]

شاہ صاحب اپنی خانقاہ سے کبھی نہیں اٹھتے تھے اور کسی کے ہاں نہیں جاتے تھے، الا ماشاءاللہ صرف میرے والد پر جو غایت درجہ کی شفقت تھی اس لئے کبھی کبھی ہمارے گھر قدم رنجہ فرماتے تھے۔[5]

میرے والد کو حضرت شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی۔●

گو اس قسم کی عقیدت جیسی مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ ہوتی ہے' مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور اعلیٰ اخلاص میرے دل میں شاہ صاحب کے ساتھ ہے۔★

مرزا صاحب کے عرس میں شاہ صاحب ایک روپیہ ان کے مزار پر چڑھایا کرتے تھے اور اس روپیہ کے لینے کا حق میرے والد کے سوا اور کسی کو نہ تھا۔ ایک دفعہ عرس کی تاریخ سے کچھ پہلے ایک مرید نے شاہ صاحب سے اجازت لے لی کہ اب کی بار نذر کا روپیہ مجھے عنایت ہو۔ میرے والد کو بھی خبر ہو گئی۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھانے کا ارادہ کیا تو والد نے عرض کی کہ حضرت' میرے اور میری اولاد کے جیتے جی آپ نذر کا روپیہ لینے کی اوروں کو اجازت دیتے ہیں؟ شاہ صاحب نے فرمایا "نہیں نہیں' تمہارے سوا کوئی نہیں لے سکتا"۔ میں اس وقت صغیر سن تھا۔ جب شاہ صاحب نے روپیہ چڑھایا' والد نے مجھ سے کہا "جاؤ' روپیہ اٹھالو"۔ میں نے آگے بڑھ کر روپیہ اٹھالیا۔●

جنرل آکٹرلونی سے ملاقات

جنرل آکٹرلونی اور وزیر اعظم دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین احمد میں بڑی دوستی تھی۔ جنرل آکٹرلونی اکثر دبیر الدولہ کے پاس جب چاہتے آیا کرتے تھے...... ایک دن جنرل آکٹرلونی آئے ہوئے تھے' اتفاقاً راقم کسی سبب سے وہاں گیا اور جنرل صاحب کو دیکھ کر واپس آنے لگا مگر انہوں نے بلالیا اور کچھ بات کی۔ راقم نے جنرل سے' جو فل ڈریس (پوری پوشاک یا وردی) پہنے ہوئے تھا' پوچھا کہ "آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگائے ہیں؟" جنرل اس سوال سے بہت خوش ہوئے اور مسکرا کر خاموش رہے۔ اس وقت راقم کی عمر پانچ یا چھ برس کی ہو گی۔●

دربارِ مغلیہ میں خلعت کا حصول

میرے باپ دادا کو شہنشاہانِ مغلیہ نے بڑے بڑے خلعت و خطاب عطا فرمائے تھے اور جو میں نے بھی اپنے بچپنے میں حاصل کیے تھے۔●●

★۔ حالی نے سرسید کے اس بیان کو تحریر کرتے ہوئے ان کی یہ خواہش بھی روایت کی ہے کہ "میں چاہتا ہوں کہ میری لائف میں اس بات کی تصریح کی جائے"۔ (حیات جاوید' ضمیمہ 3 ص 13)

●●۔ حالی لکھتے ہیں: "سرسید کے والد کو اکبر شاہ کے زمانہ میں ہر سال تاریخ جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا مگر اخیر میں...... انہوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا اور اپنا خلعت سرسید کو' باوجودیکہ ان کی عمر کم تھی' دلوانا شروع کر دیا تھا"۔ (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 39)

ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہرچند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لال پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجالانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس' اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا ۔ جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔ بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے' جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے' پوچھا کہ تمہارا بیٹا ہے؟ انہوں نے کہا "حضور کا خانہ زاد" ۔ بادشاہ چپکے ہو رہے۔ لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے' مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔ تسبیح خانہ میں بھی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔ اس چبوترہ پر بیٹھ گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ دیر کیوں کی؟ حاضرین نے کہا "عرض کرو کہ تقصیر ہوئی" مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ سو گیا تھا ۔ بادشاہ مسکرائے اور فرمایا "بہت سویرے اٹھا کرو" اور ہاتھ چھوڑ دیئے۔ لوگوں نے کہا "آداب بجالاؤ" ۔ میں آداب بجالایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔ تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے...... اس زمانہ میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہوگی[1]۔

نوکر سے زیادتی پر والدہ کا ردِ عمل

جس زمانہ میں میری عمر گیارہ برس کی تھی میں نے ایک نوکر کو' جو بہت پرانا اور بڈھا تھا' کسی بات پر تھپڑ مارا۔ جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں گھر گیا تو میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اس کو گھر سے نکال دو' جہاں اس کا دل چاہے چلا جائے' یہ گھر میں رہنے کے لائق نہیں رہا ۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک ماما دوسرے گھر سے' یعنی میری خالہ کے گھر سے' جو قریب تھا نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر میں لے گئی۔ میری خالہ نے کہا کہ دیکھو' تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض اور غصہ ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہوں گی مگر میں تم کو چھپا رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں مجھ کو چھپا دیا۔ تین دن تک میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور میری بہنوں کو کہتی تھیں کہ دیکھنا' آپاجی یعنی میری

والدہ کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ تین دن بعد میری خالہ 'جن کو میں آپا جان کہا کرتا تھا' میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ "اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی"۔ وہ نوکر ڈیوڑھی پر بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے 'جب تقصیر معاف ہوئی۔ بلاشبہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں سے بہتر ہے۔⑥

زمانہ ابتدائی تعلیم

بسم اللہ کی تقریب

مجھ کو اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا اور آدمی کثرت سے جمع تھے' خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے' مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکابکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے اٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے اور اول بسم اللہ پڑھ کر اقراء کی اول کی آیتیں 'مالم یعلم' تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا... ★۔

بہ مکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
زفیض نقش بند وقت و جان جان جانانی⑦

مجلس ختم قرآن

میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس 'جو زنانہ میں ہوئی تھی' وہ اس قدر دلچسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔⑧

والدہ کی تدریس

عزیز النساء بیگم 'والدہ راقم کی'..... نہایت لائق' ذہین' قدرتی نہایت عالی دماغ تھیں۔ وہ

★ حالی لکھتے ہیں: "بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے 'جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشین بی بی تھی' سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اوّل' ص 41)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ سرسید نے "قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی۔" (ایضاً حصہ دوم' ص 4)

صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانہ میں فارسی کی بھی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ میں نے خود "گلستان" کے چند سبق ان سے پڑھے ہیں اور اکثر ابتدائی فارسی کتابوں کے سبق ان کو سنائے ہیں۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ جب میں ان کو سبق سناتا یا نئے سبق کا مطالعہ ان کے پاس بیٹھ کر دیکھتا تو وہ سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کو اپنے پاس رکھ لیتی تھیں۔ اگرچہ وہ خفا تو کئی دفعہ ہوئی ہوں گی مگر ان سوت کی لڑوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔[۱]

نانا کا مشکل دسترخوان

نواب دبیرالدولہ کا معمول تھا کہ صبح کا کھانا محل سرا میں جا کر کھاتے تھے۔ ایک بہت بڑے نعمت خانے میں بہت وسیع دسترخوان بچھا ہوا ہوتا تھا اور کل بیٹے اور بیٹیاں اور پوتے اور پوتیاں' نواسے اور نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں اور چھوٹے و بڑے سب ان کے ساتھ کھاتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں اور وہ ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جب وہ بتاتا تو اس کے آگے خالی رکابی میں اپنے ہاتھ سے وہی چیز چمچہ سے اٹھا کر بقدر مناسب عنایت فرماتے تھے۔ تمام لڑکے نہایت ادب و صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بڑی احتیاط رہتی تھی کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے اور زیادہ ہاتھ کھانے میں بھرنے نہ پائیں' نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نکلنے نہ پائے۔[۲]

نانا کا مشکل مکتب

دستور تھا کہ شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے' جو مکتب میں پڑھتے تھے' سبق سنانے جاتے تھے۔ ان کی مسند کے آگے دو سفید رنگ کے شیشے کی فانوسیں' جو مردنگیں کہلاتی ہیں' موم بتی سے روشن ہوئی رکھی رہتی تھیں اور ان کے سامنے لڑکے بیٹھتے تھے۔ اول مشکل یہ تھی کہ نہایت سفید چاندنی کا فرش بچھا ہوا ہوتا تھا۔ لڑکے اپنے پاؤں نہایت صاف رکھتے تھے' اس خوف سے کہ کہیں چاندنی پر دھبہ نہ لگ جائے۔ اگر اتفاق سے کسی لڑکے کے پاؤں کا دھبہ لگ گیا تو نہایت خفگی سے اس کو ہٹا دیتے تھے کہ کتے کے سے پاؤں کیوں رکھتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ کپڑے پر کسی قسم کا دھبہ یا روشنائی گری ہوئی نہ ہو۔ اگر اسی وقت دوسرے سفید کپڑے پہن کر جاتے تو ناراض ہوتے اور کہتے کہ کیا تو چملروں کے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا کہ بدل کر آیا ہے؟ سب لڑکے باری باری سے سبق سناتے اور جس کا سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی نفیس مٹھائی' اکثر بادام کی خانہ ساز لوزاتیں ملتی تھیں اور جس کو یاد نہ ہوتا تھا اس کو نہیں دی جاتی تھیں اور گھرک دیتے تھے۔ نہایت سخت اور خفگی کا لفظ جو اُن کی زبان سے کسی کی نسبت نکلتا

تھا' وہ لفظ " بے بہرہ " تھا۔

سبق میں غلطی پر نانا کی خفگی

راقم جس زمانہ میں "بوستاں" پڑھتا تھا حسب دستور سبق سنانے گیا۔ اس سبق میں یہ شعر بھی تھا۔

طمع را سہ حرف است ہر سہ تہی
وزاں نیست مر طمعاں را بہی

پہلے مصرعہ کا میں نے ترجمہ کیا کہ "طمع کے تین حرف تینوں خالی" ۔ انہوں نے کہا "ہونہہ!" میں سمجھا کہ میں نے غلط پڑھا۔ پھر غور کیا' پھر وہی معنی کہے۔ انہوں نے پھر ٹوکا۔ تیسری دفعہ بھی وہی معنی کہے۔ وہ خفا ہوئے اور کہا "بے بہرہ' سبق یاد نہیں کرتا" ۔ نہ کچھ بتایا اور نہ مجھ کو کچھ دیا' جس قدر مجھ کو رنج ہوا اور برابر آنسو آنکھوں سے جاری ہوئے وہ اب تک مجھ کو یاد ہے۔ بہت دیر کے بعد میں سمجھا کہ "است" کے معنی میں نے نہیں کہے تھے۔ ہمارے بھائیوں نے ہم کو اور چڑایا اور کہا کہ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید۔ بر کلہ خود باید زد۔⑦

شاہی ظریف سے چھیڑ چھاڑ

بخشی محمود خاں نہایت خوش مزاج اور ظریف آدمی تھے۔ بادشاہ کے دربار میں نہایت خوش بیانی سے جھوٹے سچے قصے بیان کرتے تھے۔ جب بادشاہ ان سے ہم کلام ہوتے تھے تو ایسے مصروف ہو جاتے تھے کہ کسی دوسرے کو کلام کرنے کا موقع نہ ملتا تھا' بایں ہمہ نواب دبیر الدولہ کی مجلس میں نہایت ہی ساکت اور مؤدب رہتے تھے۔⑧

کہتے تھے کہ میں ہندوستان میں نواب دبیر الدولہ کو نہایت ادب کے لائق سمجھتا ہوں' مگر ان کے بیٹوں کے ساتھ دوستانہ ملاقات رکھتے تھے اور اکثر آیا کرتے تھے اور ہر وقت ظرافت آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔ بخشی محمود خاں ایرانی نژاد تھے۔ ان کی زبان سے ہندوستانی لفظوں کا' جس میں "ٹ" اور "ڈ" ہوتی' تلفظ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب بخشی محمود خاں آتے تو اکثر ہم لڑکوں کو' جو پوتے اور نواسے نواب دبیر الدولہ کے تھے اور مکتب میں پڑھتے تھے' بلواتے اور ٹوپی ٹوپی کی شرط بد کر کسی فارسی لفظ کے تلفظ کی فرمائش کرتے۔ جب وہ پوری طرح پر تلفظ نہ ہوتا تو اس لڑکے کی ٹوپی لے لیتے۔ لڑکے بھی ان سے ہندوستانی لفظوں کی فرمائش کرتے۔ "ٹٹو" مجرد و تائے ثقیل کا تلفظ ان سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمیشہ "تتو" یا "تا" کہتے تھے۔ لڑکے شرط جیت جاتے اور ان کی ٹوپی لے لیتے اور جب تک وہ لڑکوں کی ٹوپیاں نہ دیتے لڑکے بھی ان کی ٹوپی نہ دیتے۔⑨

ﷺ

آغازِ شباب

تفریحی مشاغل

شوقِ تیراکی

سید محمد متقی خاں، راقم کے والد ...... اس فن میں بے نظیر تھے۔[1]

میں نے اور بڑے بھائی نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا الطفل بہت سربر آوردہ اور نامی تھے اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سوسوا سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانہ میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان ہی دنوں میں نواب اکبر خاں اور چند اور رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینت المساجد کے پاس نواب احمد بخش خاں کے باغ کے نیچے جمنا بہتی تھی، وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔[2]

تیراندازی کی مجلسیں

مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ، جبکہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی

تھی' یاد نہیں مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانہ میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد تیراندازی شروع ہوتی تھی۔[1]

شہر کے اکثر امراء اور رئیس اور بعض سلاطین جمع ہوتے تھے اور نہایت نفیس جلسہ ہر روز ہوا کرتا تھا اور جو صنعت اور خوبی تیراندازی کی ظاہر ہوتی تھی وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔[2]

میں نے بھی اسی زمانہ میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے"۔ یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا۔[3]

اس زمانہ میں آیا سنگھ ایک تیرانداز تھا جو نہایت کڑی کمان کھینچتا تھا مگر جب ان لوگوں کا' جو اس سے نرم کمان کھینچتے تھے' تیر زیادہ تودہ میں کارگر ہوتا تھا تو بڑا لطف ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ایک پیر مرد مسلمان تھے' ان کو تیراندازی کا بڑا شوق تھا۔ "میر اِلّا اللہ" ان کا نام پڑ گیا تھا کیونکہ وہ تیر لگاتے وقت "اِلّا اللہ" کہا کرتے تھے۔ وہ غریب آدمی تھے' سامان تیراندازی کا ان کو نواب زین العابدین خاں دیتے تھے۔ وہ تیر لگانا بھی اچھا نہیں جانتے تھے مگر تیراندازی کی مجلس میں وہ سب لوگوں کو ہنسانے اور خوش کرنے والے تھے۔ ایک ذی عزت ہندو مرصع ساز کو بھی تیراندازی کا بہت شوق تھا اور تیر لگاتے وقت "اللہ غنی" کہتا تھا۔ اس کا نام "اللہ غنی" ہی پڑ گیا تھا۔ ان باتوں کے لکھنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو کہ اس زمانہ میں کیسی عمدہ صحبتیں تھیں' اب وہ سب خواب و خیال ہیں۔[4]

رنگین مزاجی

ماموں بھانجے کا مشترکہ شوق

اس زمانے کی بعض مجلسیں بھی قابل یادگار ہیں۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمتہ کے جانشین ہر مہینے کی چوبیسویں کو رات کے وقت ایک جلسہ درویشانہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے گویے آتے تھے' دھرپت و خیال گاتے تھے اور میر ناصر احمد بین بجاتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ جاتے تھے۔ راقم بھی بہت دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا ہے۔[5]★

★ حالی لکھتے ہیں "سرسید کا عنفوان شباب نہایت زندہ دلی اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتے تھے اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں کے

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

اور ایک جلسہ، مگر اس جلسہ سے مختلف قسم کا، ہر مہینے کی سترھویں کو ہوا کرتا تھا۔ رائے پران کشن ایک معزز رئیس اور نہایت ہی وضع دار اور دولت مند تھے اور اسی زمانہ میں ایک طوائف، جو خوش آواز اور دھرپت و خیال گانے اور بین بجانے میں بے مثل تھی، اس کا نام جنا تھا۔ اس نے اپنا تمام پیشہ چھوڑ دیا تھا اور رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔ اس کی خاطر سے وہ ہر مہینہ کی سترھویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔ مکان نہایت عمدہ فرش و فروش سے آراستہ ہوتا تھا۔ شیشہ آلات سے، جو اُس زمانہ میں مروج تھے، بہت ہی عمدگی اور خوبصورتی سے سجایا جاتا تھا۔ شہر کے رئیس، خصوصاً وہ جن سے رائے پران کشن کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے اور بہادر خاں ستارن، جو ستار بجانے میں بے مثل تھا اور میر ناصر احمد، جو بین بجانے میں اپنا مثل نہیں رکھتے تھے، سب جمع ہوتے تھے۔ بی جنا کے لئے صدر کے مقابل پائیں سمت میں مسند تکیہ لگتا تھا اور لوگ ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ جب وہ کوٹھے پر سے اترتیں اور ان کے پاؤں کے زیور کی آواز آتی تو لوگ زیادہ مشتاق ہوتے تھے۔ وہ نہایت متانت اور غرور سے آکر مسند پر بیٹھتی تھیں۔ اول دھرپت و خیال گاتی تھیں اور پھر بین بجاتی تھیں اور پھر اٹھ کر کوٹھے پر چلی جاتی تھیں۔ لوگ ان کے گانے بجانے کی نہایت تعریف کرتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں ہمیشہ اس جلسہ میں جاتے تھے۔ راقم بھی متعدد دفعہ ان کے ساتھ ان جلسوں میں گیا

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

جلسوں میں شامل ہوتے تھے۔ ہولی کے جلسوں اور تماشوں میں جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے، جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود ان کے نانا خواجہ فرید کی قبر پر جو نسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتے تھے۔"

"اس زمانہ میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں تھے ان کے گھر پر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا ۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی نامی طوائف زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد ہی پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اس میں جعفراں زرد پھول کھلے ہوئے ہوتے تھے اور طوائف باری باری بیٹھ کر گاتی تھیں۔ سرسید کہتے تھے کہ "میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسہ میں شریک ہوتا تھا۔"

"سرسید جیسے بڑھاپے میں بذلہ سنج تھے جوانی میں اس سے بھی زیادہ ظرافت اور حاضر جوابی ان کی طبیعت میں تھی۔ دلی میں ایک مشہور طوائف شیریں جان نامی نہایت حسین تھی مگر سنا ہے کہ اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں، جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ مجرے کے لئے آئی تھی، سرسید بھی موجود تھے اور وہیں ان کے ایک قندھاری دوست بھی بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے "مادرش بسیار تلخ ست" سرسید نے یہ مصرع پڑھا "اگرچہ تلخ ست ولیکن بر شیریں دارد"۔ (حیات جاوید، حصہ اول، ص 43-45)

ہے ★①

★۔ اودھ پنچ کے شمارہ 27 فروری 1902ء میں "بعض خاص صحبتوں" کے حوالے سے سرسید کی زبانی ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ پرچہ سرسید کے مخالفین میں شمار کیا جاتا تھا اس لئے اس امر کا شبہ ہے کہ بیان میں کچھ رنگ آمیزی کی گئی ہو لہٰذا اسے اصل متن کی بجائے حاشیہ میں نقل کیا جاتا ہے۔

"جن دنوں دلی زندہ تھی اور ہم خود بھی زندہ تھے اور زندگی زندہ دلی ہی سمجھی جاتی تھی تو ان زندہ دلوں کی سوسائٹیں کا ہیں بھی ایک جاندار رنگ تھا۔ کوئی سیر بھی خالی نہ جاتی تھی اور کوئی جلسہ تماشا ناغہ نہ ہوتا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تفریح کے موقعے حاصل کرتا تھا اور تلاش کر کر کے دل لگی کے سامان بہم پہنچاتا تھا۔ اس اوباشانہ اور سرخوشانہ طریق زندگی میں ایک دن یہ دھن سمائی کہ برسات کے پربہار دن ہیں، لال قلعہ ان دنوں اپنے جوبن پر ہوگا، امریوں میں جھولے پڑے ہوں گے، بیگمیں جھولتی ہوں گی، وہاں مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں، چلو اب کے وہاں کی بھی سیر دیکھیں لیکن کوئی تجویز قلعہ کے اندر جانے کی خیال میں نہ آتی تھی۔ ایک دیرینہ دوست سے، جو کہ قلعہ میں تعلق خدمت رکھتے تھے، بے تکلف ہمارے ہاں آیا جایا کرتے تھے، اپنی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا کہ یہ بات کوئی مشکل نہیں۔ بس شہزادوں کی سی صورت بناؤ اور میرے ساتھ چلے چلو، تمہیں کوئی پوچھنے کا بھی تو نہیں۔ لہٰذا انہی حضرت کے ارشاد کے مطابق......... میں شہزادہ بنا اور اپنے مرشد کو ہمراہ لے کر مرشد زادوں کی طرح قلعے میں داخل ہوا۔ پھر کچھ نہ پوچھئے کہ وہاں کیا سماں تھا، گویا باغ میں اندر کا اکھاڑہ اتر آیا تھا۔ نفیس نفیس نیم رنگ ہلکی پوشاکیں سب کے زیب بدن تھیں۔ کوئی دھان پان دھانی دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی، کوئی گل بدن گلابی جوڑے کی بہار دکھا رہی تھی اور کوئی قتالہ بالکل اپنی سادہ وضع ہی میں کتاؤ کر رہی تھی۔ کہیں پیازی رنگ کی انگیا پر ہلکا مصالحہ ٹنکا تھا، کہیں آبی محرم پر خوش آب موتی ڈھلک رہے تھے۔ بناؤ سنگار یا زیورات بھی اپنی اپنی جگہ پر سب کے سب جگمگا رہے تھے، گویا متعدد جواہر خانے تھے کہ طلسم آرائش سے لال پری، سبز پری، نیلم پری، پکھراج پری بن کر ہر طرف طاؤس طناز کی طرح وقف خرام ناز تھیں۔ ان میں بڑی بوڑھیاں بھی تھیں، کنواری بالیاں بھی اور خوب خوب جوان جہان بھی۔ اٹھتی جوانی، ابھرتا جوبن، نکھرتا حسن، ان سب نے مل کر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی، کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ جھولتی وہ تھیں اور پاؤں تلے سے زمین میرے نکلی جاتی تھی۔ امڈی ہوئی گھٹائیں، ہلکی ہلکی پھوہاریں، صندل کے تختے، ریشمی ڈوریاں، لچکتی ہوئی شاخیں، بڑھتی ہوئی پینگیں، حنائی ہاتھ پاؤں، نور کے گلے، قیامت کے دوہرے اور گیت، ایک سماں تھا کہ بہشت اور جنت کے نظارے نظر سے گر گئے، شاخ طوبیٰ مرجھا گئی یا حوروں پر اوس پڑنے لگی اور وہ شرما کے رہ گئیں۔"

"گھر آیا تو سچ جانو، گل فام کی طرح کئی دن حواس بجا نہ تھے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد حواس خمسہ کچھ درست ہوئے اور حسب معمول چاندنی چوک کی سیر کو نکلا تو وہاں ایک مرشد زادے اتفاقاً مل گئے۔ ان سے میری کچھ دور کی صاحب سلامت تھی۔ ہنستے ہوئے قریب آئے اور پہچان کر کہا کہ واہ سید! تم وہاں بھی جا پہنچے" میں نے انکار کیا اور کہا کہ نہیں، مجھ سے کیا علاقہ؟ وہ کوئی تمہارے ہی یار آشنا ہوں گے" کہنے لگے کہ نہیں، واللہ باللہ تم ہی تھے۔ اس پر ہم بھی ہنس دیئے اور وہ بھی کچھ دیر تک ہنستے رہے۔" (بحوالہ مضحکات و مطائبات سرسید، حصہ اول، ص 8-9)

اشراف نوجوانوں کی خصوصیت

وہ ایک عجیب قسم کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے اشراف خاندانوں کے نوجوان جو کچھ کرتے تھے ایسی طرح پر کرتے تھے کہ کوئی اس سے واقف نہ ہوتا تھا اور پردہ ڈھکا رہتا تھا۔ کوئی حرکت عام طور پر برملا ہونے نہیں پاتی تھی۔ اس زمانہ کے اشراف نوجوانوں کا عمل درآمد اس مقولہ پر تھا کہ "اپنے جسم کے زخم کو ڈھانکے رہو تاکہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں"۔ ★

★ حالی لکھتے ہیں: "سرسید کے بعض نہایت ثقہ داروں سے سنا گیا ہے کہ انہوں نے جو کچھ اس غفلت کے زمانہ میں کیا اس سے معدودے چند کے سوا کوئی شخص واقف نہیں ہوا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول ص 47)

رنگین محفلوں میں سرسید کی رغبت اور ان سے چھٹکارا پانے کا ذکر کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں "باوجود غایت وبستگی کے جو جنوں سے کسی طرح کم نہ تھی، سرسید نے جس حیرت انگیز طریقہ سے اپنے تئیں اس دلدل سے نکالا وہ درحقیقت ان کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے .... من جملہ دیگر اسباب کے، جو اس تبدیلی حالت کے باعث ہوئے، سب سے بڑا سبب سرسید کے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اس کی نظیر دی جاتی تھی۔ سرسید کے بھائی کا یہ قول تھا کہ کیسی ہی عیش و نشاط کی مجلس ہو اگر سید وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔" ایسا ہی حال سرسید کا اپنے بھائی کے ساتھ تھا چنانچہ بھائی کے مرتے ہی ان کا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس اور وضع میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا یک قلم ترک کر دیا، سر گھٹوالیا، داڑھی چھوڑ دی پائینچے متشرع کر لئے، کرتا پہن لیا، رنگین طبع نوجوان کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ ترقی انسانی کا سمجھا جاتا تھا۔" (ایضاً، ص 45-46)

وسطی ہند اور قرب و جوار کے چند مقامات کا نقشہ
نیپال
ہردوار
سہارن پور
روڑکی
مظفر نگر
کرنال
نجیب آباد
نگینہ
دیوبند
پانی پت
بجنور
نینی تال
کاشی پور
حصار
رہتک
میرٹھ
امروہہ
رام پور
مراد آباد
دہلی
پیلی بھیت
بلند شہر
بریلی
بدایوں
علی گڑھ
شاہجہان پور
الور
متھرا
ایٹہ
فرخ آباد
بھرت پور
آگرہ
جے پور
بارہ بنکی
لکھنؤ
فیض آباد
گورکھ پور
اجمیر
کان پور
ٹونک
گوالیار
رائے بریلی
اعظم گڑھ
فتح پور
پرتاپ گڑھ
جون پور
غازی پور
جھانسی
الہ آباد
بنارس

وسطی ہند اور قرب و جوار کے چند مقامات کا نقشہ
نیپال
ہردوار
سہارن پور
روڑکی
مظفر نگر
کرنال
نجیب آباد
نگینہ
دیوبند
پانی پت
بجنور
نینی تال
کاشی پور
حصار
رہتک
میرٹھ
امروہہ
رام پور
مراد آباد
دہلی
پیلی بھیت
بلند شہر
بریلی
بدایوں
علی گڑھ
شاہجہان پور
الور
متھرا
ایٹہ
فرخ آباد
بھرت پور
آگرہ
بارہ بنکی
لکھنؤ
گورکھپور
فیض آباد
جے پور
اجمیر
ٹونک
گوالیار
کانپور
رائے بریلی
اعظم گڑھ
فتح پور
پرتاپ گڑھ
جون پور
غازی پور
جھانسی
الہ آباد
بنارس

غدر ۱۸۵۷ء

مصنف کی خیر خواہی

انگریزوں کی طرف داری پر شکرِ خداوندی

کم بخت زمانہ غدر ۱۸۵۷ء کا ابھی لوگوں کی یاد سے بھولا نہیں ہے۔ اس زمانہ میں مَیں بجنور میں تھا۔ جو مصیبت کہ وہاں پر کے موجود حکام انگریزی اور عیسائیوں کے زن و مرد اور بچوں پر پڑی صرف اس خیال سے کہ انسانیت سے بعید ہے کہ ہم مصیبت کے وقت ان کا ساتھ نہ دیں' میں نے ان کا ساتھ دیا۔ غدر میں جو حال انگریزوں اور بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہو گئے' ان دونوں واقعات کا ذکر بھی دل کو شق کر دینے والا ہے۔[1]

یہ ہنگامۂ فساد جو پیش آیا ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا۔[2]

بڑا شکر خدا کا یہ ہے کہ اس ناگہانی آفت میں' جو ہندوستان میں ہوئی' فدوی بہت نیک نام اور سرکار دولت مدار انگریزی کا طرف دار اور خیر خواہ رہا۔[3]

مجھ سے اگر کچھ اچھی خدمت یا وفاداری گورنمنٹ کی ہوئی تو وہ بالکل میں نے اپنے مذہب کی

پیروی کی..... میں نے جو کچھ کیا اپنے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی[۴]

اپنے احوال کے بیان کا جواز

میرا ارادہ تھا کہ میں اپنا حال اس کتاب میں کچھ نہ لکھوں کیونکہ میں اپنی ناچیز اور مسکین خدمتوں کو اس لائق نہیں جانتا کہ ان کو گورنمنٹ کی خیر خواہی میں پیش کروں۔ علاوہ اس کے جو گورنمنٹ نے میرے ساتھ سلوک کیا وہ درحقیقت میری مسکین خدمتوں کے مقابل میں بہت زیادہ ہے اور جب میں اپنی گورنمنٹ کے انعام اور اکرام کو دیکھتا ہوں اور پھر اپنی ناچیز خدمتوں پر خیال کرتا ہوں تو نہایت شرمندہ ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہماری گورنمنٹ نے مجھ پر اس سے زیادہ احسان کیا ہے جس لائق میں تھا۔ مگر مجبوری ہے کہ اس کتاب کے مصنف کو ضرور ہے کہ اپنا حال اور اپنے خیالات کو لوگوں پر ظاہر کرے تاکہ سب لوگ جانیں کہ اس کتاب کے مصنف کا کیا حال ہے اور اس نے اس ہنگامہ میں کس طرح اپنی دلی محبت گورنمنٹ کی خیر خواہی میں صرف کی ہے[۵]

بجنور میں سرکشی کا آغاز

میرٹھ میں نمک حرامی کے آثار

میرٹھ میں جو فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تھی اس کی خبر گیارہویں تاریخ تک بجنور میں نہیں آئی تھی[۶]

دفعتاً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور میں پہنچی۔ اول تو ہم نے جھوٹ جانا مگر جب یقین ہوا تو اسی وقت میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی[۷]

بارھویں تاریخ کو یہ خبر مشہور ہوئی اور پےدرپے اس کے آثار نمودار ہوتے گئے یعنی کنارہ گنگا جمنا لٹنے لگی اور آمدورفت مسافروں کی بند ہو گئی۔ بارھویں اور تیرھویں تاریخ کو جو مسافر بجنور سے میرٹھ کو جاتے تھے راہ سے الٹ آئے مگر ضلع بجنور میں اب تک کوئی غدر نہ تھا[۸]

بجنور میں غدر کی سرگرمیاں

رفتہ رفتہ ضلع بجنور میں بھی غدر شروع ہوا۔ راہیں لٹنے لگیں۔ سولہویں مئی ۱۸۵۷ء کو شہباز پور کھدر پر ڈاکہ پڑا کہ گوجروں نے مل کر اس گاؤں کو لوٹ لیا اور یہ سب سے پہلا گاؤں ہے جو ضلع بجنور میں لٹا۔ بعد اس کے سترھویں مئی کو سرِ راہ ڈاک مسٹر کاری صاحب بہادر کو گھاٹ راولی پر لوٹا گیا۔ اگرچہ ان وارداتوں کے مجرم تدبیر اور کوشش جناب صاحب

غدر کے باب میں بیان کردہ ضلع بجنور کے چند مقامات پر مشتمل نقشہ
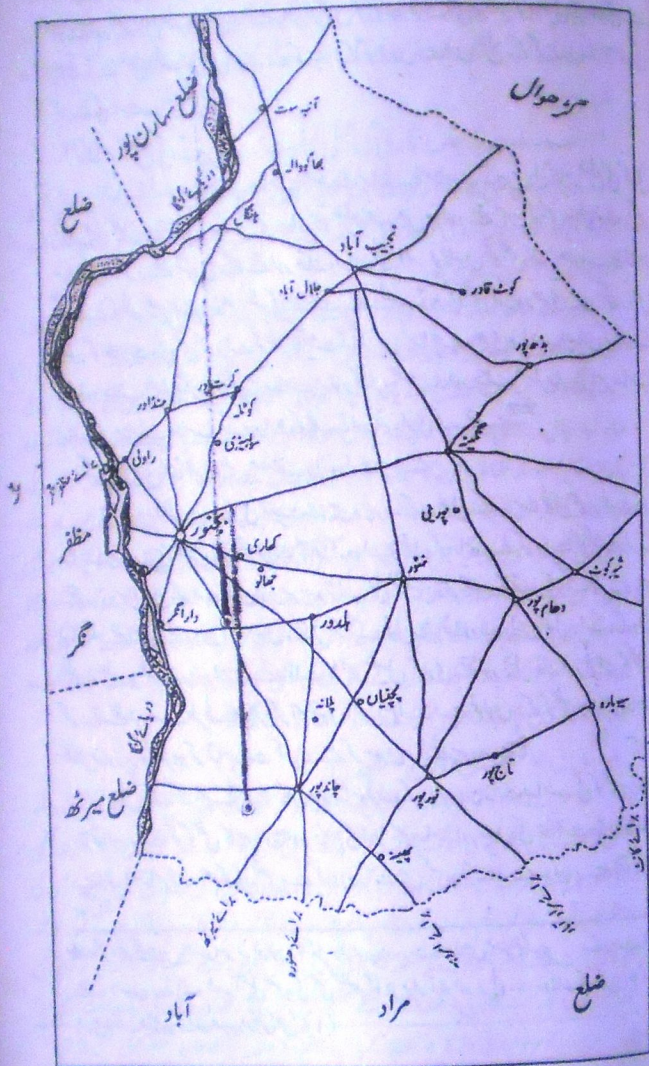
مجسٹریٹ بہادر سے بہ تعیناتی تھانہ داران اور میر تراب علی تحصیلدار و افسر پولیس کے گرفتار ہوئے اور کچھ مال مسروقہ بھی بر آمد ہوا اور لوگوں کو ڈر اور خوف بھی ہوا مگر گوجر اپنی بد معاشی سے باز نہ آئے 'علی الخصوص اس سبب سے کہ پار کے گوجروں سے اس ضلع کے گوجروں کو حرمزدگی کرنے کی بہت مدد ملتی تھی۔[۹]

انتظام ضلع کی تدبیریں

ابتدائے فساد سے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے مناسب تدبیریں انتظام ضلع کی کرنی شروع کی تھیں۔ رجمنٹوں کے رخصتی سوار 'جو ضلع بجنور میں موجود تھے 'ان کو بھی بلالیا تھا اور کچھ سوار بھی نوکر رکھنے شروع کئے تھے اور تھانہ داران اور افسر پولیسوں کو بھی بقدر مناسب بر قنداز بڑھانے کو لکھ بھیجا تھا اور خاص شہر کی حفاظت کے لئے یہ تدبیر کی تھی کہ چودھری نین سنگھ رئیس بجنور کو اجازت دی تھی کہ رات کو شہر کا گشت کیا کریں 'چنانچہ چودھری صاحب ایسا ہی کیا کرتے تھے اور جناب مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر بھی مناسب مناسب جگہ پر رات کو پھرتے اور خبرداری کرتے رہے۔[۱۰]★

انگریزوں کی حفاظت میں مصنف دن رات پہرے پر

ہم تینوں افسروں نے اپنی جمعیت ملازمین وغیرہ کے دو غول کئے۔ پہلا غول محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر و ڈپٹی مجسٹریٹ کا تھا کہ وہ اپنے غول کو ساتھ لے کر رات کو گشت کرتے تھے۔ دوسرا غول مجھ صدر امین اور میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور کا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس نوکر کم تھے اس لئے دونوں آدمیوں نے مل کر ایک غول بنالیا تھا اور یہ دونوں غول رات کے وقت علیحدہ علیحدہ شہر بجنور اور اندھیرے باغات کا 'جو متصل آبادی تھے اور جیل خانہ اور خزانہ کا گشت کرتے تھے اور سب طرف پھر پھرا کر ہم تینوں افسر مع اپنے اپنے غولوں کے کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر پر حاضر ہو کر تمام رات کمر باندھے کرسیوں پر بیٹھے پہرہ دیتے۔[۹]

یہاں تک کہ ہم نے اپنے مکان پر رہنا موقوف کر دیا۔ دن رات صاحب کی کوٹھی پر حاضر رہتا تھا اور رات کو کوٹھی کا پہرہ دیتا اور حکام کی اور میم صاحبہ اور بچوں کی حفاظت جان کا خاص اپنے ذمہ اہتمام لیا۔ ہم کو یاد نہیں ہے کہ دن رات میں کسی وقت ہمارے بدن پر سے ہتھیار اترا ہو۔[۹]

★ گراہم لکھتے ہیں "سید احمد سہ شانوں کا گھڑ سوار اور پیادہ دستہ بنانے میں مسٹر شیکسپیئر کے دست راست تھے۔ انہوں نے ایک شعبہ انٹیلی جنس کی بھی تنظیم کی جو مراد آباد اور بریلی سے روزانہ کی خبریں لاتا تھا۔" (دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد خاں ص 16)

شورش ضلع میں حد سے زیادہ ہو گئی تھی اور کوئی وقت اندیشہ سے خالی نہ تھا مگر ہم اپنے جناب کلکٹر بہادر کی مہربانی اور عنایت کا شکر ادا نہیں کر سکتے کہ ہمارے لئے سب طرح کی آسائش کا سامان وہاں مرتب تھا اور بہت اچھا شامیانہ ہمارے لئے کھڑا کر دیا تھا اور ہم بہ آسائش تمام اس میں رہتے تھے۔[1]

مصنف کے جذبۂ جاں نثاری کی عملی کیفیت

اٹھارہویں مئی ۱۸۵۷ء کو دفعتاً ایک کمپنی تلنگوں کی، جو سہارن پور سے مراد آباد جاتی تھی، بجنور پہنچی اور مجھ کو یوں خبر ملی کہ وہ کمپنی بگڑ کر آئی ہے اور صوبہ دار اور دو چار تلنگہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کی کوٹھی پر گئے ہیں۔[2]

میرے ساتھ جو لڑکا صغیر سن تھا، میں نے اپنے آدمی کو وصیت کی، میں تو مرنے جاتا ہوں مگر جب تو میرے مرنے کی خبر سن لے تب اس لڑکے کو کسی امن کی جگہ پہنچا دیجو۔[3]★

میں گھبرا کر صاحب ممدوح کے پاس گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ (کمپنی تلنگوں کی) بطور بدلی مراد آباد جاتی ہے میں نے بے ادب مدح خاں صوبہ دار کو صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا کہ وہ کچھ اپنا حال اور جو مقابلہ اس کا قریب الہ باس گوجروں سے ہوا تھا، عرض کر رہا تھا مگر اس کی بے ادبانہ گفتگو اور لاپروا اور مغرور نشست سے جو بدی اس کے دل میں تھی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتی تھی۔ اس دن یہ تجویز ہوئی کہ اس کمپنی کے قیام بجنور کی تدبیر کی جائے چنانچہ تدبیر بھی ہوئی جس سے میں بہت ڈرتا تھا۔ مگر جب ان کی بات چیت کا، جو آپس میں کرتے تھے اور نیز بازاروں میں بکتے پھرتے تھے، حال معلوم ہوا تو ان کا قیام بجنور میں نہایت نامناسب معلوم دیا اور باوجودیکہ مراد آباد سے اجازت ان کے رکھ لینے کی آ گئی تھی مگر ان کا چلا جانا غنیمت سمجھا تھا اور وہ خود بھی رہنا نہیں چاہتے تھے اس سبب سے وہ مراد آباد چلے گئے۔[4]

بد نظمی کی حالت میں ہماری مستعدی

۱۹ مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا اور یہ خبر بہت جلد ضلع بجنور میں پہنچی اور بلکہ بعض دیہات میں کچھ قیدی بھاگ بھاگ کر آ گئے۔ اس خبر کی شہرت سے ضلع میں زیادہ تر بد نظمی ہوئی اور ہر چہار طرف دیہات میں ہزارہا گنوار جمع ہونے لگے اور کسی کے دل میں عمل داری کی دہشت باقی نہ رہی اور ہم لوگوں کو ہر دم یہ اندیشہ ہونے لگا کہ مبادا بجنور پر ڈاکہ پڑے اور خزانہ سرکاری لٹ جائے مگر ہم لوگ بدستور اپنی ہوشیاری سے، جہاں تک ممکن تھا، گشت و گرداوری اور گنواروں کو رعب ظاہری دکھانے میں کچھ تقصیر نہیں کرتے تھے اور بجنور کی ایک بہت اچھی ہوا

★ "سرسید کے مرحوم بھائی کا لڑکا، جو تمہا چچا کے پاس رہتا تھا۔" (حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 70)

باندھ رکھی تھی کہ اس کے سبب گنواروں کے دلوں پر بجنور کا ایک خوف تھا۔

رُڑکی میں سپاہیوں کی سرکشی

اسی اثناء میں سفرمینا کے تین سو سپاہیوں نے رُڑکی میں سرکشی کی اور ایک کمپنی سفرمینا کی، جو رُڑکی سے سہارن پور کمانڈر انچیف صاحب بہادر کے کیمپوں میں شامل ہونے کو بھیجی گئی تھی، راستہ میں سے رُڑکی واپس آ گئی اور ان سب نے ملکر رُڑکی سے لنڈھورہ کو کوچ کیا اور لنڈھورہ کی رانی سے پیغام کیا کہ وہ ان کو اپنے پاس نوکر رکھ لے اس وعدہ پر کہ وہ رُڑکی وغیرہ سب اس کو فتح کر دیں گے مگر اس نے منظور نہ کیا۔ تب انہوں نے ارادہ کیا کہ نجیب آباد کے نواب کے پاس جا کر اپنا ارادہ پورا کریں۔ چنانچہ وہ نجیب آباد روانہ ہوئے اور بیسویں مئی کو نجیب آباد پہنچے۔

نامحمود خاں کے دل میں سرکشی کے بیج کی پیدائش

جب یہ سپاہی نجیب آباد پہنچے تو ان میں کے چند افسر اور کچھ سپاہی احمد اللہ خاں تحصیلدار نجیب آباد کے پاس گئے اور علیحدہ مکان میں بیٹھ کر کچھ گفتگو اور مصلحت کی۔ پھر وہاں سے احمد اللہ خاں ان سب آدمیوں کو لے کر محمود خاں کے پاس گیا اور وہاں بھی بہت دیر تک خفیہ مصلحت رہی...... سنا ہے کہ نواب نے کہا کہ جب تک حکام انگریزی بجنور میں موجود ہیں میں ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ تم اس شہر میں کہ خاص میرا شہر ہے اور اس تحصیل میں جو مجھ سے متعلق ہے، کچھ فساد مت کرو۔ اگر بجنور میں جا کر فساد کرو گے اور انگریزوں کو خارج کر دو گے تو پھر مجھ کو نواب ہو جانے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا۔ ان سپاہیوں نے بجنور آنے کا اقرار کیا اور یہ خبر کہ وہ تلنگے بجنور کو آتے ہیں، حواتر ہم کو پہنچی اور ہم کو نہایت ڈر اور خوف رہا اور ہم تینوں افسروں نے ایسی تدبیریں سوچیں کہ در صورت آ جانے ان بے ایمانوں کے، جہاں تک ممکن ہو سکے، حکام اہلِ ولایت کی حفاظت میں کام آئیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر کو بھی ان تدبیروں سے مطلع کیا گیا کہ ہر ایک تدبیر کا پہلے سے بندوبست رہے۔ ہم اس میں کچھ شک نہیں کرتے کہ یہ وہ وقت ہے کہ پہلی دفعہ نامحمود خاں اور احمد اللہ خاں کے دل میں سرکشی اور بغاوت کا بیج اگا اور اس نے اپنی حکومت کے خیالی درخت کو بہت اچھا سایہ دار سمجھا اور سرکار دولت مدار انگریزی کے احسانوں اور پرورشوں کو، جو اس کے اور اس کے باپ کے ساتھ کی تھیں سب کو یک لخت بھولا...... سنا گیا کہ بعد گفتگوئے نواب کے تلنگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بغیر کیمپوں کے ملے اتنا بڑا فساد کرنا مناسب نہیں اس لئے انہوں نے ارادہ مراد آباد جانے کا کیا۔

بجنور میں جیل خانہ کا ٹوٹنا

ہم تینوں افسر بجنور میں بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر حاضر تھے اور درباب حفاظت خزانہ گفتگو ہو رہی تھی کیونکہ خبر یورش گنواران اور آمد آمد پلٹن سفر مینا گرم تھی اور یہ رائے قرار پائی تھی کہ کل خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا جائے۔ ہم اسی تجویز میں تھے کہ ایک بجے سے کچھ قبل دفعتاً جیل خانہ پر بندوق فائر ہونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ جیل خانہ ٹوٹ گیا۔ جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میں صدر امین اور ڈپٹی کلکٹر صاحب اور سید تراب علی تحصیل دار صاحب بندوقیں اور تلواریں لے کر جیل خانہ پر چلے اور جس طرف قیدیوں کے غول جانے کا احتمال تھا اس طرف دوڑے۔ قریب آدھے میل کے دوڑے ہوں گے کہ اس وقت یہ خیال گزرا کہ خزانہ نہ لٹ جائے اس لئے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے مجھ صدر امین کو اور ڈپٹی کلکٹر صاحب کو حکم دیا کہ خزانہ پر جا کر وہاں کا انتظام کرو۔ چنانچہ ہم دونوں خزانہ پر واپس آئے اور فی الفور پہرہ اور پکٹ قائم کئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور سید تراب علی تحصیل دار جیل خانہ پر تشریف لے گئے۔ اتنے میں جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر مسلح گھوڑے پر سوار تشریف لائے اور کنجی خزانہ کی مجھ صدر امین کو سپرد کر کے خود مع چند سواران تعاقب قیدیاں فرمایا۔[1]

خزانہ برائے حفاظت سپردِ چاہ

ہم کو یقین تھا کہ جیل خانہ صرف اس غرض سے ٹوٹا ہے کہ قیدی اور شہر کے بدمعاش جمع ہو کر خزانے پر حملہ کریں گے مگر قیدیوں نے جیل خانہ سے نکل کر دریا کی طرف بھاگنا شروع کیا تھا اور سب کے منہ دریا کی طرف تھے اور بھاگے جاتے تھے۔ اس سبب سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا یہ ہمارا خیال غلط تھا یا یہ کہ جب قیدیوں نے جناب صاحب کلکٹر بہادر کو اور جناب جارج پامر صاحب بہادر کو مستعد اور تعاقب کرتا ہوا دیکھا تو ان کو اس فاسد ارادہ کا قابو نہ ملا۔ غرض کہ سپاہیوں کی بندوقوں سے چند قیدی مارے گئے اور کچھ زخمی ہوئے، باقی جو بچے وہ جیل خانہ میں بند کئے گئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ پر تشریف لائے اور فی الفور خزانہ نکالا گیا اور مجھ صدر امین نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں ڈال دیا۔[2]

نا محمود خاں کی خزانہ لے جانے کے ارادہ سے آمد

اس واقعہ سے پہلے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے جملہ رئیسانِ ضلع کو بجنور طلب کیا تھا کہ مع کمک کے، واسطے انتظام ضلع کے حاضر ہوں۔ زیادہ تعجب کی یہ بات ہے کہ اسی روز شام کے

قریب سا محمود خاں نجیب آباد سے مع ساٹھ ستر آدمی پٹھان بندوقچی کے بجنور میں پہنچا۔ ظاہر میں تو یا شبہ یہ بات تھی کہ حسب الطلب آیا ہے مگر تعجب یہ ہے کہ اپنے ساتھ خالی گاڑیاں واسطے لے جانے خزانہ کے نجیب آباد کو لایا تھا اور جب ہم صاحب سے ملا تو نہایت افسوس سے ہاتھ مل کر کہا کہ کیا غضب کیا جو خزانہ کنوئیں میں ڈال دیا۔ میں تو گاڑیاں واسطے لے جانے نجیب آباد کے لایا تھا۔"

صاحبوں کی خاطر جان قربان کر دینے کی تمنا

اس رات بجنور میں بہت بڑا اندیشہ رہا کیونکہ تلنگوں کا ارادہ مراد آباد جانے کا ابھی تک کھلا نہ تھا کہ بجنور ہی آنے کا یقین تھا اور ہم کو کچھ امید نہ تھی کہ آج کی رات خیر سے گزرے گی اور بڑا خطرہ ہم کو حکام انگریزی اور جناب مم صاحب کا تھا کیونکہ یہ نمک حرام کم بخت تلنگے خاص حکام انگریزی کے نقصان پہنچانے کے درپے تھے' ہندوستانی آدمیوں یا اہل کاروں سے چنداں سروکار نہیں رکھتے تھے۔ ہم اپنے دل کا حال بیان کرتے ہیں کہ جناب مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر (دام اقبالہٗ) اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر (دام اقبالہٗ) جو جو اخلاق اور عنایات ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈال دی تھی کہ ان صاحبوں کی خدمت گزاری میں ہم اپنی جان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے★۔ بے مبالغہ میں اپنے دل کی کیفیت بیان کرتا ہوں کہ محبت کے سبب ان صاحبوں کی نسبت جو وہم دل میں آتا تھا وہ بری ہی برا دکھائی دیتا تھا اور جب اس وہم کا اثر دل پر پہنچتا تھا تو دل سے ایک محبت کا بہت بڑا شعلہ نکلتا تھا اور وہ ان صاحبوں کو گھیر لیتا تھا اور ہمارا دلی ارادہ یہ تھا کہ خدانخواستہ اگر برا وقت آئے تو اول ہم پروانہ کی طرح قربان ہو جائیں پھر جو کچھ ہو سو ہو اور میں کچھ شک نہیں کرتا کہ میرے ساتھی دونوں افسروں کا بھی یہی حال تھا۔ ہم جب اس رات کوٹھی پر آن کر بیٹھے ہیں تو اس ارادے سے نہیں آئے تھے کہ ہم زندہ یہاں سے پھر اپنے گھر پر آئیں گے مگر نہایت خدا کا شکر ہے کہ ہماری اس سچی نیت نے ہم کو بہت بڑا پھل دیا کہ ہمارے محبوب حکام کو بھی سب

★ حالی لکھتے ہیں: "مسٹر شیکسپیئر' جو اس زمانہ میں بجنور کے کلکٹر و مجسٹریٹ تھے' گو کہ سرسید کو باعتبار عہدہ ...ان سے کچھ تعلق نہ تھا مگر مسٹر شیکسپیئر اور مسز شیکسپیئر سے ان کی بہت راہ و رسم تھی۔ جب بجنور میں بغاوت کے آثار ہویدا ہونے لگے اور حالت خطرناک ہوئی تو مسز شیکسپیئر بہت گھبرائیں۔ سرسید کو جب یہ حال معلوم ہوا تو جا کر ان کی تشفی کی اور کہا کہ "جب تک ہم زندہ ہیں آپ کو گھبرانا نہیں چاہئے۔ جب آپ دیکھیں کہ ہماری لاش

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

طرح اپنے فضل میں رکھا اور ہم کو بھی ہر آفت سے بچایا۔①

نامحمود خاں کی جھوٹے عذروں کے ساتھ روانگی

نامحمود خاں جو اپنے آنے کے بارہ گھنٹے کے بعد بہت بے قرار تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح میں نجیب آباد چلا جاؤں اور طرح طرح عذر بجنور کے رہنے میں پیش کرتا تھا مگر ہم کو اس وقت تک چنداں شبہ اس پر نہ تھا۔ ہم اس کے جھوٹے عذروں کو سچا سمجھتے تھے اور ہر طرح سے اس کی خاطر کرتے تھے کہ بجنور میں مقیم رہے کیونکہ ہم کو اس سے بڑی توقع کمک کی تھی۔ مگر اب ہم خیال کر سکتے ہیں کہ یہ بے قراری اس کی صرف اس سبب سے ہو گی کہ بجنور میں اس کا منصوبہ پورا نہ ہوا تھا یعنی نہ تلنگے آئے تھے اور نہ خزانہ لے جانے کا اس کو قابو ملا تھا اسلئے وہ گھبراتا تھا اور چاہتا تھا کہ بجنور سے نجیب آباد جاکر اور کوئی نیا منصوبہ کرے۔ غرض کہ دو روز بمشکل ٹھہرا اور پھر نجیب آباد چلا گیا۔②

احمد اللہ خاں بدذات کے بھائی کی انتظام ضلع میں شرکت

جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے یہ مناسب تجویز فرمائی تھی کہ چند ذی عزت آدمی، جن کا دباؤ ضلع میں ہو، بطور سپرنٹنڈنٹ ضلع مقرر کئے جائیں اور وہ جمعیت مناسب ساتھ لے کر ہر ایک پرگنہ میں گشت کرتے رہیں اور جہاں گنواروں کی لام بندی سنیں ان کو متفرق کر دیں۔ چنانچہ شفیع اللہ خاں بھائی احمد اللہ خاں بدذات کا اور مصطفیٰ خاں رشتہ مند نامحمود خاں کا اور سعد اللہ خاں رئیس بڈھ پور کا، جو سابق میں تھانہ دار نگینہ تھا، اس کام کے لئے نامزد کئے گئے کیونکہ یہ لوگ ذی عزت تھے اور ان کے ساتھ بہت پٹھان اچھے سپاہی ساتھی اور برادری کے تھے اور بڑی منفعت یہ بھی تھی کہ یہ نالائق سرکار کو اپنے حال پر متوجہ دیکھ کر شکر سرکار کا ادا کریں گے اور خیر خواہی

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

کوٹھی کے سامنے پڑی ہے اس وقت گھبرانے کا مضائقہ نہیں۔ "مسٹر شیکسپیئر ہمیشہ سرسید کی اس شریفانہ تقریر کے شکر گزار رہے۔ سرسید کا یہ کہنا صرف زبانی نہیں تھا بلکہ انہوں نے اپنے افعال سے اس قول کو سچ کر دکھایا تھا۔"
(حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 69)

مسٹر شیکسپیئر اپنی رپورٹ نمبر 56 مورخہ 5 رجون 1858ء بنام کمشنر روہیل کھنڈ میں لکھتے ہیں: "جس رات ہم نے کیمپ چھوڑنا مناسب جانا، اگر صدر امین صاحب درمیان میں نہ ہوتے تو یقین تھا کہ نواب صاحب اپنے اہلکاروں کو بدعت کی اجازت دیتے اور اغلب تھا کہ ہماری جان پر ضرور صدمہ پہنچتا۔" (لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 20)

سرکار میں بہ دل معروف رہیں گے اور اس کا نتیجہ بہت اچھا پائیں گے اور چونکہ یہی لوگ ضلع میں فساد چاہتے تھے ان کو اپنی طرف کر لینے سے فساد نہ ہونے کی بھی توقع تھی۔[6]

ستوطِ ضلع کے خدشات

ہم لوگ نہایت متردد اور فکرمند تھے اور ظاہر ہے کہ ہم سب کی بلکہ بہت سے اضلاع کی نظر بریلی پر تھی اور جبکہ بریلی اور شاہ جہاں پور اور پیلی بھیت اور بدایوں اور مراد آباد سب اضلاع روہیل کھنڈ کے بگڑ چکے تھے تو اس بجنور کے ضلع کے قائم رہنے کی کیا توقع تھی...... درحقیقت روہیل کھنڈ کے بگڑنے کے بعد کون مصلحت دے سکتا تھا کہ حکام انگریزی ایسی حالت پر بھی ضلع نہ چھوڑیں مگر ہمارے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے اس حالت پر بھی استقلال کو ہاتھ سے نہیں دیا اور بدستور ضلع کے انتظام پر کمربانڈھے رہے اور جناب صاحب ممدوح کی حسنِ تدبیر سے ہم سب کو امید تھی کہ شاید ایسے وقت میں بھی ضلع قائم رہے بشرطیکہ اور کوئی آفت پیدا نہ ہو مگر اس آفت نے ہم کو نہ چھوڑا جس کا داغ ہمارے دل پر سے کبھی نہیں جانے کا۔[7]

نامحمود خاں کی واضح بددیانتی کا دور

بارادۂ فساد دوبارہ آمد

نامحمود خاں باوجودیکہ پہلی دفعہ ہرگز بجنور میں رہنا نہ چاہتا تھا اب کی دفعہ بلاطلب جناب صاحب کلکٹر بہادر کے نجیب آباد سے بجنور کو آنا خالی شبہ سے نہ تھا۔ چنانچہ یکم جون کو وہ بجنور میں پہنچا اور احاطہ کوٹھی جناب صاحب کلکٹر بہادر میں اس نے ڈیرہ کیا۔ اب کی دفعہ علامتیں بغاوت کی اس کے چہرہ سے ظاہر تھیں اور وہ اپنے دل کو اپنی حکومت کے خیال سے خوش کرتا تھا اور اس کے عشق میں چور تھا اور ڈپٹی صاحب کے سامنے اس نے ایسی باتیں کیں جن سے صاف ارادہ فاسد اس کا ظاہر ہوتا تھا۔ ڈپٹی صاحب نے مجھ کو بلا کر نامحمود خاں کی فاسد نیت سے مطلع کیا۔ میں نے کہا کہ فی الفور جملہ حال جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس کی باتوں سے جو فساد اس کی نیت کا ہم کو معلوم ہوا تھا ہم نے جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور یہ تجویز ہوئی کہ نامحمود خاں کو بجنور سے رخصت کیا جائے۔ اب اس کا جانا مشکل معلوم ہوتا تھا مگر بحکمت اس کو بہ بہانہ دورہ پرگنہ چاندپور روانہ کیا مگر وہ پچھتا ہوا اور اگر کو چلا گیا۔[8]

خزانہ کی میرٹھ کو روانگی

اس اثناء میں دوسری جون کو جناب کپتان گف صاحب بہادر مع چند سواروں کے میرٹھ

سے خزانہ لینے کو بجنور میں تشریف لائے اور پچاس ہزار روپیہ کنوئیں میں سے نکال کر صاحب ممدوح کے سپرد کر گئے۔ باوجودیکہ صاحب پاس سوار بہت کم تھے اور ڈاکہ والوں کے ہر طرف غول کے غول جمع تھے مگر صاحب موصوف نے بکمال دلاوری خزانہ ہاتھیوں پر لدوا چوتھی جون کو براہ گھاٹ دارانگر میرٹھ کو چلے گئے جس دلاوری سے صاحب خزانہ لے گئے ہیں ہر شخص اس کو دیکھ کر اور سن کر عش عش کرتا تھا۔①

تیسری بار آمد پر ہماری تشویش

نامحمود خاں جو دارانگر کی طرف گیا ہوا تھا اس کو کسی نے خبر بھیجی کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ ہلدور کو روانہ کرتے ہیں۔ ہلدور والوں کا خاندان ضلع میں ایک بڑی دہشت والا مشہور تھا اور نامحمود خاں کو اگر کچھ اندیشہ تھا تو اسی خاندان سے تھا۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اگر یہ معاملہ اسی طرح پر ہوا تو شاید اس کے دلی ارادوں میں زیادہ دقت پیش آئے۔ یہ خبر سنتے ہی اس نے اپنی بدنی ہوئی نیت کا ظاہر کرنا اور اس کا اثر دکھانا اپنے دل میں ٹھان کر دفعتاً ساتویں جون ۱۸۵۷ء کو مع اپنے ساتھی پٹھانوں کے بجنور میں چلا آیا اور شام تک کچھ اور پٹھان نجیب آباد سے بھی آ گئے تھے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس رات نامحمود خاں کے پاس تخمیناً دو سوڈھائی سو پٹھان اچھے بندوقچی مع سازو سامان موجود ہوں گے۔ ہم نے جو پٹھان اور اور لوگ نئے نوکر رکھے تھے ان کا بلکہ پرانے نوکروں کا بھی دل نامحمود خاں کی طرف پاتے تھے اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ سب لوگ نامحمود خاں سے ملتے تھے اور میٹھی میٹھی باتیں اس سے کرتے تھے اور کیا تعجب ہے کہ کسی راز میں بھی شریک ہوں۔ اس زمانہ میں بجنور میں یہ آفت ہو گئی تھی کہ ہر ایک شخص کے دل میں جم گیا تھا کہ سرکار کی عملداری اٹھ جائے گی اور بے شبہ نامحمود خاں مسند حکومت پر بیٹھے گا اس لئے ہر ایک شخص اس ضلع کا رہنے والا اس سے راہ و رسم رکھنی ضروری سمجھتا تھا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب ہمارے نوکر بھی نامحمود خاں کے ساتھیوں میں سے تھے اور ہم کو ہر گز توقع نہ تھی کہ برے وقت پر یہ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ ہم یقین جانتے تھے کہ یہ سب نامحمود خاں کے ساتھ ہو جائیں گے۔②

بدذات خان بہادر خاں کی پیروی

اسی تاریخ چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاجپور پاس مفصل خطوط حالات بگڑنے بریلی اور مراد آباد کے آ گئے اور خان بہادر خاں کی بے ایمانی اور نمک حرامی کی بھی مفصل خبر آ گئی اور انہوں نے وہ سب خط جناب صاحب کلکٹر بہادر کو دکھا دیئے اور کم بخت نامحمود خاں کو بھی بدذات خان

بہادر کی خبر لی بھی تھی اور در حقیقت اسی خبر سے اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ خان بہادر خاں کی پیروی کرے اور رات کو وقت اپنا ارادہ پورا کرنے کا ٹھہرا چکا تھا مگر اس وقت تک ہم کو اس بدذات کے ارادہ کی خبر نہیں ملی تھی۔ صرف اتنی بات ہوئی تھی کہ جب نا محمود خاں آیا تو جناب صاحب کلکٹر بہادر نے دو دفعہ اس کم بخت کو بلایا وہ نہ گیا اور جب گیا تو اس کی بات چیت میں خود جناب صاحب کلکٹر بہادر نے بے رخی دیکھی اور اس کی پیشانی پر اس کے دلی ارادہ کا اثر پایا۔[9]

فساد رُکوانے کے لئے نواب سے پیغام رسانی

رات کو آٹھ بجے محمد سعید خاں محرر کلکٹری ساکن نجیب آباد نے مجھے خبر دی کہ محمود خاں کا ارادہ آج رات کو فساد کرنے کا ہے کیونکہ اس بات کے سننے سے کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر خزانہ بلدور بھیجتے تھے' نہایت برہم ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ رات کو کشت و خون ہو جائے۔ میں نے محمد سعید خاں سے کہا کہ تم ابھی جاؤ اور تدبیر کرو کہ فساد نہ ہو اور خود اور ولی محمد کی معرفت میری طرف سے نواب کی خاطر جمع کر دو کہ خزانہ بلدور نہیں جانے کا اور نہ وہاں بھیجنے کی صلاح ٹھہری ہے اور اسی وقت میں نے سعد اللہ خاں بڈھ پور والے کو بلایا اور اس کو بہت سمجھایا کہ تم فساد کو روکو اور نواب کو سمجھاؤ اور کہہ دو کہ اگر بالفرض خدانخواستہ دو انگریز مارے بھی جائیں گے تو کیا فائدہ ہو گا اور بدنامی اور نمک حرامی جدا ہو گی اور خدا کے ہاں جدا منہ کالا ہو گا اور اس بات کا میں ذمہ دار ہوں کہ خزانہ بلدور نہیں جانے کا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر کوئی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے نواب صاحب کی سرداری اور اعتبار پر دوسرے کو ترجیح ہو' پھر فساد کرنے اور بدنامی اٹھانے اور خوں ریزی ہونے سے کیا فائدہ ہے؟ پھر میں اور سید تراب علی تحصیل دار اسی وقت جناب صاحب کلکٹر بہادر پاس حاضر ہوئے اور ڈپٹی صاحب بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ بعد گفتگوئے مضامین ان خطوط کے جو چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاج پور پاس آئے تھے' یہ سب حالات مفصل میں نے جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کئے اور درباب قیام اور عدم قیام حکام اور انتظام ضلع در صورت تشریف بری حکام کے بہت سی گفتگو اور مصلحت رہی۔[10]

انگریز حکام کی تشریف بری

انگریز عورتوں اور بچوں کی روانگی کی تیاری

اسی دن مراد آباد سے یہ بھی خبر آئی تھی کہ کچھ باغی فوج اور دو توپیں بجنور کو روانہ ہونے کو ہیں۔ اگرچہ اس وقت بھی ہم کو اس خبر کے صحیح ہونے میں کچھ شبہ نہ تھا اور عقل بھی اس بات کو

قبول کرتی تھی کہ نمک حرام فوج کو بڑی غرض خزانہ لوٹنے سے اور اس سے زیادہ مطلب حکام انگریزی کے نقصان جان کا تھا۔ پھر بجنور کو ان آفتوں سے خالی چھوڑنا ہرگز قیاس میں نہیں آتا تھا...... اس لئے رات کو مصلحت کے وقت اس بات میں بھی کہ فوج باغی کے آنے پر کیا تدبیر کی جائے گی، گفتگو ہوئی تھی اور لوگوں کے دلوں کا حال دیکھ کر میری یہ رائے تھی کہ جب سب لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ فوج آتی ہے اور راستہ میں ہے تو جتنے لوگ یہاں ہیں کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دینے کا اور ہم کو ایک ایسا چوہا تک بھی میسر نہیں آنے کا جو حکام انگریزی کی رفاقت کرکے گنگا پار کسی امن کی جگہ تک ان کو پہنچا دے اور بے شبہ میری رائے بہت صحیح اور نہایت پکی تھی اور ہمارے جناب صاحب کلکٹر بہادر اور عقل مند آدمی بھی اس کو تسلیم کرتے تھے۔ غرض کہ بہت سی مصلحت کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ آج ہی رات کو جناب میم صاحبہ اور عیسائی عورتیں اور بچے اور کچھ مرد بمعیت جناب مسٹر کری صاحب مظفر نگر اور وہاں سے روڑکی روانہ ہو جائیں اور صرف جناب الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر بجنور میں تشریف رکھیں۔ بارہ بجے رات کو یہ صلاح پکی ہو گئی اور جناب میم صاحبہ کی روانگی کی تیاری ہونے لگی۔[11]

نواب کو قائل کرنے کی کوششیں

اس وقت نا محمود خاں کی ان بدنیتوں کے سبب 'جو اَب جوبی کھل گئی تھیں' یہ رائے ٹھہری کہ بلا اطلاع نا محمود خاں میم صاحبہ کے روانہ کرنے میں مبادا کچھ فساد ہو جائے لہٰذا اس سے بھی صلاح لے لی جائے۔ چنانچہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کے حکم سے اسی وقت رات کو نا محمود خاں کے پاس 'جو احاطہ کوٹھی میں مقیم تھا' میں گیا اور میں نے اس کو پٹھانوں کے غول میں بیٹھا ہوا پایا۔ میں نے اس سے عرض کیا کہ مجھ کو علیحدہ آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ اول تو اس نے ایک عجیب غرور سے کہا کہ یہاں کون غیر ہے 'سب بھائی پٹھان ہیں' کہو۔ مگر میرے اصرار پر اٹھ کر آیا۔ میں نے اس سے اول یہ بات کہی کہ آپ کو کس نے یہ خبر دی ہے کہ خزانہ ہلدور جاتا ہے؟ یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور میں ذمہ دار ہوتا ہوں کہ خزانہ نہیں جانے کا۔ اس نے جواب دیا کہ میرا منہ کالا ہونے میں اب کچھ باقی نہیں۔ میرے ساتھ کے پٹھان مجھ کو گالیاں دیتے ہیں اور بہت برا بھلا کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خان بہادر خاں اپنی موروثی گدی پر ہو بیٹھا اس کم بخت کو کیا ہوا ہے جو چپکا بیٹھا ہے؟ اور میں نے انگریزوں کا نمک کھایا ہے' میں نہیں چاہتا کہ کوئی انگریز مارا جائے اور میرا منہ کالا ہو۔ اگر انگریزوں کو اپنی جان بچانی ہے تو یہاں سے نکل جائیں۔ اگر کوئی

پٹھان مار دے گا تو میں کیا کروں گا؟ علاوہ اس گفتگو کے جس طرز اور انداز پر اس نے مجھ سے باتیں کیں جس کی کیفیت بات چیت کرنے میں متکلم اور مخاطب ہی خوب جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور بیان میں نہیں آ سکتی اس سے مجھ کو بخوبی یقین ہو گیا کہ یہ کم بخت فساد کرنے پر بالکل مستعد اور ہمہ تن بلکہ بہ ہمہ جان آمادہ ہے۔ اس وقت جو میرے دل پر کیفیت تھی میں ہرگز بیان نہیں کر سکتا کیونکہ مجھ کو یقین ہو گیا تھا کہ آج حکام انگریزی کی جان کو ضرور نقصان پہنچے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ جو بات بغیر فساد کے حاصل ہو اس میں فساد کرنا اور بدنامی اٹھانی نہیں چاہئے۔ اگر آپ کی صلاح ہو تو ہم ایسی تدبیر کریں کہ جناب صاحب کلکٹر بہادر سے کہہ کر آج رات کو جناب میم صاحبہ اور اور صاحبوں کو یہاں سے روانہ کر دیں۔ دو ایک روز میں جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جائنٹ مجسٹریٹ بہادر خود چلے جائیں گے اور تم نواب ہو ہی' بغیر فساد اور بدنامی کے تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ اور اسی قسم کی اور باتیں جو مناسب وقت کے تھیں' اس سے کہیں جن سے اس کے دل میں یہ بات پڑی کہ حکام انگریزی کی جان کو نقصان نہ پہنچے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ کہاں کا کھیڑا ہے کہ آج جناب میم صاحبہ جائیں اور پھر حکام جائیں۔ اگر جاتا ہے تو آج سب چلے جائیں ورنہ میرا منہ کالا ہو گا یعنی کوئی مارا جائے گا۔ اس وقت تک تو میں نے پٹھانوں کو روک رکھا ہے' پھر میرے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ ...... غرض کہ جب مجھ کو یقین ہو گیا کہ نامحمود خاں نے فساد کرنا بخوبی اپنے دل میں ٹھان لیا ہے اور وہ کسی طرح باز نہیں آنے کا اس وقت میں نے کہا کہ چلو' ہم اور تم چل کر جناب صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کریں کہ اب یہاں رہنا مناسب نہیں۔ اس نے کہا "میں تو نہیں جاتا اور میں صاحب کلکٹر سے کہہ چکا ہوں کہ یہاں نہ رہیں اور جو شرط نمک حلالی کی تھی اس سے میں ادا ہوا۔ اب چاہے جائیں' چاہے نہ جائیں۔" یہ کہہ کر اپنے پٹھانوں میں جا بیٹھا۔[1]

تشریف بری حکام پر مجبوری مصلحت

لاچار میں نے آن کر یہ سب حال صاحب کلکٹر بہادر سے عرض کیا اور اس وقت درباب سپردگی ضلع اور تشریف بری حکام کی پھر مصلحت ہوئی۔ ایسے حال میں کہ مراد آباد سے فوج باغی کے آنے کی خبر گرم تھی اور کوئی آدمی ملازمان جدید و قدیم میں سے قابل اطمینان کے نہیں تھا اور دشمن قوی بغل میں تھا اور ظاہر ہے کہ ہم تین آدمی بجز اس کے کہ اپنی جان دے دیتے اور کیا کر سکتے تھے۔ کچھ کو چارہ نہ تھا سوائے اس کے کہ حکام انگریزی سردست حفظ جان کا کریں اور ضلع چھوڑ دیں۔ چنانچہ ہم سب کی یہی رائے قرار پائی اور ہمارے حکام نے بھی اس کو پسند کیا کہ اگرچہ اول

اہل ڈپٹی صاحب کو اس میں تامل تھا مگر پھر یہی رائے ان کے نزدیک بھی مستحسن ٹھہری۔[1]

چودھری صاحبان کا انتظامِ ضلع سے انکار

ہر ایک شخص ضلع کا اپنے تئیں قدیم متوسل اور پرانا نمک خوار اور پشتینی تابع دار نامحمود خاں کا سمجھتا تھا اور ایسے تزلزل کے وقت میں ہر ایک کی نگاہ اسی پر پڑتی تھی۔[2]

اگرچہ اس وقت کوئی اَور مصلحت نہ تھی بجز اس کے کہ ضلع کم بخت نامحمود خاں کے ہاتھ میں چھوڑا جائے مگر ہمارے جناب صاحب کلکٹر بہادر نے بنظرِ دور اندیشی اور اس خیال سے کہ شاید اَور کوئی کام کی بات نکل آئے، چودھری رندھیر سنگھ رئیس ہلدور اور چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاج پور سے پوچھا کہ تم ضلع کا انتظام کر سکتے ہو؟ انہوں نے مجبوری اپنی اور نہ ہو سکنا اس کام کا اپنے سے بیان کیا اور درحقیقت ممکن نہ تھا کہ ضلع کے آدمی نامحمود خاں کو چھوڑ کر اَور کسی کی حکومت قبول کرتے۔ میں نے جناب صاحب کلکٹر بہادر کے روبرو چودھری رندھیر سنگھ سے یہ بات بھی کہی تھی کہ ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ بروقت آجانے پلٹن باغی کے جب تک کہ وہ ضلع سے چلی جائے، حکام انگریزی کی حفاظت رہے۔ چودھری صاحب نے اس امر کا ہونا بھی غیر ممکن بیان کیا۔ غرض کہ یہ سب باتیں دو بجے رات کے طے ہوئیں اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر نے بھی روانگی کی تیاری کی۔[3]

نامحمود خاں کو ضلع کی سپردگی کی سند

اس وقت میں اور سید تراب علی اجازت لے کر عورتوں کے اور بچوں کی روانگی کے سامان کو کوٹھی سے باہر نکلے اور نامحمود خاں سے میں نے کہا کہ اب سب صاحب جاتے ہیں۔ تم ان صاحبوں کی حفاظت میں اب بہت کوشش کرو کیونکہ جناب صاحب کلکٹر بہادر کا ارادہ ہے کہ پار پہنچ کر گورنمنٹ کو رپورٹ کریں کہ یہ تمام ضلع تم کو مل جائے اور اسی قسم کی مصلحت آمیز باتوں★ سے اس کو خوش کیا اور بخوبی اپنی خاطر جمع کر لی کہ کچھ اب فساد نہیں ہونے کا۔ اس وقت میں اور سید تراب علی تحصیل دار مکان پر آئے اور فی الفور عورتوں کو اور بچوں کو سوار کر کے تین بجے رات کے جناب صاحب کلکٹر بہادر کی کوٹھی کے احاطہ کے پاس لا کر ٹھہرایا اور خود ہم دونوں جناب

★ ایک مصلحت آمیز بات کا ذکر نواب شجاع اللہ خاں نے اس موقع کے حوالے سے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"سید احمد خاں آئے اور محمود خاں سے کہا کہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ ڈپٹی رحمت خاں چودھریان ہندوؤں کو ضلع سپرد کرائے دیتے تھے لیکن میں نے کوشش کر کے آپ کے سپرد کرا دیا اور بلاشرکت آپ کو رئیس کرا دیا۔" (سرکشی ضلع بجنور مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق، ص 296)

ممدوح کے پاس حاضر ہوئے اور سواروں کے افسروں سے کہا کہ کچھ سوار ہمراہی کو چلیں۔ مجھو
ہماری بات کو سب چپکے ہو رہے مگر قطب الدین رسالہ دار اور جو ٹے سوار بریلی سے آئے تھے
اور ابھی ان کا میل جول نامحمود خاں سے نہیں ہوا تھا ہمراہی کو مستعد ہوئے اور بہادر علی جمعدار اور
تین چار سوار پرانے آمادہ ہوئے۔ ہاتھی سب تیار تھے اور سوار بھی تیار ہو کر کوٹھی پر حاضر ہوئے۔
اس وقت سید تراب علی تحصیل دار کو بھیج کر نامحمود خاں کو بلوایا گیا اور جناب صاحب کلکٹر بہادر نے
فرمایا کہ ہم جاتے ہیں اور ضلع تمہارے پاس چھوڑتے ہیں تم بخوبی انتظام رکھو اور نیک اہل کاروں سے
کام لو اور آرام سے رکھو۔ نامحمود خاں نے کہا کہ مجھ کو خط لکھ دو۔ جناب صاحب کلکٹر بہادر نے
مجھ کو حکم دیا کہ لکھ دو۔ میں نے اس وقت خط لکھا...... یہ خط بعد دستخط نامحمود خاں کو دیا گیا اور وہ
بدنصیب اس کو لے کر باہر آیا۔⁹

صاحب کلکٹر بہادر کی مُروّت

میں تعریف نہیں کر سکتا ہے جناب صاحب کلکٹر بہادر کی مروت اور اخلاق اور ہر ایک اپنے
متوسل کی پرورش کے خیال کا کہ ایسے نازک وقت میں جناب ممدوح نے سب عیسائی مرد اور
عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لیا اور ہم سے پوچھا کہ تم کیا کرو گے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم بھی
بھاگیں گے۔ ڈپٹی صاحب کے اہل و عیال سب پہلے ہی جا چکے تھے۔ سید تراب علی تحصیل دار کے
اہل و عیال اور چھوٹے بچے اور لڑکیاں سب بجنور میں تھیں۔ صاحب نے سید تراب علی
سے فرمایا کہ ہم سب کو مثل اپنے سمجھتے ہیں اور سب کی حفاظتِ جان اپنے ساتھ چاہتے ہیں۔ اگر
تمہاری عورتوں اور بچوں کا ہمارے ساتھ چلنا ہو تو ہم سب کو لے چلیں گے مگر یہ امر بہت مشکل
تھا۔ ہم نے عرض کیا کہ بالفعل کو ٹلہ جائیں گے اور وہاں سے جہاں امن ملے اور جو الفاظ ہماری
دلجوئی اور پرورش اور مہربانی کے ہم پر فرمائے اس کا ہم شکر ادا نہیں کر سکتے۞

رنج دِہ جدائی

جناب صاحب کلکٹر بہادر نے کلمات رخصت ہم سے فرمائے اور جو رنج اور درد جدائی کا
ہمارے دل پر تھا وہ ہم نے ظاہر کیا۔ تھوڑی دیر بعد سب سوار ہونے کو کوٹھی کے برآمدہ میں آئے
اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جائنٹ مجسٹریٹ بہادر نے بکمال عنایت مجھ کو اور
سید تراب علی تحصیل دار کو رخصت کیا کہ اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر چلے جائیں۔ ہم رخصت
ہوئے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور سب صاحب سوار ہو کر تشریف فرما ہوئے۔ ڈپٹی صاحب
مع چودھری رندھیر سنگھ ! کو چلے گئے۔ مجھو اس بات کو کہ وہ سب نمک حرام پرانے سوار مع
بہادر علی جمعدار کے گنگا کے کنارہ پر سے نامحمود خاں پاس بھاگ آئے مگر نئے سوار روڑکی تک

ساتھ رہے اور وہاں پہنچ کر بگڑ گئے۔ ان کا کوٹ ہوا' جناب صاحب کلکٹر بہادر کی عنایت سے ان کی جاں بخشی ہو گئی۔ ★

نامحمود خاں کی حکومت

اپنے نام کی منادی

محمود خاں نے سورج کو بھی اچھی طرح نکلنے نہیں دیا کہ بجنور میں اپنے نام کی منادی ان الفاظ سے کہ

"خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم نواب محمود خاں بہادر کا"

پٹوا دی اور نواب بن بیٹھا۔

کوٹلہ کو ہماری روانگی

ہم رخصت ہو کر کوٹلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ہم کو بہت سے غول سپاہیوں کے نجیب آباد سے بجنور آتے ہوئے ملے اور کوٹلہ میں شفیع اللہ خاں بھانجا محمود خاں کا ملا جو نجیب آباد سے بجنور کو آتا تھا۔

حال یہ ہے کہ نجیب آباد میں نامحمود خاں اور احمد اللہ خاں نے بہت سے آدمی نوکر رکھ لئے تھے اور بہت سے پٹھان ان کے ساتھی وہاں جمع تھے۔ ایسا گمان بلکہ یقین ہوتا ہے کہ اس نے اس گروہ کو نجیب آباد سے بلایا تھا اور منتظر تھا ان لوگوں کے آجانے کا۔

بجنور میں طلبی اور حسبِ سابق اپنے عہدوں پر

ہم نے دو تین روز کوٹلہ میں قیام کیا اور ہم اس فکر میں تھے کہ یہاں سے کدھر جائیں اور کیونکر جائیں کہ اس درمیان میں متواتر احکام نامحمود خاں کے ہماری طلب میں پہنچے۔ آخر کو سوار آن کر ہم کو بجنور لے گئے اور سید تراب علی تحصیلدار کے قبائل نگینہ روانہ ہو گئے اور ڈپٹی صاحب بھی ہلدور سے حسب الطلب بجنور میں آئے۔ ہم سب نے نامحمود خاں سے ملاقات کی مگر جیسا کہ وہ چاہتا تھا اس کو نذریں نہیں دیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہم کو رخصت کیا اور یہ بات کہی کہ بدستور اپنا کام کرو۔

★ منشی جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلکٹر بجنور کی نواب محمود خاں کو انتظام ضلع کی سپردگی اور خود روڑکی چلے جانے کی خبر دربار دہلی میں 25 جون کو موصول ہوئی (غدر کی صبح شام ص 45)

ہماری خفیہ کمیٹی کا عدمِ تعاون کا منصوبہ

میں نے اور تراب علی تحصیل دار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک کہ باہم کمیٹی کے اس کی صلاح نہ ہو لے۔ چنانچہ اسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھہری کہ میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور جو ضروری حکم نواب کا پہنچے اس کو لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مال گزاری بجز اس قدر روپیہ کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جائے اور کچھ وصول نہ کریں ــــــــــــــــــ

ــــــــ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بخشی رام تحویل دار کی معرفت کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہم راز تھا، جو مال گزار آیا اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے۔ اس تساہل سے نواب ناراض ہوا اور احکام سخت بھیجنے لگا اور کلمات نالائم پروانہ جات میں تحریر ہونے لگے اور نسبت اجرائے کار دیوانی یہ رائے ٹھہری کہ جب تک ہو سکے میں صدر امین بموجب آئین سرکار دولت مدار انگریزی کام کرتا رہوں اور کسی طرح کا تعلق نواب سے اس کام کا نہ رکھوں۔ چنانچہ مجھ صدر امین نے ایسا ہی کیا اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابلِ ارسال بحضور جناب صاحب جج بہادر تھیں ان میں علی الاعلان کچہری میں یہی حکم تحریر ہوتا رہا کہ بحضور جناب صاحب جج بہادر بھیجی جائیں۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ حکام انگریزی کا تسلط بدستور ہے، البتہ نواب کو یہ امر بہت ناگوار تھا اور ایسی باتوں سے اس کی دشمنی ہمارے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی تھی، مگر ہم کو توقع تھی کہ ہمارے حکام بہت جلد پھر ضلع میں تشریف لاتے ہیں۔(۱)

نامحمود خاں کا نیا بندوبست

نامحمود خاں نے نیا بندوبست کرنا شروع کیا۔ عظمت اللہ خاں منصف ٹھاکر دوارہ کو اپنا نائب اور احمد اللہ خاں تحصیل دار نجیب آباد کو ڈپٹی کلکٹر متعہد اور جائنٹ مجسٹریٹ مقرر کیا، مگر احمد اللہ خاں نے ایسی مداخلت بہم پہنچائی اور نواب کو بالکل ایسا اپنے قابو میں کر لیا کہ تمام انتظام فوج اور ملک اور مال اور عدالت کا اسی کو اختیار تھا اور در حقیقت نواب صرف برائے نقش رہ گیا تھا۔ فوج سوار اور پیادہ کے رکھنے کو قلم جاری کر دیا اور جو جو لوگ پرانے عہدہ دار نواب کے خاندان کے تھے وہ اپنے پرانے عہدوں پر مامور ہونے کو طلب ہوئے اور احمد یار خاں عرف کلن خاں سپہ سالار اور حبیب اللہ خاں بخشی فوج مقرر ہوا۔ ہم اس حال کو دیکھ دیکھ کر بہت گھبراتے تھے، علی الخصوص اس بات سے کہ جو کوئی نواب کے سامنے حکام انگریزی کا نام لیتا تھا تو وہ بہت ناراض ہوتا تھا۔(۲)

مولوی قادر علی تحصیل دار کی برخاستگی

اس عرصہ میں نواب کے پاس بہت سے رشتہ منداس کے جمع ہو گئے اور اس کو اپنے رشتہ داروں کی پرورش منظور ہوئی اور یہ بھی اس کو خیال تھا کہ یہ معزز عہدہ دار بسبب خیر خواد ہونے سرکار کے میری مرضی کے موافق کام نہیں کرنے کے اس لئے سترہویں جون ۱۸۵۷ء کو پہلی بسم اللہ اس نے مولوی قادر علی تحصیل دار نگینہ کو برخاست کیا اور عباداللہ خاں اپنے رشتہ مند کو' جو پیش کار تحصیل کاشی پور ضلع مراد آباد تھا' تحصیل دار نگینہ مقرر کیا۔ جب مولوی قادر علی برخاست ہو کر بجنور میں آئے' نواب کچھ متوجہ نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی اس برخاستگی کو غنیمت سمجھا' ان آفات سے علیحدہ ہو جانا بہت اچھا جانا۔①

نواب کے لالچ دینے پر کھری کھری باتیں

اسی تاریخ تا محمود خاں نے رات کے وقت مجھ صدر امین کو اپنے پاس بلایا اور تا محمود خاں اور احمد اللہ خاں نے تخلیہ میں مجھ سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ شریک ہو جاؤ اور تم ہم سے ہمارے ساتھ شریک ہونے پر حلف کرو اور جو جاگیر چاہو نسلاً بعد نسلٍ اب ہم سے ٹھہرالو اور ہم سے حلف لو کہ ہم ہمیشہ وہ جاگیر بحال رکھیں گے۔ اول تو مجھ کو بڑا ڈر ہوا کہ کیا جواب دوں۔ پھر میں نے اپنے دل کو اسی بات پر مستقیم کیا کہ سچی بات اور سیدھی بات کہنی ہر وقت اچھی ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ نواب صاحب' میں اس بات پر حلف کر سکتا ہوں کہ میں ہر حال میں تمہارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمہاری بدخواہی نہ کروں گا' اِلّا اگر تمہارا ارادہ ملک گیری اور انگریزوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہوں' اور میں نے کہا کہ خدا کی قسم نواب صاحب' میں صرف تمہاری خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تم اس ارادہ کو دل سے نکال دو' حکام انگریزی کی عمل داری کبھی نہیں جائے گی☆ اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو بھی حکام انگریزی کے سوا کوئی عمل داری ہندوستان میں نہ کر سکے گا۔ اور میں نے کہا کہ تم اطاعت سرکار اپنے ہاتھ سے مت دو۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے' جیسا کہ تمہارا خیال ہے تو تم نواب بنے بنائے ہو' تمہاری نوابی کوئی نہیں چھینتا اور اگر میرا خیال سچ نکلا تو تم

☆ حالی لکھتے ہیں: "ان کے ایک دوست' جو اس وقت بجنور میں موجود تھے' ان کا بیان ہے کہ عین اس بدعملی کے وقت جب کہ تمام روہیل کھنڈ میں کوئی یورپین یا یوریشین باقی نہ تھا سید احمد خاں ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ کم وبیش ایک سال بعد تمام ملک میں انگریزی تسلط بدستور قائم ہو جائے گا ' اور گورنمنٹ کے بے شمار خیر خواہوں میں کسی کے چہرہ سے وہ اطمینان اور استقلال ظاہر نہیں ہوتا تھا جیسا سرسید کے چہرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ "

(حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 329)

خیر خواہ سرکار ہو گے اور سرکار کی طرف سے تمہاری ترقی اور بہت قدر ہو گی اور اگر تم مجھ کو انتظام ملک میں شریک کیا چاہتے ہو تو جناب صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت منگا لو اور یہ اقرار کر لو کہ کوئی کام نہیں کرنے کے جب تک پہلے اس کی منظوری جناب صاحب کلکٹر بہادر سے حاصل نہ کر لیں۔

نواب کی ناراضگی اور ہم پر زیادتیاں

اگر نا محمود خاں میں عقل ہوتی تو سمجھتا کہ یہ سب باتیں اس کی بھلائی کی تھیں مگر چونکہ جبلت اس کی بدی پر تھی وہ ان باتوں سے ناراض ہوا اور چیں بجبیں ہو کر مجھ کو رخصت کر دیا اور ہر طرح ہماری دشمنی کے درپے ہو گیا اور جان لیا کہ یہ لوگ رفاقت سرکار انگریزی سے باز نہ آئیں گے۔ پھر ہم پر زیادہ تر زیادتی شروع کی۔ میرے خاص رہنے کے مکان کو بجبر مجھ سے چھین لیا اور اپنی فوج کے افسروں کو دے دیا' جو اسباب میرا اس میں بند تھا وہ سب فوج والوں نے لے لیا۔ سید تراب علی تحصیل دار کا گھوڑا بہ تعیناتی تمیں سپاہیوں کے بجبر چھین لیا اور ہر طرح سے درپے ہمارے آزار کے ہو گیا۔ ہم دن رات اس فکر میں تھے کہ کسی طرح نواب کے پنجے سے نکل جائیں مگر ممکن نہ تھا۔

چودھریان بجنور کا نواب سے مقابلہ کا ارادہ

اسی عرصہ میں احمد اللہ خاں نے خزانہ سرکاری' جو کنوئیں میں تھا' نکالنا شروع کیا اور کچھ اس میں سے احمد اللہ خاں نجیب آباد لے گیا اور نا محمود خاں نے ہر ایک رئیس سے بھی مخالفت شروع کی۔ چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ رئیسان بجنور نے نواب سے ارادہ مقابلہ کیا اور دیہات سے آدمی جمع کیے۔ ہزارہا آدمی گنوار بجنور میں جمع ہو گئے۔ نواب نے چودھریوں سے مصالحت چاہی' چنانچہ ایک دن رات کے وقت چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ رئیسان بجنور واسطے صلح کے نواب پاس کوٹھی پر گئے مگر اس وقت ملاقات نہ ہوئی' جب وہاں سے پھرے تو دونوں چودھری تحصیل میں آئے اور مجھ سے اور سید تراب علی تحصیل دار سے یہ بات کہی کہ ہمارا ارادہ ہے کہ لڑ کر نواب کو اٹھا دیں۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم اس میں کچھ صلاح نہیں دے سکتے کیونکہ ہم کو معلوم نہیں کہ یہ امر حکام انگریزی کے مرضی موافق ہو گا یا نہ ہو گا۔ تمہارا جو دل چاہے سو کرو مگر یہ سمجھ لو کہ تمام اسباب جناب صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر کا اور خزانہ سرکاری اور دفتر اب تک موجود ہے' اگر اس پر کچھ آفت پہنچی اور لٹ گیا تو بلاشبہ باعث ناراضمندی حکام انگریزی ہو گا۔

نواب اور چودھریوں میں صلح کا حلف

یہ ہنگامہ ہنوز برپا تھا کہ دفعتاً منیر خاں نامی ساکن گنج پورہ نگینہ سے جہادی بن کر مع جمعیت چار سو آدمی کے بجنور میں داخل ہوا اور احمد اللہ خاں 'جو نجیب آباد گیا ہوا تھا' اس فساد کی خبر پا کر بجنور میں آیا اور احمد یار خاں عرف کلن خاں سپہ سالار اور نادر شاہ خاں رسالہ دار رخصتی رجمنٹ ملتان 'جو بجنور میں آگیا تھا' درمیان میں پڑے اور آپس میں نواب کے اور چودھریوں کے صلح ٹھہری۔ احمد اللہ خاں اور دونوں چودھری صاحب تیئسویں جون ۱۸۵۷ء کو کچہری تحصیل میں آئے اور بہت سی گفتگو کے بعد صلح ٹھہری۔ چودھری صاحبوں نے گنگا جل اٹھایا کہ ہم نواب کے تابع دار اور مطیع رہیں گے اور احمد اللہ خاں نے اسی جلسہ میں کلام اللہ پر مہر کی کہ ہم چودھریوں کے ساتھ برائی نہیں کریں گے اور نا محمود خاں اور عظمت اللہ خاں نے کوٹھی پر سے کلام اللہ مہر کر کے بھیج دی اور آپس میں صلح ہو گئی۔(۱)

منیر خاں جہادی کا ہمارے قتل پر فتویٰ

منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے اور درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ہمارے ساتھ فساد کرنے میں نواب کا بھی اشارہ تھا کیونکہ اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ جہادیوں کے ہاتھ سے ہم لوگوں کے مارے جانے میں نواب کی کچھ بدنامی نہ ہوتی تھی اور کام نکلتا تھا اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر کی نسبت علاوہ اس الزام کے یہ بھی جرم لگایا گیا تھا کہ عیسائی کتب ہر جگہ بٹھاتا پھرتا تھا۔ غرض کہ منیر خاں نے ہم پر زیادتی کی اور بجبر و حکومت ہم کو طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر نہ ہو گے تو بہتر نہ ہوگا اور بڑی مشکل یہ ہوئی کہ چند چپراسیان تحصیل ہم سے مخالف اور جہادیوں سے جا ملے تھے اس لئے لاچار میں اور سید تراب علی تحصیل دار اس کے پاس گئے۔ منیر خاں نے مجھ سے درباب مسئلہ جہاد گفتگو کی۔ میں نے اس سے کہا کہ شرع کے بموجب جہاد نہیں ہے اور اسی قسم کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے۔(۲)

گفتگو درباب مسئلہ جہاد مرد نگا

اس کے دوسرے دن منیر خاں مذکور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور کے پاس گیا اور درباب

مسئلہ جہاد ان سے گفتگو کی۔ تحقیق سنا کہ مولوی علیم اللہ نے بہت دلیری سے اس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت دلیلوں سے اس قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے مگر اس گفتگو پر بہت دنگا ہوا اور منیر خاں کے ساتھیوں نے مولوی علیم اللہ کے قتل کو تلوار نکالی مگر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر بچا دیا۔ اس کے دوسرے دن منیر خاں مع اپنے ساتھیوں کے، بجز ان چند آدمیوں کے جنھوں نے ان گفتگوؤں کے بعد ساتھ چھوڑ دیا تھا، دہلی چلا گیا اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا۔[1]

دہلی سے شاہی فرمان کی آمد

اس عرصہ میں غلغلہ ہوا کہ خان بہادر خاں نے فرمان حکومت ملک کٹہر کا بادشاہ دہلی سے حاصل کیا اور کٹہر کا تمام ملک اس کو مل گیا۔ نا محمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ملک کٹہر میں ضلع بجنور بھی شمار میں آجائے اور حکومت اس ضلع کی بھی خان بہادر خاں کو مل جائے اس لئے ان سب نے آپس میں مل کر تجویز کی کہ ایک عرضی بادشاہ دہلی کو بھیج کر اس ضلع کی سند نا محمود خاں کے نام پر بادشاہ سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ ان سب نے باہم مشورہ کر کے ایک مسودہ عرضی مرتب کیا اور عمدہ خاں کے ہاتھ اس کا بھیجنا تجویز ہوا.... تیرہویں تاریخ کو عمدہ خاں عرضی موسومہ بادشاہ دہلی بجنور سے لے کر روانہ دہلی ہوا۔[2]

اٹھائیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو عمدہ خاں...... مع فرمان شاہی موسومہ نا محمود خاں بجنور میں آیا اور اس کے ساتھ لالہ متھرا داس پدر لالہ بانکے رائے خزانچی بھی دہلی سے بجنور میں آئے اور عمدہ خاں نے وہ فرمان نا محمود خاں کو دیا۔[3]★

بدنیتی و فساد کے پتلے احمد اللہ خاں اور ماڑے بدمعاش میں صلح

احمد اللہ خاں نجیب آباد سے نگینہ آیا اور چودھویں کو دھام پور پہنچا۔ وہاں جانے سے مطلب یہ تھا کہ امام بخش عرف ماڑے بدمعاش شیر کوٹ نے جو روپ چند مہاجن کو لوٹا اور لاکھا

★۔ مذکورہ شاہی فرمان مرقومہ 21 جولائی 1857ء بزبان فارسی میں سلاطین دہلی کے لئے نواب محمود خاں اور ان کے آباؤ اجداد کی خدمات کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کیا گیا ہے: "اگر تم اپنی گذشتہ اعلیٰ خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اب بھی بڑھ کر خدمتیں انجام دو گے تو لطف شاہی بہت زیادہ کر دیا جائے گا اور تمام ضلع کا انتظام تمہارے سپرد کر دیا جائے گا اور جو تم نے عرضی میں خواہش کی ہے منظور فرمالیا جائے گا۔ تاوقتیکہ ایک پختہ سند جاری نہ کی جائے تم ضلع کی آمدنی اپنے پاس جمع رکھو اور افواج، افسران محکمہ آمدنی کی تنخواہ دے کر بقیہ ہمیں ارسال کرو اور ساتھ ہی خزانہ دے کر اسباب، گھوڑے جو معقول تعداد میں انگریزی فوج کے فراری کے بعد تمہارے ہاتھ آئے ہیں انہیں تم مع تفصیل مرقومہ بدست متھرا داس روانہ کرو اور دو سواران شاہی ہمراہی کر دو تاکہ تمہاری کارگزاری جانچی جائے اور ترقی دی جائے۔" (غدر کے فرمان، ص 27)

روپیہ کا مال لے لیا تھا اس کا تدارک کرے اور جو روپیہ اس نے لوٹا ہے وہ اس سے چھین کر اپنے قبضے میں لائے۔[1]

احمد اللہ خاں کے دھام پور میں پہنچنے کے بعد سب ہندو اور مسلمان اس کے ساتھ متفق تھے اور چودھریان شیر کوٹ نے بھی ہر طرح سے اطاعت احمد اللہ خاں کی کی تھی اور بمقام دھام پور آکر انیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد اللہ خاں سے بطور ملازمت ملاقات کی تھی اور زمینداران شیر کوٹ بھی احمد اللہ خاں کے شریک تھے کیونکہ ہر شخص ماڑے کا فساد رفع ہونا دل سے چاہتا تھا مگر اس وقت احمد اللہ خاں سے ماڑے کچھ کم زور نہ تھا اس لئے احمد اللہ خاں نے ماڑے سے صلح کرنی چاہی اور اپنے معتمدوں کو بیچ میں ڈالا۔ بڑی منفعت اس صلح میں احمد اللہ خاں کو یہ تھی کہ ایک پکا بد معاش اس کے ہاتھ آتا تھا اور ضلع میں طرح طرح کے فساد برپا کرنے کو ایک بہت اچھا چلتا اوزار ملتا تھا چنانچہ یہ حکمت اس کی چل گئی اور ماڑے صلح پر راضی ہو گیا اور بائیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو ہاتھی پر بیٹھ کر بعزت تمام دھام پور میں آیا اور احمد اللہ خاں سے ملاقات کی اور چار اشرفیاں اور کچھ روپیہ نذر دیئے اور تلوار کھول کر احمد اللہ خاں کے آگے رکھ دی۔ احمد اللہ خاں نے بہت خاطر کی اور وہ تلوار اپنی طرف سے اس کی کمر میں باندھ دی اور اسی دن شیر کوٹ کو رخصت کیا..... احمد اللہ خاں جو بد نیتی اور فساد کا پتلا تھا اور دوسرا ان کا بھی استاد نواب ماڑے خاں بہادر بد معاش ان کے ساتھ ہوا' فساد ایک درجہ سے گیارہ درجہ ہو گیا۔[2]

چودھریوں کا بجنور پر قبضہ

چودھریوں کی بجنور پر چڑھائی

پانچویں اگست ۱۸۵۷ء کو چودھری مہاراج سنگھ ہلدور والا نے' جو ہلدور میں موجود تھا' بشرکت چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ رئیسان بجنور کے..... بجنور میں نامحمود خاں پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور رات کو ہلدور سے روانہ ہوئے اور مع ایک ضرب توپ اور کئی جزائیل اور تخمیناً چار ہزار آدمی کی جمعیت سے چھٹی اگست ۱۸۵۷ء کو دفعتاً ساڑھے پانچ بجے بجنور کے قریب آ گئے کہ ان کے ڈھول اور تاشہ کی آواز بجنور میں آنے لگی اور اونچے مکانوں کی چھتوں پر سے ان کے لشکر کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت نامحمود خاں کے ہاں ناچ ہو رہا تھا۔ وہ خواب غفلت سے چونکا اور ہر شخص سے پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے اور کون ہے اور کیوں آتے ہیں؟ افسوس' اگر میں ان کے پاس ہوتا تو کہتا کہ حضور' اب معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی وقت نواب کے ہاں سپاہ کی کمربندی ہو گئی اور سعد اللہ خاں منصف امروہہ' جو نواب سے ملنے آیا ہوا تھا' ہاتھی پر

مسئلہ جہاد ان سے گفتگو کی۔ تحقیق سنا کہ مولوی علیم اللہ نے بہت دلیری سے اس کے ساتھ گفتگو کی اور بہت دلیلوں سے اس قائل کیا کہ مذہب کی رو سے جہاد نہیں ہے' مگر اس گفتگو پر بہت دنگا ہوا اور منیر خاں کے ساتھیوں نے مولوی علیم اللہ کے قتل کو تلوار نکالی مگر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر بچا دیا۔ اس کے دوسرے دن منیر خاں مع اپنے ساتھیوں کے' بجز اُن چند آدمیوں کے جنھوں نے ان گفتگوؤں کے بعد ساتھ چھوڑ دیا تھا' دہلی چلا گیا اور وہاں جا کر لڑائی میں مارا گیا۔[9]

دہلی سے شاہی فرمان کی آمد

اس عرصہ میں غلغلہ ہوا کہ خان بہادر خاں نے فرمان حکومت ملک کٹہر کا بادشاہ دہلی سے حاصل کیا اور کٹہر کا تمام ملک اس کو مل گیا۔ نامحمود خاں کو بڑا تردد ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ملک کٹہر میں ضلع بجنور بھی شمار میں آ جائے اور حکومت اس ضلع کی بھی خان بہادر خاں کو مل جائے اس لئے ان سب نے آپس میں مل کر تجویز کی کہ ایک عرضی بادشاہ دہلی کو بھیج کر اس ضلع کی سند نامحمود خاں کے نام پر بادشاہ سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ ان سب نے باہم مشورہ کر کے ایک مسودہ عرضی مرتب کیا اور عمدہ خاں کے ہاتھ اس کا بھیجنا تجویز ہوا...... تیرہویں تاریخ کو عمدہ خاں عرضی موسومہ بادشاہ دہلی بجنور سے لے کر روانہ دہلی ہوا۔[10]

اٹھائیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو عمدہ خاں...... مع فرمان شاہی موسومہ نامحمود خاں بجنور میں آیا اور اس کے ساتھ لالہ متھرا داس پدر لالہ بانکے رائے خزانچی بھی دہلی سے بجنور میں آئے اور عمدہ خاں نے وہ فرمان نامحمود خاں کو دیا۔[11] ★

بدنیتی و فساد کے پتلے احمد اللہ خاں اور ماڑے بدمعاش میں صلح

احمد اللہ خاں نجیب آباد سے نگینہ آیا اور چودھویں کو دھام پور پہنچا۔ وہاں جانے سے مطلب یہ تھا کہ امام بخش عرف ماڑے بدمعاش شیر کوٹ نے جو روپ چند مہاجن کو لوٹا اور لاکھ ہا

★۔ مذکورہ شاہی فرمان مرقومہ 21 جولائی 1857ء بزبان فارسی میں سلاطین دہلی کے لئے نواب محمود خاں اور ان کے آباؤ اجداد کی خدمات کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کیا گیا ہے: "اگر تم اپنی گذشتہ اعلیٰ خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اب بھی بڑھ کر خدمتیں انجام دو گے تو لطف شاہی بہت زیادہ کر دیا جائے گا اور تمام ضلع کا انتظام تمہارے سپرد کر دیا جائے گا اور جو تم نے عرضی میں خواہش کی ہے منظور فرما لیا جائے گا۔ تاوقتیکہ ایک پختہ سند جاری نہ کی جائے تم ضلع کی آمدنی اپنے پاس جمع رکھو اور افواج' افسران محکمہ آمدنی کی تنخواہ دے کر بقیہ ہمیں ارسال کرو اور ساتھ ہی خزانہ دے کر اسباب' گھوڑے جو معقول تعداد میں انگریزی فوج کے فراری کے بعد تمہارے ہاتھ آئے ہیں انھیں تم مع تفصیل مرقومہ بدست متھرا داس روانہ کرو اور دو سواران شاہی ہمراہی کر دو تاکہ تمہاری کارگزاری جانچی جائے اور ترقی دی جائے۔" (غدر کے فرمان' ص 27)

روپیہ کا مال لے لیا تھا اس کا تدارک کرے اور جو روپیہ اس نے لوٹا ہے وہ اس سے چھین کر اپنے قبضے میں لائے۔[1]

احمد اللہ خاں کے دھام پور میں پہنچنے کے بعد سب ہندو اور مسلمان اس کے ساتھ متفق تھے اور چودھریان شیر کوٹ نے بھی ہر طرح سے اطاعت احمد اللہ خاں کی کی تھی اور بمقام دھام پور آ کر انیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو احمد اللہ خاں سے بطور ملازمت ملاقات کی تھی اور زمینداران شیر کوٹ بھی احمد اللہ خاں کے شریک تھے کیونکہ ہر شخص ماڑے کا فساد رفع ہونا دل سے چاہتا تھا مگر اس وقت احمد اللہ خاں سے ماڑے کچھ کم زور نہ تھا اس لئے احمد اللہ خاں نے ماڑے سے صلح کرنی چاہی اور اپنے معتمدوں کو بیچ میں ڈالا۔ بڑی منفعت اس صلح میں احمد اللہ خاں کو یہ تھی کہ ایک پکا بدمعاش اس کے ہاتھ آتا تھا اور ضلع میں طرح طرح کے فساد برپا کرنے کو ایک بہت اچھا چلتا اوزار ملتا تھا چنانچہ یہ حکمت اس کی چل گئی اور ماڑے صلح پر راضی ہو گیا اور بائیسویں جولائی ۱۸۵۷ء کو ہاتھی پر بیٹھ کر بعزت تمام دھام پور میں آیا اور احمد اللہ خاں سے ملاقات کی اور چار اشرفیاں اور کچھ روپیہ نذر دیئے اور تلوار کھول کر احمد اللہ خاں کے آگے رکھ دی۔ احمد اللہ خاں نے بہت خاطر کی اور وہ تلوار اپنی طرف سے اس کی کمر میں باندھ دی اور اسی دن شیر کوٹ کو رخصت کیا..... احمد اللہ خاں جو بدنیتی اور فساد کا پتلا تھا اور دوسرا ان کا بھی استاد نواب ماڑے خاں بہادر بدمعاش ان کے ساتھ ہوا، فساد ایک درجہ سے گیارہ درجہ ہو گیا۔[2]

چودھریوں کا بجنور پر قبضہ

چودھریوں کی بجنور پر چڑھائی

پانچویں اگست ۱۸۵۷ء کو چودھری مہاراج سنگھ ہلدور والا نے، جو ہلدور میں موجود تھا، بشرکت چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ رئیسان بجنور کے..... بجنور میں نا محمود خاں پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور رات کو ہلدور سے روانہ ہوئے اور مع ایک ضرب توپ اور کئی جزائیل اور تخمیناً چار ہزار آدمی کی جمعیت سے چھٹی اگست ۱۸۵۷ء کو دفعتاً ساڑھے پانچ بجے بجنور کے قریب آ گئے کہ ان کے ڈھول اور تاشہ کی آواز بجنور میں آنے لگی اور اونچے مکانوں کی چھتوں پر سے ان کے لشکر کے نشان دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت نا محمود خاں کے ہاں ناچ ہو رہا تھا۔ وہ خواب غفلت سے چونکا اور ہر شخص سے پوچھتا تھا کہ یہ کیا ہے اور کون ہے اور کیوں آتے ہیں؟ افسوس، اگر میں ان کے پاس ہوتا تو کہتا کہ حضور، اب معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی وقت نواب کے ہاں سپاہ کی کمربندی ہو گئی اور سعد اللہ خاں منصف امروہہ، جو نواب سے ملنے آیا ہوا تھا، ہاتھی پر

سوار ہو کر اور کچھ سوار اپنے ساتھ لے کر دیکھنے گیا اور اس نے اپنی آنکھ سے چودھریوں کو دیکھ کر نامحمود خاں سے آن کر کہا کہ چودھری چڑھ آئے۔ نامحمود خاں کا رنگ زرد ہو گیا اور ہوش جاتے رہے۔ اتنے میں چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ گھوڑوں پر سوار بجنور کے بازار میں آئے۔ میں اور سید تراب علی اس وقت تحصیل کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ میں نے چودھری جودھ سنگھ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے باآوازِ بلند یہ بات کہی کہ نواب نے اپنے ہاتھوں نوابی پر خاک ڈال دی، اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔[1]

نواب کی شکست اور نجیب آباد کو فرار

اسی وقت چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ نے شہر کی ناکہ بندی کر لی اور آدمی متعین کر دیئے کہ کوئی شخص شہر میں نہ آنے پائے اور شہر کو نہ لوٹے۔ درحقیقت یہ بندوبست ایسی ہوشیاری سے کیا گیا تھا کہ اس دن شہر کا بچانا صرف ان دونوں چودھریوں کا کام تھا۔ شہر کے مسلمانوں نے بھی اس دن کوئی بات اعانت اور مدد نواب کی برخلاف چودھریوں کے نہیں کی۔ جبکہ یہ معاملہ پیش آیا تو نواب بھی لاچار جبراً و قہراً ہاتھی پر چڑھ کر اور جو سپاہ اس وقت قریب چار سو آدمی اور تیس چالیس سوار کے موجود تھی، ان کو لے کر میدان میں آیا۔ بخارے کے باغوں پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اول ایک باڑ بندوق کی طرفین سے چلی، چار آدمی چودھریوں کی طرف سے زخمی ہوئے اور ایک مارا گیا۔ نواب کی طرف کا کوئی آدمی میں نے زخمی نہیں دیکھا اور نہ کسی کی لاش دیکھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِدھر کے آدمی بھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اتنے میں نواب کی طرف سواروں نے متفرق ہو کر توپوں پر حملہ کرنا چاہا تھا کہ دفعتاً ایک فیر توپ کا اور ایک ایک فیر جزائیلوں کا چودھریوں کی طرف سے سر ہوا۔ نواب نے توپ کی آواز سنتے ہی ہاتھی پھیر دیا اور کوٹھی پر آن کر اپنے چھوٹے بیٹے کو ہاتھی پر بٹھا بھاگ نکلا۔ بڑا بیٹا اس کا غضنفر علی خاں ننگے پاؤں گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگ گیا۔ سپاہ تمام اس کی اور سوار تتر بتر ہو گئے اور شکستِ فاش نواب کو نصیب ہوئی۔ نامحمود خاں اور سعد اللہ خاں مع بہت قلیل جماعت کے براہ منڈاور نجیب آباد پہنچا اور تھوڑی دیر پہلے اس سے احمد اللہ خاں جو شیر کوٹ سے بھاگا تھا نجیب آباد پہنچ چکا تھا۔ سب بھاگے ہوئے نجیب آباد میں جمع ہو کر اور آپس میں گلے لگ لگ کر خوب روئے۔[2]

لڑائی کے دوران ہماری ناقابلِ بیان حالت

جب کہ بجنور میں لڑائی ہوئی تو ڈپٹی کلکٹر صاحب ہلدور میں تھے اور ہماری کمیٹی کے تینوں ممبر یعنی میں اور سید تراب علی تحصیل دار بجنور اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر بجنور میں اپنے اپنے مکان بند کئے بیٹھے تھے اور جو صدمہ ہمارے دل پر تھا اس کا بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے

خیال میں بھی نواب کی شکست ہونی نہیں آتی تھی اور خوب ہم کو یقین تھا کہ نواب ہم تینوں کی جان نہیں بخشنے کا کیونکہ سچا جرم طرف داری اور خیر خواہی سرکار اور خفیہ خطوط کتابت کا' جو اس نے ہماری طرف لگا رکھا تھا' اس کے سوا یہ بڑا شبہ اس کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ چودھریوں کا لڑنا علی الخصوص چودھریان بجنور کا بمقابلہ پیش آنا یہ ہم لوگوں کے اغوا سے ہوا حالانکہ ہم اس اخیر الزام سے بالکل بری اور بے خبر تھے[1]

چودھریوں کے نام کی منادی

اس دن بجنور میں چودھری صاحبوں کے نام سے ان الفاظ سے منادی ہوئی کہ " خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ بجنور والوں اور ہلدور کے چودھری صاحبوں کا" ڈھم' ڈھم' ڈھم۔ ان الفاظ کے سننے سے خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ جب میں نے یہ منادی سنی تو کہا' سبحان اللہ! ہم تو کتابوں میں یہ بات پڑھتے آتے تھے کہ " دو بادشاہ دراقلیمے نگنجند " یہاں یہ تماشا ہے کہ " پنج بادشاہ دریک ضلع میگنجند " ' نہیں نہیں' ان کی تمثیل یوں کہنی چاہئے کہ " دہ درویش دریک گلیمی بخسپند[2] "۔

گنواروں کی لوٹ مار اور آتش زنی

اس فتح کے ہوتے ہی تینوں چودھری صاحب اس کوٹھی پر جس میں جناب صاحب کلکٹر بہادر رہتے تھے اور اب نا محمود خاں اس میں رہتا تھا' جا بیٹھے اور گنواروں نے' جن کا قابو میں رکھنا ناممکن تھا اور در حقیقت لوٹ کی توقع پر جمع ہوئے تھے' یورش کی اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر کے بنگلہ میں اور سواروں کے لئے جو نا محمود خاں نے پھونس کی بارکیں بنائی تھیں' ان میں آگ لگا دی اور لوٹنا شروع کیا...... پھر ان ہی بے قابو گنواروں نے کچہری کی کوٹھی پر حملہ کیا اور انگریزی دفتر کی کتابیں اور سرویئری نقشہ جات کی کتابیں اور جو اسباب لوٹنے کے قابل تھا' لوٹ لیا اور کلکٹری اور فوج داری کے دفتر میں چھپر ڈال کر آگ لگا دی[1]۔

ایک بجے کے قریب چودھری مہاراج سنگھ کا سوار مجھ کو اور سید تراب علی تحصیل دار کو کہ ہم دونوں تحصیل کے مکان میں دروازہ بند کئے بیٹھے تھے' بلانے آیا۔ ہم دونوں وہاں گئے اور دفتر کے کمروں میں سے آگ کے شعلے نکلتے ہوئے دیکھ کر ہمارا دل بھڑک اٹھا اور سرکاری افیم جو اس وقت لٹ رہی تھی' اس کو دیکھ کر ہماری جان تلخ ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہم وہاں ٹھہر کر واپس آ گئے۔ چار بجے سب چودھری صاحب تحصیل میں آئے اور چند منٹ ٹھہر کر چودھری مہاراج سنگھ مع اپنے ساتھی کمک کے روانہ ہلدور ہوئے اور چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ نے حفاظت آبادی

سوار ہو کر اور کچھ سوار اپنے ساتھ لے کر دیکھنے گیا اور اس نے اپنی آنکھ سے چودھریوں کو دیکھ کر نامحمود خاں سے آن کر کہا کہ چودھری چڑھ آئے۔ نامحمود خاں کا رنگ زرد ہو گیا اور ہوش جاتے رہے۔ اتنے میں چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ گھوڑوں پر سوار بجنور کے بازار میں آئے۔ میں اور سید تراب علی اس وقت تحصیل کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ میں نے چودھری جودھ سنگھ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نے باآوازِ بلند یہ بات کہی کہ نواب نے اپنے ہاتھوں نوابی پر خاک ڈال دی 'اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔[1]

نواب کی شکست اور نجیب آباد کو فرار

اسی وقت چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ نے شہر کی ناکہ بندی کر لی اور آدمی متعین کر دیئے کہ کوئی شخص شہر میں نہ آنے پائے اور شہر کو نہ لوٹنے۔ درحقیقت یہ بندوبست ایسی ہوشیاری سے کیا گیا تھا کہ اس دن شہر کا بچانا صرف ان دونوں چودھریوں کا کام تھا۔ شہر کے مسلمانوں نے بھی اس دن کوئی بات اعانت اور مدد نواب کی برخلاف چودھریوں کے نہیں کی۔ جبکہ یہ معاملہ پیش آیا تو نواب بھی لاچار جبراً و قہراً ہاتھی پر چڑھ کر اور جو سپاہ اس وقت قریب چار سو آدمی اور تیس چالیس سوار کے موجود تھی 'ان کو لے کر میدان میں آیا۔ بخارے کے باغوں پر دونوں کا مقابلہ ہوا۔ اول ایک باڑ بندوق کی طرفین سے چلی 'چار آدمی چودھریوں کی طرف سے زخمی ہوئے اور ایک مارا گیا۔ نواب کی طرف کا کوئی آدمی میں نے زخمی نہیں دیکھا اور نہ کسی کی لاش دیکھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِدھر کے آدمی بھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ اتنے میں نواب کی طرف سواروں نے متفرق ہو کر توپوں پر حملہ کرنا چاہا تھا کہ دفعتاً ایک فیر توپ کا اور ایک ایک فیر جزائیلوں کا چودھریوں کی طرف سے سر ہوا۔ نواب نے توپ کی آواز سنتے ہی ہاتھی پھیر دیا اور کوٹھی پر آن کر اپنے چھوٹے بیٹے کو ہاتھی پر بٹھا بھاگ نکلا۔ بڑا بیٹا اس کا غضنفر علی خاں ننگے پاؤں گھوڑے پر بیٹھ کر بھاگ گیا۔ سپاہ تمام اس کی اور سوار تتر بتر ہو گئے اور شکست فاش نواب کو نصیب ہوئی۔ نامحمود خاں اور سعد اللہ خاں مع بہت قلیل جماعت کے براہ منڈاور نجیب آباد پہنچا اور تھوڑی دیر پہلے اس سے احمد اللہ خاں جو شیر کوٹ سے بھاگا تھا نجیب آباد پہنچ چکا تھا۔ سب بھاگے ہوئے نجیب آباد میں جمع ہو کر اور آپس میں گلے لگ لگ کر خوب روئے۔[2]

لڑائی کے دوران ہماری ناقابلِ بیان حالت

جب کہ بجنور میں لڑائی ہوئی تو ڈپٹی کلکٹر صاحب ہلدور میں تھے اور ہماری کمیٹی کے تینوں ممبر یعنی میں اور سید تراب علی تحصیلدار بجنور اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر بجنور میں اپنے اپنے مکان بند کئے بیٹھے تھے اور جو صدمہ ہمارے دل پر تھا اس کا بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ ہمارے

خیال میں بھی نواب کی شکست ہونی نہیں آتی تھی اور خوب ہم کو یقین تھا کہ نواب ہم تینوں کی جان نہیں بخشنے کا کیونکہ سچا جرم طرف داری اور خیر خواہی سرکار اور خفیہ خط و کتابت کا' جو اس نے ہماری طرف لگا رکھا تھا' اس کے سوا یہ بڑا شبہ اس کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ چودھریوں کا لڑنا علی الخصوص چودھریان بجنور کا بمقابلہ پیش آنا یہ ہم لوگوں کے اغوا سے ہوا حالانکہ ہم اس اخیر الزام سے بالکل بری اور بے خبر تھے۔[1]

چودھریوں کے نام کی منادی

اس دن بجنور میں چودھری صاحبوں کے نام سے ان الفاظ سے منادی ہوئی کہ "خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ بجنور والوں اور ہلدور کے چودھری صاحبوں کا" ڈھم' ڈھم' ڈھم۔ ان الفاظ کے سننے سے خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ جب میں نے یہ منادی سنی تو کہا' سبحان اللہ! ہم تو کتابوں میں یہ بات پڑھتے آتے تھے کہ "دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند" یہاں یہ تماشا ہے کہ "پنج بادشاہ در یک ضلع میگنجند"' نہیں نہیں' ان کی تمثیل یوں کہنی چاہئے کہ "دہ درویش در یک گلیمی بخسپند[2]"۔

گنواروں کی لوٹ مار اور آتش زنی

اس فتح کے ہوتے ہی تینوں چودھری صاحب اس کوٹھی پر جس میں جناب صاحب کلکٹر بہادر رہتے تھے اور اب نا محمود خاں اس میں رہتا تھا' جا بیٹھے اور گنواروں نے' جن کا قابو میں رکھنا ناممکن تھا اور در حقیقت لوٹ کی توقع پر جمع ہوئے تھے' یورش کی اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر کے بنگلہ میں اور سواروں کے لئے جو نا محمود خاں نے پھونس کی بارکیں بنائی تھیں' ان میں آگ لگا دی اور لوٹنا شروع کیا...... پھر ان ہی بے قابو گنواروں نے کچہری کی کوٹھی پر حملہ کیا اور انگریزی دفتر کی کتابیں اور سروے کی نقشہ جات کی کتابیں اور جو اسباب لوٹنے کے قابل تھا' لوٹ لیا اور کلکٹری اور فوج داری کے دفتر میں چھپر ڈال کر آگ لگا دی۔[3]

ایک بجے کے قریب چودھری مہاراج سنگھ کا سوار مجھ کو اور سید تراب علی تحصیل دار کو کہ ہم دونوں تحصیل کے مکان میں دروازہ بند کئے بیٹھے تھے' بلانے آیا۔ ہم دونوں وہاں گئے اور دفتر کے کمروں میں سے آگ کے شعلے نکلتے ہوئے دیکھ کر ہمارا دل بھڑک اٹھا اور سرکاری افیم جو اس وقت لٹ رہی تھی' اس کو دیکھ کر ہماری جان تلخ ہو گئی۔ تھوڑی دیر ہم وہاں ٹھہر کر واپس آئے۔ چار بجے سب چودھری صاحب تحصیل میں آئے اور چند منٹ ٹھہر کر چودھری مہاراج سنگھ مع اپنے ساتھی کمک کے روانہ ہلدور ہوئے اور چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ نے حفاظت آبادی

بجنور اور انتظام وہاں کا اپنے قبضے میں رکھا۔[1]

نواح میں مسلمانوں کا قتل

شام کے قریب اکثر غول گنواروں کے اپنے اپنے گھر پھر گئے۔ جاتے وقت کسی غول نے کھاری کے جولاہوں کو، جو مسلمان تھے، لوٹ لیا اور کئی جولاہے مار ڈالے۔ سواہیڑی کے جاٹوں نے وہاں کے مسلمان بساطیوں کو، جو مال دار تھے، لوٹا اور مسجد سواہیڑی کو توڑ ڈالا۔ ساتویں اگست ۱۸۵۷ء کو چھتاور کے جاٹوں نے اصغر علی کو، جو معزز آدمی تھا اور اس سے اور جاٹوں سے عداوت چلی آتی تھی، مار ڈالا اور اس کی ٹانگ میں رسی باندھ کر گھسیٹا اور مسجد چھتاور توڑ ڈالی۔ خاص بجنور میں مردھوں کے محلے میں مسلمانوں اور گوجروں میں تکرار ہوئی اور ایک آدمی مارا گیا اور طرفین میں کے کچھ زخمی ہوئے..... چودھری نین سنگھ اور چودھری جودھ سنگھ بہت اس بات کے درپے تھے کہ ہندو و مسلمان کی تکرار نہ بڑھے اور مسلمانوں کی طمانیت اور ہندوؤں کو فہمائش کرتے تھے مگر کوئی آئینی فوج نہ تھی، جو چودھریوں کا حکم مانتی بلکہ وہ گنوار چودھریوں کی کیا حقیقت سمجھتے تھے۔[2]

مصنف کے فرار کے منصوبے

چودھریوں کی مزاحمت

جب کہ نواب کی شکست ہوئی ہم نے اپنی زندگی دوبارہ سمجھی اور یہ بات چاہی کہ گنگا پار میرٹھ چلے آئیں کیونکہ جو ظالم ہمارے سدِ راہ ہو رہا تھا اور ہم کو بجنور سے نہیں نکلنے دیتا تھا، نہ رہا تھا۔ مگر گھاٹ پر چودھری صاحبوں کا بندوبست تھا اور غدر راہ کا ایسا ہو گیا تھا کہ بدون اعانت اور مدد چودھری صاحبان کے ایک قدم راہ طے کرنی ممکن نہ تھی اس لئے ہم نے چودھریان بجنور سے چند روز تک نہایت عاجزی سے التجا کی مگر انہوں نے ہم کو نہ نکلنے دیا اور جو ہماری قسمت میں مصیبت تھی، ہم پر پڑی۔ میں کچھ برائی کا الزام اس بات میں چودھری صاحبوں کو اپنے نہ نکلنے دینے میں نہیں دیتا بلکہ ان کو یا یہ بے جا خیال دل میں رہا کہ یہ لوگ حکام انگریزی کے پاس جا کر اپنی سرخروئی اور اپنی خیر خواہی ہم سے زیادہ جتائیں گے یا یہ سمجھے کہ دفتر جلنے اور مال سرکاری لٹنے کا حال صاف کہہ دیں گے اور پھر کئی دن بعد ان کو یہ خیال ہوا کہ ان کے چلے جانے سے انتظام ضلع کا نہ ہو سکے گا اور رعایا کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ مگر ہم کو یہاں کے رہنے سے کمال رنج تھا کہ ہم نہایت بے بس اور بے کس تھے اور ہمیشہ ہم کو یقین تھا کہ اب نواب بجنور چھین لے گا اور ہم پکڑے اور مارے جائیں گے۔[3]

حکام انگریزی کو حالات سے آگاہی

جبکہ ہم کو بجنور سے چھوٹنے اور حکام کے پاس حاضر ہونے کی توقع جاتی رہی تو ہم تینوں آدمیوں

نے عرضیاں تمام حالاتِ جنگ اور شکست ہونے نواب کی بحضور جناب ولسن صاحب بہادر اور جناب صاحب کلکٹر بہادر اور اَور حکام انگریزی کے لکھیں اور سررشتہ کی روبکاری درباب جل جانے دفتر دیوانی کے روانہ کی اور جملہ چودھری صاحب پہلے سے بھی خط و کتابت حکام انگریزی سے رکھتے تھے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر کے خط کے آنے کے بعد زیادہ تر متوجہ تحریر حالات ہو گئے تھے اور ہماری کمیٹی کے ایک ممبر پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر بھی اس بات کی ہمیشہ تائید کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی کی حکمتِ جبلی اور شجاعتِ ذاتی کو' جو اچھے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب ان کو معلوم تھی' ہر ایک کو سمجھاتے رہتے تھے اور بعض آدمیوں کی زبان پر جو یہ بات آجاتی تھی کہ بسبب نمک حرام ہو جانے کُل فوج ہندوستانی کے سرکار کی عمل داری کو پائیداری ہونا بہت مشکل ہے' اس خیال کو شائستہ تقریر سے دور کرتے تھے اور خاص میرا قول اور دلی رائے' جس میں کبھی فرق نہیں آیا' یہ تھی کہ فتح و شکست کثرت و قلتِ تعداد آدمیوں پر موقوف نہیں ہے اور بڑی شجاعت بھی کام نہیں آتی بلکہ دانائی اور تدبیر اور قواعدِ جنگ اور ہتھیاروں کو علمی اور عملی قواعد سے کام لانے سے ہوتی ہے' پھر بہت بھیڑوں کا گھیلے اور داؤں گیرے ایک شیر کے سامنے بھی جمع ہونا کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ان باتوں پر لحاظ کر کے جملہ چودھری صاحبوں نے بھی اپنی اپنی عرضیاں متضمن ان وارداتوں اور اپنی اطاعت اور فرماں بردار ہونے سرکار کے بحضور حکام روانہ کیں اور فرمانِ بادشاہی' جو نامحمود خاں کے نام آیا اور بعد بھاگنے نامحمود خاں کے اس کے کاغذات میں سے پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے تلاش کر کے مع اور مفید اور بکار آمد کاغذوں کے نکالا تھا' اس فرمان کو چودھری جودھ سنگھ رئیس بجنور خود لے کر بحضور جناب ولسن صاحب بہادر اسپشل کمشنر اور صاحب جج مراد آباد روانہ میرٹھ ہوئے۔[1]

ہلدور پہنچنے کی حکمتِ عملی اور واپسی سے انکار

ہمارا اضطرار قیام بجنور سے بدستور تھا اور ہم سنتے تھے کہ نامحمود خاں اور علی الخصوص احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں درستیٔ سامانِ جنگ میں مصروف ہیں اور ان کی سپاہ بھی ان کے پاس جمع ہوتی جاتی ہے اور قریب چار ہزار آدمی ملازم کے وہاں جمع ہو گیا ہے اور ضرور ارادہ بجنور پر حملہ کرنے کا ہے بلکہ دو دفعہ خاص بجنور میں غلغلہ پڑ گیا کہ نواب چڑھ آیا اور عجیب حالت بجنور میں صرف اس غلغلہ سے ہو گئی اور چودھری جودھ سنگھ' جو کنوئیں میں سے روپیہ تلاش کرنے کو بیٹھے تھے' ایسے بے اوسان گھر پر پہنچے تھے کہ سب کی جان ہوا ہو گئی تھی اور چودھری نین سنگھ کے بھی ہوش جاتے رہے تھے۔ اس سبب سے ہم کسی طرح اپنی جان کو بچا ہوا نہیں سمجھتے تھے اور ہر وقت بجنور سے نکلنے کی تدبیر میں تھے مگر اپنے بس کی کوئی بات نہ تھی۔ لاچار ہم نے یہ تدبیر کی کہ کسی حکمت سے ہم ہلدور چلے جائیں۔ چودھری رندھیر سنگھ فہمیدہ آدمی ہیں ان سے کہیں کہ ہمارے روکنے سے بجز

اس کے کہ ہماری جان جائے اور کچھ فائدہ نہیں ہے ہمارے حال پر رحم کر کے ہم کو گنگا پار اتار دو۔ چنانچہ چودھری نین سنگھ صاحب بھی ہلدور جانے اور پھر واپس آنے کے اقرار پر راضی ہوئے۔ ہم نے بجنور سے نکلنا غنیمت سمجھا اور چودھری نین سنگھ صاحب نے چند آدمی اپنے معتمد ہمارے ساتھ کئے اس فہمائش سے کہ پھر ہم کو بجنور میں واپس لائیں اور میں اور سید تراب علی تحصیل دار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر بارہویں اگست ۱۸۵۷ء کو ہلدور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر بجنور کے واپس آنے سے انکار کیا۔ مگر پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر اس سبب سے کہ ان کے قبائل سب بجنور میں تھے' ان کو واپس آنا ضرور تھا۔ چنانچہ تیرہویں تاریخ کو وہ بجنور میں واپس آئے۔[1]

گنگا پار اترنے کا منصوبہ

جب ہم ہلدور پہنچے تو چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاج پور بھی وہاں تھے اور میر صادق علی رئیس چاندپور بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور درباب انتظام ضلع گفتگو مقصود تھی...... ان تمام گفتگوؤں میں جیسی اچھی رائے ہم نے چودھری پرتاپ سنگھ کی پائی اور ہر وقت جیسا ڈر حکام انگریزی کا ان کے دل میں ہم نے پایا اور کسی میں نہیں دیکھا۔ ہر دم اس کی زبان پر یہ بات تھی کہ فلاں کام کرتے تو ہو مگر یہ بھی خیال ہے کہ حکام انگریزی اس پر کیا کریں گے؟ غرض کہ ان معاملات کے بعد چودھری بدھ سنگھ سے ہم نے اپنا مطلب عرض کیا کہ ہم کو مدد دے کر پار اتروا دو۔ ہمارے اصرار پر انہوں نے اقرار کیا اور پچاس آدمی دینے تجویز کئے اور یہ بات ٹھہری کہ سید تراب علی تحصیل دار بجنور نگینہ میں جا کر باعانت رام دیال سنگھ...... اپنے قبائل کو ہلدور میں لے آئیں تاکہ ہم سب مل کر گنگا پار اتر جائیں۔[2]

انتظام ضلع ہمارے ہاتھ میں

منتظم ضلع کی تقرری کا سرکاری حکم نامہ

ہم نے ہلدور سے ایک اور عرضی جملہ رئیسوں کی طرف سے اور اپنی اور سید تراب علی اور ڈپٹی صاحب کی طرف سے کہ یہ سب ہلدور میں موجود تھے' جناب مسٹر ولسن صاحب بہادر پاس روانہ کی...... جب یہ عرضیاں چودھری صاحبوں کی اور ہماری میرٹھ میں بحضور حکام پہنچیں تو جملہ حکام کی رائے یہ قرار پائی کہ ایسی حالت میں تھوڑی سی فوج کا' مع حکام ضلع' ضلع میں بھیج دینا مناسب ہے اور کچھ تھوڑی سی فوج کی واسطے لے جانے ضلع کے تجویز بھی ہوئی اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر اس امر میں بہت ساعی ہوئے۔ چنانچہ جملہ حکام نے اس تجویز کو منظور کر کے

رپورٹ واسطے فراہمی فوج مجوزہ اور صدور حکم واجازت روانگی ضلع کے بحضور گورنمنٹ آگرہ روانہ کی اور منتظر صدور حکم رہے اور یہ تجویز کی کہ محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر اور سید احمد خاں صدر امین 'یعنی مصنف' تا تشریف آوری حکام انگریزی انتظام ضلع از جانب سرکار کریں ....
چودھری صاحبوں نے جو اپنی عرضیاں بھیجی تھیں ان کے جواب میں بھی یہی لکھا آیا کہ رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر اور سید احمد خاں صدر امین کو منتظم ضلع مقرر کیا گیا' تم لوگ ان کے ممد و معاون رہو اور اب حکام انگریزی مع فوج کے جلد اس ضلع میں آجائیں گے۔[۱]

سرکار کمپنی انگریز بہادر کے نام کی منادی

جب یہ حکم ہمارے نام پہنچا تو ہم نے اس کی اطاعت کرنی اپنی کمال عزت سمجھی اور میں اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر ہلدور سے بجنور میں آئے اور انتظام ضلع اپنے ہاتھ میں لیا اور اشتہارات عمل داری سرکار دولت مدار کے جاری کئے اور تمام ضلع میں سرکار کمپنی انگریز بہادر کے نام سے منادی پٹوائی۔[۲]

میری یہ رائے تھی کہ پرانے لفظ منادی کے یعنی "خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا' حکم کمپنی صاحب بہادر کا" بدلے جائیں اور بجائے "ملک بادشاہ" کے پکارا جائے کہ "ملک ملکہ معظمہ وکٹوریا شاہ لندن کا" کیونکہ منادی میں ایسے الفاظ چاہییں کہ جن سے عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھے کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے اور ہم کس کی رعیت ہیں لیکن بلا اجازت حکام صرف اپنی رائے سے اس دستورِ قدیم کو بدلنا مناسب نہ جانا اور اس باب میں ایک خاص رائے دینی دوسرے وقت پر موقوف رکھی۔[۳]

لوٹ مار کے سرکاری اسباب کی واپسی

بعد اس کے ہم نے بجنور میں ایک اور منادی پٹوائی کہ جس جس شخص نے اسباب سرکاری اور صاحبان انگریز کا اس ہنگامہ میں لوٹ لیا ہے وہ دے جائے یا کسی مقام پر خفیہ رکھ جائے۔ اگر ایسا نہ کرے گا یا اسباب کو ضائع اور تلف کرے گا تو مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ اس منادی پر بہت سی کتابیں دفتر کی اور جناب صاحب کلکٹر بہادر کے بنج کی اور کچھ اسباب شفاخانہ کا اور بہت سا کاغذ اسٹامپ اور چند کتابیں سرویری نقشہ جات کی اور رجسٹری دستاویزات اور قوانین کی دستیاب ہوئیں اور کچہری تحصیل میں جمع کی گئیں۔[۴]

سرکار کا خوف ہر دل پر

جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر نے ضلع کے حال پر کمال توجہ فرمائی اور خود میران پور میں مقیم ہوئے تاکہ روزمرہ کا حال صاحب کو معلوم ہوتا رہے اور ہر طرح ہماری تسلی اور تشفی رہے۔[۵]

سب کے دلوں پر سرکار کا خوف ہو گیا تھا اور ہم نے جو اشتہارات اور منادی سرکار کے نام سے تمام ضلع میں کی یہاں تک کہ خاص نجیب آباد میں بھی سرکار کے نام سے منادی ہوئی اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر دھرم پورہ تک تشریف لائے' سب کو یقین ہو گیا تھا کہ اب سرکاری فوج اور حکام جلد ضلع میں تشریف لائیں گے۔[1]

بایں ہمہ احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اپنی بدبختی اور فساد انگیزی سے باز نہیں آتے تھے اور ہندوؤں کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے اور دیہات قرب و جوار نجیب آباد کے لوٹنے اور پھونکنے میں مشغول تھے۔[2]

ہندو مسلم فسادات اور محمدی جھنڈا

رام دیال سنگھ کا نگینہ پر حملہ

بشنوئیان نگینہ جو قدیمی مفسد اور شورہ پشت ہیں' زیادہ تر مفسدہ کے باعث ہو گئے اور نگینہ میں فساد کروا دیا۔[3]

نگینہ والوں سے یہ بات کہی کہ رام دیال سنگھ نگینہ پر چڑھا آتا ہے اور رام دیال سنگھ سے کہا کہ نگینہ والے پورینی پر چڑھے آتے ہیں' چنانچہ رام دیال سنگھ نے پورینی سے جانب نگینہ قدم بڑھایا۔ ادھر سے مینڈھو خاں کچھ جمعیت نگینہ میں جمع کر کے نگینہ کے باہر نکلا۔ اکیسویں تاریخ ۱۸۵۷ء روز جمعہ کو قریب بدری والا باغ کے مقابلہ ہوا۔ طرفین سے کچھ آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے اور مینڈھو خاں کی شکست ہوئی۔ نگینہ والے بھاگ کر آبادی میں گھس آئے۔ ان کے پیچھے رام دیال سنگھ شہر میں گھس پڑا اور نتھو خاں کا گھر جلا دیا اور لوٹ لیا اور شیخ کی سرائے کو بھی لوٹا اور جلا دیا۔ اس وقت پھر مسلمان نگینہ سانونٹے ہوئے اور طرفین میں خوب تلوار و بندوق چلی اور طرفین کے آدمی مارے گئے۔ رام دیال سنگھ بشنوئی سرائے میں چلا گیا۔ شام کے وقت لڑائی تھم گئی۔[4]

مسلمانوں کو امان کا وعدہ

رات کے وقت رام دیال سنگھ نے مولوی محمد علی پاس پیغام بھیجا کہ جو کچھ ہوا سو ہوا' اب امن و امان رہے گا اور ہم قلعہ تحصیل میں آ کر بیٹھیں گے۔ کوئی فساد نہ کرے اور سب مسلمان اپنے گھروں میں چھپ جائیں اور سامنے نہ آئیں۔ چنانچہ مولوی محمد علی اور اشرف علی ولد امیر علی نے بہت سعی اور کوشش سے سب مسلمانوں کو فہمائش کی اور سب راضی ہو گئے اور اپنے اپنے گھروں میں چھپ بیٹھے۔ بائیسویں اگست ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت رام دیال سنگھ کے

حکم سے امن وامان کی منادی شہر میں ہوئی اور رام دیال سنگھ مع اپنی جمعیت کے قلعہ تحصیل میں چلے آئے اور کوئی مسلمان اپنے گھر سے نہیں نکلا۔[1]

امان کے باوجود مسلمانوں کا قتل عام

جس قدر گنوار اور بنجارہ رام دیال سنگھ کے ساتھ صرف لوٹ کے لالچ سے جمع ہوئے تھے انہوں نے اس امر کو' جو واقع ہوا' اپنے اصلی مطلب کے برخلاف دیکھا اور بدمعاش بشنوئیوں نے ان کو زیادہ اشتعالک دی اور ان سب نے نگینہ کے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ میڈھمل فوطہ دار تحصیل نگینہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے اپنے کان سے سنا کہ رام دیال سنگھ ہر ایک شخص کو منع کرتا تھا مگر وہ نہ مانتے تھے۔ آخر کار ان بدمعاشوں نے قلعہ تحصیل میں سے جزائلیں فیر کرنی شروع کیں اور کچھ لٹیرے بھٹیاری سرا میں گھس گئے اور سرائے کو جلا دیا۔ اور بازار کی دکانیں لوٹ لیں اور امام الدین زمیندار کے مکان پر جزائلیں لگادیں اور دروازہ جلا دیا اور مکان لوٹ لیا اور جہاں ان کو قابو ملا لوٹ اور قتلِ عام شروع کر دیا اور بدمعاش بشنوئی بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ پچاس ساٹھ آدمی مسلمان مارے گئے۔[2]

جوابی حملہ میں رام دیال سنگھ کی شکست

اس وقت مسلمانانِ نگینہ بھی اپنے اپنے گھروں میں سے ہتھیار لے کر نکل پڑے اور مارنا شروع کیا اور خوب لڑائی ہوئی اور دو سو ڈیڑھ سو آدمی ہندو' جو لوٹ میں مشغول تھے' مارے گئے۔ پھر مسلمان قلعہ تحصیل میں گھس گئے۔ وہاں سے رام دیال سنگھ بھاگ کر بشنوئی سرائے میں جا چھپا۔ سب گنواروں نے مل کر مولوی محمد علی کے مکان پر' جو مال دار مشہور تھے' اور جس میں میر تراب علی تحصیل دار بھی تھے' حملہ کیا اور جزائیل لگادی اور دروازہ پر کوڑا جمع کر کے دروازہ جلانا چاہا اور حکیم امام علی' ماموں مولوی محمد علی' کو قتل کر دیا۔ اس وقت مولوی محمد علی کے مکان پر سے بندوقیں چلنی شروع ہوئیں اور جو لوگ کہ تحصیل میں گئے تھے وہ بھی پھر کر وہاں آئے۔ تب سب گنوار وہاں سے بھاگ نکلے اور رام دیال سنگھ نے شکست پائی اور اس لڑائی میں گنواروں کی ہمت اور جرات ٹوٹ گئی۔[3]

نجیب آباد میں محمدی جھنڈے تلے جمعیت کثیر

مسلمانوں نے دیکھا کہ بدستور ہندو مالک اور حاکم ہیں اور ہندو جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مارتے ہیں جیسا کہ نگینہ میں پیش آیا۔[4]

یہ سب خبریں متواتر نجیب آباد میں پہنچیں اور جس وقت کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل کیا

تھا اس وقت کچھ آدمی غل مچاتے ہوئے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مار ڈالا اور جورو بیٹی کی بے عزتی کی، نجیب آباد چلے گئے تھے۔ نواب کو بہت اچھا حیلہ جمعیت جمع کرنے کا ہاتھ لگا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ دیکھا' ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ اب سب مسلمانوں کو جمع ہو کر ہندوؤں کو مارنا چاہئے۔ یہ کہہ کر احمد اللہ خاں نے بائیسویں اگست ۱۸۵۷ء مطابق یکم محرم ۷۴ ۱۲ھ نجیب آباد کے باہر جلال آباد کے قریب توپ نکالی اور فوج بھیجی اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا اور جمعیت کثیر جمع کرنے کے درپے ہوا اور بہت سے مسلمان مذہبی لڑائی کے ارادہ سے واسطے مقابلہ اور قتل ہنود کے جمع ہوئے۔[1]

دفعتاً ضلع میں فساد برپا ہو گیا اور مذہبی لڑائی قائم ہو گئی۔[2]

چودھری بدھ سنگھ کی شجاعت اور جواں مردی!

بجنور میں جو رئیس جمع تھے وہ آپس میں صلاح کر رہے تھے کہ اب نجیب آباد پر چڑھائی کی جائے یا نہیں۔ چودھری پرتاپ سنگھ تاجپوری کی یہ رائے تھی کہ فساد زیادہ بڑھانا اچھا نہیں' معلوم نہیں کہ انجام کیا ہو گا۔ جس طرح ہو سکے یہ صلح و آشتی چند روز ضلع تھامنا چاہئے بلکہ چودھری پرتاپ سنگھ کے نزدیک نگینہ پر بھی جو آدمی گئے اور وہاں بنیاد فساد پڑ گئی' نامناسب ہوا۔ چودھری بدھ سنگھ صاحب رئیس ہلدور' بسبب اپنی شجاعت و جواں مردی کے یہ رائے دیتے تھے کہ نجیب آباد پر یورش کی جائے اور سب آدمیوں کو لے کر نجیب آباد پر چڑھ چلیں اور دو جگہ جو ان چودھری صاحب نے نواب کو شکست دی تھی اس سبب سے ان کا ارادہ اور ہمت اور جرأت اور دلیری بہت بڑھی ہوئی تھی۔[3]

نگینہ پر دوبارہ یورش میں مسلمان عورتوں کی ناقابلِ بیان بے عزتی

بجنور میں خبر پہنچی کہ رام دیال سنگھ کی نگینہ میں شکست ہوئی۔ بمجرد اس خبر کے چودھری بدھ سنگھ رئیس ہلدور مع اپنی جمعیت اور چودھری پرتاپ سنگھ کی جمعیت کے اور توپ اور جزائیل کے' جو بجنور میں موجود تھی' روانہ نگینہ ہوئے اور شام کے قریب نگینہ میں پہنچے اور نگینہ میں مشہور ہوا کہ چودھری بدھ سنگھ ہزاروں آدمی اور توپ لے کر نگینہ پر چڑھ آئے۔ اس وقت رات میں مسلمانانِ نگینہ نے بھاگنا چاہا اور پیادہ پا عورتوں اور بچوں کو لے کر چلے اور راستے میں لٹے اور عورتیں زخمی ہوئیں۔ اچھے اچھے اشرافوں کی بڑی بے عزتی ہوئی اور بشنوئی ان سب خرابیوں کے' جو مسلمانوں پر اور عورتوں پر ہوئیں' سرغنہ اور سرغنہ اور باعث تھے۔ سید تراب علی تحصیل دار ہم سے کہتے تھے کہ اس وقت جو مصیبت ان کے اور مولوی محمد علی اور بھلے مانس مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر گزری تھی اور جو جو بے عزتیاں بھلے مانسوں کی ہوئی ہیں' کہنے کے لائق نہیں ہیں۔[4]

دشمنوں (مسلمانوں) کے ہاتھوں سواہیڑی کی تباہی

تیئیسویں اگست ۱۸۵۷ء کو نگینہ میں تو یہ معاملہ ہو رہا تھا اور نجیب آباد میں سب سپاہی اور سوار ملازم نواب کے جمع ہو گئے تھے اور جس قدر مسلمانوں اور جولاہوں اور سواہیڑی کے بساطیوں وغیرہ نے جو ہندوؤں کے ہاتھ سے تکلیفیں پائی تھیں، وہ سب ادر اور بہت لوگ مسلمان جلال آباد کے قریب محمدی جھنڈے میں جا شامل ہوئے تھے اور احمد اللہ خاں کے پاس ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی تھی اور اسی کے ساتھ خبر شکست رام دیال سنگھ کی نگینہ میں نجیب آباد پہنچی تھی، احمد اللہ خاں نے ایسے وقت کو غنیمت سمجھ کر یورش کی اور سواہیڑی کو آمارا...... احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماڑے نے سواہیڑی کو گھیرا تو بہت خفیف مقابلہ ہوا، گنوار سب بھاگ نکلے اور جرائکیں ان کی چھن گئیں اور اور سواہیڑی کو دشمنوں نے پھونک دیا اور جلا دیا۔[1]

بجنور میں نواب کا خوف اور مصنف کی مرنے کو تیاری

بجنور میں متواتر خبریں آنے لگیں کہ اب نواب بجنور کو آمارتا ہے بلکہ دو تین کوس تک نواب کے آدمی بجنور کی جانب بڑھ آئے تھے۔ یہاں بجنور میں کچھ جمعیت نہ تھی۔ صرف چودھری رندھیر سنگھ مع ایک ضرب توپ اور پچاس ساٹھ آدمی کے سواہیڑی کی سڑک پر مورچہ لگائے موجود تھے اور چودھری جودھ سنگھ اور چودھری نین سنگھ بھی وہاں تھے اور ہرچند واسطے جمع ہونے آدمیوں کے تدبیر کرتے تھے مگر ایک آدمی بھی جمع نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ بجنور میں سب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ چودھری جودھ سنگھ عین مورچوں میں سے گھوڑا بھگا واسطے تدبیر نکال لے جانے اپنے اہل و عیال کے اپنے گھر پر پہنچے اور چودھری نین سنگھ نے بھی اپنے معتمد اپنے دولت خانہ پر بھیج دیئے کہ ضرورت کی سب چیزیں مہیا رہیں اور چودھری رندھیر سنگھ صاحب نے بھی روانگی ہلدور کا قصد کیا بلکہ توپ ادھر کو روانہ بھی کی۔ مجھ صدر امین اور ڈپٹی صاحب نے مکان تحصیل کو بند کر کے اور پانچ سات آدمی جو ہمارے ساتھ تھے ان کو لے کر اور ہتھیار بندوق سے آراستہ ہو کر اس دھیان میں ہو بیٹھے کہ اب احمد اللہ خاں بجنور میں آتا ہے جہاں تک ممکن ہو گا ہم اس سے لڑیں گے، آخر کار مارے جائیں گے اور جس قدر خطوط اور کاغذات از طرف حکام انگریزی درباب انتظامِ ضلع ہمارے پاس آئے تھے اور جتنی رپورٹیں کہ ہم نے یہاں سے روانہ کی تھیں اور ان کی نقلیں ہمارے پاس موجود تھیں ان سب کو ہم نے بنظرِ دور اندیشی جلا دیا۔ تمام شہر بجنور میں بھگی پڑ گئی۔ بہت سے آدمی گنگا کے کنارے اور دو گنگ میں جا بیٹھے اور ایک تلاطم عظیم بجنور میں برپا ہو گیا۔ اس عرصہ میں مسلمانانِ بجنور جمع ہو کر چودھری رندھیر سنگھ پاس گئے اور کہا کہ "اگر تم چلے جاؤ گے تو قصبہ لٹ جائے گا۔ تم بدستور مورچہ پر چلو اور ہم سب تمہارے ساتھ

تھا اس وقت کچھ آدمی غل مچاتے ہوئے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو مار ڈالا اور جورو بیٹی کی بے عزتی کی، نجیب آباد چلے گئے تھے۔ نواب کو بہت اچھا حیلہ جمعیت جمع کرنے کا ہاتھ لگا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ دیکھا، ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا کیا؟ اب سب مسلمانوں کو جمع ہو کر ہندوؤں کو مارنا چاہئے۔ یہ کہہ کر احمد اللہ خاں نے بائیسویں اگست ۱۸۵۷ء مطابق یکم محرم ۷۴ ۱۲ھ نجیب آباد کے باہر جلال آباد کے قریب توپ نکالی اور فوج بھیجی اور محمدی جھنڈا کھڑا کیا اور جمعیت کثیر جمع کرنے کے درپے ہوا اور بہت سے مسلمان مذہبی لڑائی کے ارادہ سے واسطے مقابلہ اور قتل ہنود کے جمع ہوئے۔[۱]

دفعتاً ضلع میں فساد برپا ہو گیا اور مذہبی لڑائی قائم ہو گئی۔[۱]

چودھری بدھ سنگھ کی شجاعت اور جواں مردی !

بجنور میں جو رئیس جمع تھے وہ آپس میں صلاح کر رہے تھے کہ اب نجیب آباد پر چڑھائی کی جائے یا نہیں۔ چودھری پرتاپ سنگھ تاج پور کی یہ رائے تھی کہ فساد زیادہ بڑھانا اچھا نہیں، معلوم نہیں کہ انجام کیا ہو گا۔ جس طرح ہو سکے بہ صلح و آشتی چند روز ضلع تھامنا چاہئے بلکہ چودھری پرتاپ سنگھ کے نزدیک نگینہ پر بھی جو آدمی گئے اور وہاں بنیاد فساد پڑ گئی، نامناسب ہوا۔ چودھری بدھ سنگھ صاحب رئیس ہلدور، بسبب اپنی شجاعت و جواں مردی کے یہ رائے دیتے تھے کہ نجیب آباد پر یورش کی جائے اور سب آدمیوں کو لے کر نجیب آباد پر چڑھ چلیں اور دو جگہ جو ان چودھری صاحب نے نواب کو شکست دی تھی اس سبب سے ان کا ارادہ اور ہمت اور جرأت اور دلیری بہت بڑھی ہوئی تھی۔[۱]

نگینہ پر دوبارہ یورش میں مسلمان عورتوں کی ناقابل بیان بے عزتی

بجنور میں خبر پہنچی کہ رام دیال سنگھ کی نگینہ میں شکست ہوئی۔ بمجرد اس خبر کے چودھری بدھ سنگھ رئیس ہلدور مع اپنی جمعیت اور چودھری پرتاپ سنگھ کی جمعیت کے اور توپ اور جزائیل کے، جو بجنور میں موجود تھی، روانہ نگینہ ہوئے اور شام کے قریب نگینہ میں پہنچے اور نگینہ میں مشہور ہوا کہ چودھری بدھ سنگھ ہزاروں آدمی اور توپ لے کر نگینہ پر چڑھ آئے۔ اس وقت رات میں مسلمانان نگینہ نے بھاگنا چاہا اور پیادہ پا عورتوں اور بچوں کو لے کر چلے اور راستے میں لٹے اور عورتیں زخمی ہوئیں۔ اچھے اچھے اشرافوں کی بڑی بے عزتی ہوئی اور بشنوئی ان سب خرابیوں کے، جو مسلمانوں پر اور عورتوں پر ہوئیں، سرغنہ اور سرغنہ اور باعث تھے۔ سید تراب علی تحصیل دار ہم سے کہتے تھے کہ اس وقت جو مصیبت ان کے اور مولوی محمد علی اور بھلے مانس مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر گزری تھی اور جو جو بے عزتیاں بھلے مانسوں کی ہوئی ہیں، کہنے کے لائق نہیں ہیں۔[۱]

دشمنوں (مسلمانوں) کے ہاتھوں سواہیڑی کی تباہی

تیئسویں اگست ۱۸۵۷ء کو نگینہ میں تو یہ معاملہ ہو رہا تھا اور نجیب آباد میں سب سپاہی اور سوار ملازم نواب کے جمع ہو گئے تھے اور جس قدر مسلمانوں اور جولاہوں اور سواہیڑی کے بساطیوں وغیرہ نے جو ہندوؤں کے ہاتھ سے تکلیفیں پائی تھیں' وہ سب اور اور بہت لوگ مسلمان جلال آباد کے قریب محمدی جھنڈے میں جا شامل ہوئے تھے اور احمد اللہ خاں کے پاس ایک جمعیت کثیر جمع ہو گئی تھی اور اسی کے ساتھ خبر شکست رام دیال سنگھ کی نگینہ میں نجیب آباد پہنچی تھی' احمد اللہ خاں نے ایسے وقت کو غنیمت سمجھ کر یورش کی اور سواہیڑی کو آ مارا...... احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماڑے نے سواہیڑی کو گھیرا تو بہت خفیف مقابلہ ہوا' گنوار سب بھاگ نکلے اور جرانگیں ان کی چھن گئیں اور اور سواہیڑی کو دشمنوں نے پھونک دیا اور جلا دیا۔[1]

بجنور میں نواب کا خوف اور مصنف کی مرنے کو تیاری

بجنور میں متواتر خبریں آنے لگیں کہ اب نواب بجنور کو آ مارتا ہے بلکہ دو تین کوس تک نواب کے آدمی بجنور کی جانب بڑھ آئے تھے۔ یہاں بجنور میں کچھ جمعیت نہ تھی۔ صرف چودھری رندھیر سنگھ مع ایک ضرب توپ اور پچاس ساٹھ آدمی کے سواہیڑی کی سڑک پر مورچہ لگائے موجود تھے اور چودھری جودھ سنگھ اور چودھری نین سنگھ بھی وہاں تھے اور ہر چند واسطے جمع ہونے آدمیوں کے تدبیر کرتے تھے مگر ایک آدمی بھی جمع نہ ہوتا تھا' یہاں تک کہ بجنور میں سب کے پاؤں اکھڑ گئے۔ چودھری جودھ سنگھ مین مورچوں میں سے گھوڑا بھگا واسطے تدبیر نکال لے جانے اپنے اہل و عیال کے اپنے گھر پر پہنچے اور چودھری نین سنگھ نے بھی اپنے معتمد اپنے دولت خانہ پر بھیج دیئے کہ ضرورت کی سب چیزیں مہیا رہیں اور چودھری رندھیر سنگھ صاحب نے بھی روانگی ہلدور کا قصد کیا بلکہ توپ ادھر کو روانہ بھی کی۔ مجھ صدر امین اور ڈپٹی صاحب نے مکان تحصیل کو بند کر کے اور پانچ سات آدمی جو ہمارے ساتھ تھے ان کو لے کر اور ہتھیار بندوق سے آراستہ ہو کر اس دھیان میں ہو بیٹھے کہ اب احمد اللہ خاں بجنور میں آتا ہے جہاں تک ممکن ہو گا ہم اس سے لڑیں گے، آخر کار مارے جائیں گے اور جس قدر خطوط اور کاغذات از طرف حکام انگریزی در باب انتظامِ ضلع ہمارے پاس آئے تھے اور جتنی رپورٹیں کہ ہم نے یہاں سے روانہ کی تھیں اور ان کی نقلیں ہمارے پاس موجود تھیں ان سب کو ہم نے بنظرِ دور اندیشی جلا دیا۔ تمام شہر بجنور میں بھگی پڑ گئی۔ بہت سے آدمی گنگا کے کنارے اور دو گنگ میں جا بیٹھے اور ایک تلاطم عظیم بجنور میں برپا ہو گیا۔ اس عرصہ میں مسلمانانِ بجنور جمع ہو کر چودھری رندھیر سنگھ پاس گئے اور کہا کہ "اگر تم چلے جاؤ گے تو قصبہ لٹ جائے گا۔ تم بدستور مورچہ پر چلو اور ہم سب تمہارے ساتھ

ہیں"۔ چودھری رندھیر سنگھ نے اس بات کو قبول کیا اور مورچہ پر آئے اور توپ بھی پھیر لائے۔ چودھری جودھ سنگھ بھی وہاں آگئے اور تینوں چودھری مع مسلمانان بجنور اور جس قدر آدمی چودھریوں کے ساتھ تھے شام تک مورچہ پر موجود رہے مگر احمد اللہ خاں اس روز بجنور میں نہ آیا۔①

چودھری اور ہم ہلدور کو فرار

رات کے وقت چودھری رندھیر سنگھ نے ہم سے کہا کہ میرا ارادہ یہاں کے قیام کا نہیں ہے اور چودھریان بجنور بھی جانے والے ہیں۔ تمہارا رہنا یہاں مناسب نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم بھی آج ہی رات کو ہلدور چلے جاؤ۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب اور میں صدر امین اخیر رات کو بجنور سے روانہ ہوئے اور صبح ہوتے چوبیسویں اگست ۱۸۵۷ء کو ہلدور میں پہنچے۔ ہم سے تھوڑی دیر پہلے چودھری بدھ سنگھ نگینہ سے ہلدور آچکے تھے، وہاں ہماری اور ان کی ملاقات ہوئی...... علی الصبح ۲۴ اگست ۱۸۵۷ء کو چودھری بدھ سنگھ مع قدرے جمعیت کے ہلدور سے روانہ بجنور ہوئے تاکہ چودھری رندھیر سنگھ کو ہلدور لے آئیں...چھبیسویں اگست کو.....چودھری رندھیر سنگھ اور چودھری بدھ سنگھ مع اپنی جمعیت ہمراہی اور ضرب ہائے توپ کے بجنور سے ہلدور میں پہنچے۔②

احمد اللہ خاں کی نگینے میں بدلے کی کارروائی

ادھر احمد اللہ خاں کو نگینہ کے خالی ہونے کی خبر ملی اور سب مسلمانوں نے، جو کہ اس کے ساتھ تھے، یہ بات چاہی کہ اول بشنوئیان نگینہ سے بدلہ لیا جائے جنہوں نے رام دیال سنگھ کے وقت میں مسلمانوں پر اور ان کے ننگ و ناموس پر زیادتی کی ہے اور جس فساد کے سبب سب لوگ محمدی جھنڈے میں جمع ہو گئے تھے، اس لئے احمد اللہ خاں نے نگینہ کا جانا مقدم سمجھا اور قصد بجنور کو ملتوی کر کے جانب نگینہ مع فوج کے روانہ ہوا۔ دو بجے وہاں جا پہنچا اور بشنوئی سرا کے غارت کا ارادہ کیا۔ شیخ نجف علی رئیس نگینہ نے احمد اللہ خاں کو اس بات سے منع کیا۔ مینڈھو خاں پسر تھو خاں نے شیخ نجف علی کو گالی دی اور بندوق مارنے کو اٹھائی مگر اور لوگ درمیان میں آگئے۔ اتنے میں خبر آئی کہ بشنوئی سرا میں بشنوئیوں نے ایک سوار اور دو پیادوں کو مار ڈالا۔ اس خبر پر بشنوئی سرا پر توپ لگادی اور گولہ مارنے شروع کئے۔ تمام بشنوئی مع زن و بچہ بھاگ نکلے۔ پانچ چھ آدمی مارے بھی گئے اور بشنوئی سرائے دو دن تک خاطر خواہ لٹی اور تمام گھر اور کچے پکے مکانات بشنوئیوں کے سب پھونک دیئے۔ ایک گھر بھی جلنے سے باقی نہیں رہا۔③

سید تراب علی کے قتل کا حکم اور جاں بخشی

اس کے بعد احمد اللہ خاں نے سید تراب علی تحصیل دار کے گرفتار کرنے اور قتل کرنے کا

حکم دیا اور ان کی تلاش کو آدمی دوڑے مگر مولوی محمد علی رئیس نگینہ نے ان کو چھپالیا اور میر اشرف علی اور مولوی محمد علی خود احمد اللہ خاں پاس گئے اور سید تراب علی کو غریب پردیسی سید کہہ کر اور طرح طرح کی خوشامدیں کر کے ان کی جان بخشی چاہی' چونکہ احمد اللہ خاں وغیرہ سب پٹھان تھے اور سید کا قتل کرنا یہ لوگ برا سمجھتے ہیں اس لئے سید تراب علی کی جاں بخشی کی مگر مولوی محمد علی سے حاضر ضامنی لکھوالی اور دروازہ مکان پر پہرہ جات بجہت نگہبانی تعینات کئے۔ پچیسویں تک احمد اللہ خاں کا مع تمام لشکر اور ہمراہیوں کے نگینہ میں مقام رہا۔[1]

نوابی لشکر کی ہلدور پر چڑھائی

چھبیسویں اگست کو ماڑے اور شفیع اللہ خاں اور احمد اللہ خاں نے بارادہ چڑھائی ہلدور کے نگینہ سے جانب نہٹور کوچ کیا...... علی الصبح ستائیسویں تاریخ روز پنجشنبہ کو چودھری رندھیر سنگھ اور چودھری بدھ سنگھ اپنی تمام سپاہ کو ساتھ لے کر نقارہ بجاتے اور نشان اڑاتے مع دو ضرب توپ اور چند جزائیل کے بہت بڑی شان و شوکت سے واسطے مقابلہ کے روانہ ہوئے اور نہٹور سے احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماڑے مع اپنے لشکر کے ہلدور پر چڑھے...... بان ندی پر طرفین کا مقابلہ ہوا۔ دو توپیں چودھری صاحبوں کی طرف سے چھوٹیں۔ نواب کے سواروں نے حملہ کیا اور گنوار' جو غول کے غول چودھری صاحب کی طرف جمع تھے' بھاگے اور لڑائی شکست ہوئی۔ چودھری صاحب بھی پسپا ہوئے اور دونوں توپوں کو لے کر ہلدور آ داخل ہوئے۔[2]

چودھری پرتاب سنگھ کے کارندے کی دلاورانہ ہلاکت

ہلدور کے چاروں طرف پہلے سے خندق کھدی ہوئی تھی اور دمدمہ بنا ہوا تھا اور چاروں طرف ناکہ بندی ہو رہی تھی اور مورچے لگے ہوئے تھے جب چودھری صاحب اور ان کا تمام لشکر' جو ساتھ بھاگا آتا تھا' ناکہ ہلدور میں داخل ہو گیا تب چودھری صاحب پھر رکے اور توپوں کو مورچوں پر لگا کر اور دمدمہ کی آڑ میں کھڑے ہو کر باڑیں مارنی شروع کیں۔ سرکاری رجمنٹوں کے چند سواروں نے' جو نواب کی فوج میں تھے' مع اپنے ہمراہیوں کے جن کو انہوں نے منتخب کر لیا تھا مورچہ پر حملہ کیا اور باوصف تنگی اور قلب ہونے ناکہ کے ناکے کے اندر گھس گئے اور پچاس ساٹھ آدمی چودھری صاحبوں کے مارے گئے۔ گوبند سنگھ' کارندہ کل چودھری پرتاپ سنگھ کا اسی ناکہ پر بہت دلاوری سے مارا گیا۔ اس وقت چودھری صاحبوں نے قیام اپنا ناکہ مورچہ پر بھی مناسب نہ جانا' اپنی تینوں توپوں کو ناکہ مورچال پر سے لے حویلی کو روانہ ہوئے تو ان سواروں نے تعاقب کیا۔ چودھری صاحبان تو حویلی میں بخریت آ پہنچے مگر ان کی دو توپیں' جو بہت عمدہ سرکاری میگزین کی تھیں...... چھین لیں اور ناکہ کے باہر لے گئے۔[3]

ہمارا مکان نواب کے ناتجربہ کار گولہ اندازوں کی زد میں

حویلی کے دروازہ بند ہو گئے اور ہر ایک شخص اس کے منتظر رہا کہ کب نواب آئے اور جو حویلی میں محصور ہیں کب ان کو مارے۔ اس عرصہ میں گولہ اندازانِ نواب نے ایک توپ جانب شرق اس مکان کے مقابل، جس میں میں اور ڈپٹی صاحب مقیم تھے، آلگائی اور گولہ مارنے شروع کئے۔ باوجودیکہ بہت بڑا مکان نشانہ پر تھا مگر وہ گولہ انداز ایسے کامل اور استاد اپنے فن کے تھے کہ ایک گولہ بھی اس مکان پر نہ لگا[1]

ہندوؤں کے مکانوں میں آتش زنی

جس قدر سوار نواب کے کنارہ شہر سے ناکہ کے اندر گھس آئے تھے وہ سب دونوں توپیں لے کر ناکہ کے باہر چلے گئے اور صفیں آراستہ کئے ہوئے دمدمہ اور خندق ہلدور کے باہر کھڑے رہے۔ یقینی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی آدمی بھی سپاہ نواب کا شہر میں نہیں رہا مگر دفعتاً ہلدور کے مکانات میں آگ لگنی شروع ہوئی۔ بلاشبہ چھیپی اور حلوائیان ساکنانِ ہلدور نے، جو مسلمان ہیں، ہندوؤں کے مکانات میں آگ لگائی کیونکہ ان سے اور چودھریان ہلدور سے درباب خانہ کرایہ اور تعمیرِ مسجد اور دیگر امور کے قدیمی عداوت چلی آتی تھی۔ یہاں تک کہ تمام مکانات ہندوؤں کے جلنے شروع ہو گئے اور دس بارہ آدمی قوم ہنود مارے بھی گئے[2]

نوابی لشکر کا ہلدور کی بجائے بجنور میں داخلہ

ہلدور کے چاروں کونوں میں اس قدر آگ روشن ہوئی کہ راستہ آمدورفت کوچوں کا بند ہو گیا اور نواب کی فوج، جو باہر کھڑی تھی، اس کو بھی قابو ہلدور کے اندر گھسنے کا نہ ملا۔ بہت دیر تک وہ فوج آراستہ کھڑی رہی۔ جب یہ جانا کہ آگ ایسی بھڑک گئی ہے کہ کئی دن تک نہ بجھے گی تب چار بجے کے بعد احمد اللہ خاں مع اپنے تمام لشکر کے بارادہ قیام جھالو روانہ ہوا۔ راستہ میں موضع پھڑپاپور کو پھونک دیا۔ اس عرصہ میں اس کو خبر پہنچی کہ بجنور بالکل خالی ہے۔ اس نے بجنور کے قیام کا ارادہ کیا اور کچھ سوار اور پیدل لے کر تخمیناً ڈھائی تین ہزار آدمی کی جمعیت سے گیارہ بجے رات کے بجنور میں آداخل ہوا[3]

چودھریان بجنور گنگا پار

جس وقت کہ ہلدور پر لڑائی ہو رہی تھی تو چودھری جودھ سنگھ صاحب بھی دو تین کوس کے فاصلے سے لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ ہلدور کی شکست ہو گئی اور ساری ہلدور جل گئی وہ پھر کر بجنور میں آئے اور یہ سب حال چودھری نین سنگھ صاحب سے کہا اور دونوں

چودھری صاحب مع اپنے رشتہ مندوں کے بجنور سے چل دیئے اور کشتیوں پر بیٹھ کر گنگا پار ہوئے۔ احمد اللہ خاں نے بجنور پہنچ کر ہر چند تلاش کیا مگر پتہ نہ لگا...... جب خبر شکست ہلدور اور مارے جانے گوبند سنگھ اپنے کارندہ کی چودھری پرتاپ سنگھ کو پہنچی وہ بھی گھبرائے اور جانا کہ کل یہی دن میرے لئے ہے' اسی وقت چودھری پرتاپ سنگھ تاج پور سے کانٹ کو چلے گئے۔(1)

ہلدور میں گنواروں کا پھر اجتماع

ہلدور سے احمد اللہ خاں کے چلے جانے کی بڑی خوشی ہوئی اور سب کی جان میں جان آئی اور خدا خدا کر کے شام کی اور جوں توں کر کے رات بسر کی۔ رات کے وقت جو آدمی چودھری صاحبوں کے بھاگ گئے تھے وہ بھی آ گئے اور ایک غول بھینہ والوں کا بھی آ گیا اور قریب تین ہزار آدمی کی جمعیت پھر ہلدور میں جمع ہو گئی۔(2)

حرام زادہ مسلمان حلوائی چھیپی فرار' باقیوں کا قتل عام

اٹھائیسویں اگست ۱۸۵۷ء کو بروز جمعہ مطابق ساتویں محرم ۱۲۷۴ھ کے قبل طلوع آفتاب چودھری صاحبوں نے تمام راستہ ہلدور کے گھیر لئے اور جس قدر مسلمان حلوائی اور چھیپی اور کمہار وغیرہ ہلدور میں دستیاب ہوئے' سب کو برابر قتل کر دیا اور بہت سی عورتیں گرفتار ہو کر کوٹھے میں قید کی گئیں اور کچھ عورتیں بھی اتفاقیہ ماری گئیں اور کچھ مرد اور کچھ عورتیں اور بچے زخمی بھاگ بھاگ کر چاند پور پہنچے۔ جو حلوائی چھیپی مفسد اور حرام زادہ تھے اور غالباً انہوں نے بھی اس روز ہلدور میں فساد کیا تھا اور آگ لگائی تھی اسی روز مع اپنے اہل و عیال کے احمد اللہ خاں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے تئیں بے قصور سمجھ کر ہلدور میں رہ گئے تھے۔ غرض کہ شام تک ان لوگوں کا برابر قتل رہا اور جس قدر گھر مسلمانوں کے وہاں تھے وہ سب جلا دیئے گئے اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے بھی بہت سے گھر' جو بیچ میں آ گئے تھے' جل گئے اور ہلدور کا یہ حال ہو گیا کہ بجز دو پکی حویلیوں کے کوئی گھر جلنے اور خراب ہونے اور لٹنے سے باقی نہیں رہا۔ پھونس کا نام ہلدور میں سے جاتا رہا' یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔(1)

مصنف کے فرار کی الم ناک داستان

چودھری رندھیر سنگھ کا ہماری حفاظت کا اہتمام

ہندوؤں کو مسلمانوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ چند آدمی جو اتفاقیہ ہلدور میں وارد تھے وہ بھی مارے گئے۔ گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں اور ڈپٹی صاحب کی نسبت صاف صاف کہتے تھے

کہ گویہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں، ان کو بھی مار ڈالنا چاہئے۔ مگر چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی اور کہلا بھیجا کہ دروازہ مضبوط بند کر کے اندر بیٹھے رہو اور کسی اپنے نوکر کو بھی باہر نہ نکلنے دو، ایسا نہ ہو کوئی مار ڈالے۔ اس سبب سے تین روز تک ہم کو ہلدور میں پانی اور کھانے کی بہت تکلیف رہی۔

ہلدور سے ہماری پاپیادہ روانگی

جب یہ حال ہوا تو پھر ہم نے اپنا قیام ہلدور میں بھی مناسب نہ جانا اور تمام ضلع میں کوئی اور ایسی جگہ بھی نہ تھی جہاں ہم رہ سکتے۔ اس مجبوری سے ضلع کا چھوڑنا ضرور پڑا۔ انتیسویں تاریخ کا دن جس طرح ہو سکا ہم نے ہلدور میں بسر کیا۔ گیارہ بجے رات کے ہم پیادہ پا وہاں سے نکلے اور نہایت مشکل اور تباہی سے راستہ کاٹا۔ صبح ہوتے ہم لوگ مع ڈپٹی صاحب اور متھرا داس اور بانکے رائے خزانچی کے قریب موضع پھینیاں کے پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ پھینیاں میں بہت سے لوگ ہمارے لوٹنے اور مارنے کو جمع ہیں اس لئے اس راہ کا چھوڑنا ضرور پڑا اور پلانہ کا راستہ اختیار کیا۔

پلانہ میں بخشی سنگھ کا ہمیں گنواروں سے بچانا

جب موضع پلانہ کی سرحد میں پہنچے، دفعتاً دو ہزار گنوار مسلح ہم پر دوڑے اور ہمارے لوٹنے اور قتل کا ارادہ کیا۔ مسمی بخشی سنگھ پردھان موضع پلانہ نے مجھ کو اور ڈپٹی صاحب کو بچایا اور ان گنواروں کو روکا اور خود ساتھ ہو کر بحفاظت تمام اپنے گاؤں کی سرحد سے نکال دیا۔ جب کہ ہم موضع کھیرکی میں پہنچے تو وہاں کے زمینداروں نے ہماری بہت خاطر کی اور ہم کو پانی اور دودھ پلایا اور ہر طرح سے ہماری اطاعت کی اور چند آدمی ساتھ ہوئے تاکہ چاندپور تک پہنچا دیں۔

چاندپور کے بدمعاش مسلمانوں کی ہم پر یورش

چاندپور میں اس سے زیادہ مصیبت ہماری قسمت میں لکھی تھی۔

ہلدور سے جلوائیاں اور چھیپیوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے، جو بچ کر بھاگے تھے، وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے چاندپور میں پہنچ چکے تھے۔ ان کا حال دیکھ کر زیادہ تر لوگ ناراض ہو رہے تھے کہ ہم بے گناہ دفعتاً وہاں جا پہنچے۔

جب ہم قریب دروازہ چاندپور کے پہنچے اور بدمعاشان مسلمانان چاندپور کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی، دفعتاً محلہ بتیا پارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لے کر ہم پر چڑھ آئے۔

جلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو بگاڑ دیا اور

لوگوں کی جورو بیٹی کی بے عزتی کرائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا' اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے۔[1]

میر صادق علی کا ہمیں بدذاتوں سے نجات دلانا

ہمارے مارے جانے میں کچھ شبہ باقی نہ تھا کہ فی الفور میر صادق علی رئیس چاندپور ہماری مدد کو پہنچے اور اپنے رشتہ داروں اور ملازمان کو ساتھ لے کر ان مفسدوں کو روکا۔ اس عرصہ میں بہت سے آدمی شہر کے ہماری اعانت کو آئے اور ان بدذاتوں کے ہاتھ سے ہم کو بچایا اور میر صادق علی ہم کو اپنے مکان پر لے گئے اور وہاں امن دیا۔ دوسرے روز خود ساتھ ہو کر موضع چھولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم پھر اوس گئے اور وہاں سے عرضی مفصل سرگزشت کی بحضور حکام لکھی اور چند روز بسبب بیماری کے مقام کر کے ڈپٹی صاحب براہ خورجہ بعد پہنچانے اپنے اہل و عیال کے اور میں صدر امین سیدھا بمقام میرٹھ بحضور حکام عالی مقام حاضر ہوئے[2] ★

انگریز میرا آقا' میں نمک حلال نوکر!

میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ در حقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں۔ اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو' میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر (دام اقبالہٗ) صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ۔

> "تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرف داری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے' جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے' سب نے کمال

★۔ حالی لکھتے ہیں: "جس وقت وہ میرٹھ میں پہنچے ہیں ان کے پاس چھ پیسے اور اس پھٹے ہوئے کرتے کے سوا جو وہ پہنے ہوئے تھے' اور کچھ نہ تھا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 74)

خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے"۔

میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ (خدا ان کو سلامت رکھے۔ آمین!)[1]

مزید جھڑپوں میں چودھریوں پر آفت

احمد اللہ خاں کی ہلدور پر پھر چڑھائی

ہمارے جانے کے بعد چودھری صاحبان ہلدور پھر جمعیت اکٹھا کرنے کی فکر میں پڑے اور اپنی حویلی کی حفاظت میں مصروف ہوئے' چنانچہ بہت سے آدمی ہلدور میں جمع ہو گئے اور احمد اللہ خاں اور ماڑے بمقام بجنور مقیم رہے۔ تیسویں اگست ۱۸۵۷ء روز یک شنبہ مطابق نویں محرم ۱۲۷۴ ہجری کو احمد اللہ خاں اور ماڑے نے پھر ہلدور پر چڑھائی کی۔ جس قدر آدمی کہ چودھری صاحبان کے پاس تھے وہ حویلی میں محصور ہو گئے...... جب حویلی ٹوٹ نہ سکی تو احمد اللہ خاں نے وہاں سے کوچ کر کے نہٹور میں مقام کیا۔[2]

چودھریوں کی نجیب آباد پر چڑھائی اور شکست

چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ نے ارادہ کیا کہ پھر ایک دفعہ نواب سے مقابلہ کیا چاہیئے اور اپنی برادری کو خطوط لکھے۔ اور چودھری پرتاپ سنگھ سے بھی کمک چاہی۔ چنانچہ پھینہ میں لام جمع ہوا...... کچھ آدمی ہلدور میں اکٹھے ہوئے اور یہ سارا لام جمع ہو کر بارادہ چڑھائی نجیب آباد روانہ ہوا...... چودھری صاحب اپنا لام لے کر اٹھارہویں ستمبر ۱۸۵۷ء کو متصل پیرانی کے پہنچے اور طرفین میں مقابلہ شروع ہوا۔ تھوڑی لڑائی کے بعد چودھری صاحب کی شکست ہوئی۔ تمام گنوار' جو جمع تھے' بھاگ نکلے...... اس فتح میں شفیع اللہ خاں کا بہت بڑا نام ہوا اور لقب بہادری اس کو دیا گیا اور جنرل جرار بھی کہلانے لگا۔[3]

نواب کی چودھریوں سے صلح کی گفتگو

اس لڑائی کے بعد احمد اللہ خاں اور نواب کے مشیروں نے چاہا کہ یا جملہ چودھریان کی بیخ کنی کر دی جائے ورنہ وہ لوگ مقابلہ سے باز نہ آئیں گے اور ان کی طرف کا کھٹکا رفع نہ ہو گا یا ان سے بخوبی صلح اور صفائی ہو جائے۔ سعد اللہ خاں کی معرفت پیغام صفائی اور حاضر ہو جانے کے چودھری پرتاپ سنگھ صاحب سے ہوئے اور ننھے خاں نے چودھری امراؤ سنگھ صاحب رئیس شیر کوٹ سے گفتگو صفائی کی کی...... سعد اللہ خاں ان کو نجیب آباد لے گیا اور چھبیسویں ستمبر کو چودھری صاحبوں کی ملاقات نا محمود خاں سے ہوئی۔ دونوں چودھری صاحبوں نے کچھ اشرفیاں نذر دیں اور نا محمود خاں نے ایک دوشالہ ان کو بطور خلعت دیا اور دوسرے دن رخصت کر دیا...... چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ نہ آئے اور بہ لطائف الحیل آنے سے انکار کر دیا اور کئی دن بعد گنگا پار بحضور حکام چلے گئے۔[1]

بے رحم ماڑے حرام زادہ کی دہشت اور ظلم

ماڑے بدنصیب بے رحم شیر کوٹ میں گیا ۲۱ ستمبر کو' اس ارادہ سے کہ وہاں کے ہنود کو قتل کرے...... اکتیس آدمی پٹواری اور برہمن اور بھاٹ نہایت ظلم اور قساوت قلبی سے ذبح کئے گئے۔ دو آدمی تو زخمی ہو کر بچ گئے اور انتیس آدمی مارے گئے۔ اس وقت سے ماڑے حرام زادہ کی بڑی دہشت لوگوں کے' علی الخصوص ہندوؤں کے' دل میں بیٹھ گئی تھی کہ جدھر ماڑے کا لشکر جاتا تھا لوگ تھرا جاتے تھے اور کانپ اٹھتے تھے۔[2]

چودھریوں کی عرضیاں برائے کمک انگریزی

چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ' جو میرٹھ میں بحضور حکام حاضر تھے' انہوں نے بار بار جناب صاحب کمشنر بہادر میرٹھ سے عرض کیا تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی کمک ہم کو ملے تو ہم پھر نا محمود خاں سے مقابلہ کریں اور اس کو ضلع۔ ۔ خارج کر دیں اور پھر ہم اپنی برادری کے بہت سے لوگ مقابلہ کو جمع کر لیں گے۔ اگرچہ جناب صاحب کمشنر بہادر کو اس میں تامل تھا مگر بسبب اصرار بار بار عرض کرنے چودھریان کے جناب صاحب کمشنر بہادر نے اس کی کمک تجویز کی...... اور جملہ رئیسانِ ضلع بجنور کے نام حکم نامے جاری کئے کہ کوئی شخص نا محمود خاں کی اعانت نہ کرے۔ اگر کرے گا تو بجرم سرکار ہو گا چنانچہ سترھویں اکتوبر ۱۸۵۷ء کو یہ سب امور تجویز ہوئے اور حکم نامہ جات بنام رئیسانِ ضلع بجنور تحریر ہوئے اور چودھری صاحبان کو میرٹھ سے رخصت کیا۔[3]

جملہ رئیسوں کا نوابی لشکر میں شرکت سے گریز

ماڑے خاں بمجرد سننے خبر چڑھائی چودھریان ہلدور مع اپنے لشکر کے بمقام چاندپور پہنچا اور اس کے بعد شفیع اللہ خاں اور احمد اللہ خاں مع اپنے لشکر کثیر کے چاندپور میں جمع ہوئے اور اکثر رئیسوں کے نام خط لکھے کہ تم بھی آن کر شامل ہو مگر کوئی شریک نہ ہوا...... سب رئیسوں کو حکم نامہ جناب صاحب کمشنر بہادر کا بہت خوف تھا۔ اس سبب سے سوائے ملازمین نواب کے کہ تعداد میں آٹھ نو ہزار سے زیادہ ہوں گے اور کوئی شریک نہ ہوا مگر چودھری صاحبوں کی طرف بھی جمعیت کثیر نہ ہونے پائی...... بہر حال جولام چودھری صاحبوں کا دھوروپر بندھا تھا وہ آگے نہ بڑھ سکا بلکہ متفرق ہو گیا اور چودھری صاحبان نے وہاں سے مراجعت کی۔[1]

ہلدور پر یورش اور چودھری رندھیر سنگھ کی گرفتاری

احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماڑے نے تجویز کی کہ جب تک بنیاد ہلدور باقی ہے یہ فساد بھی قائم ہے اس لئے اس نے چاندپور سے ہلدور پر چڑھائی کی۔ ہلدور میں چودھری رندھیر سنگھ مع قدرے جمعیت کے موجود تھے جب انہوں نے احمد اللہ خاں کے لشکر کے آنے کی خبر سنی، حویلی میں محصور ہو گئے۔ لشکر احمد اللہ خاں نے حویلی کو گھیر لیا۔ طرفین کی طرف سے گولیاں چلتی رہیں اور آدمی بھی مارے گئے۔ آخر کار رات کے وقت چودھری رندھیر سنگھ نے اپنے ساتھ کے آدمیوں کو اجازت دی کہ جس طرح پر چاہیں اپنی جان بچائیں اور حویلی میں سے نکل جائیں۔ چنانچہ اکثر آدمی نکل گئے۔ صبح کو تاریخ تیسری نومبر ۱۸۵۷ء احمد اللہ خاں کا لشکر حویلی میں داخل ہوا اور چودھری رندھیر سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ رام دیال سنگھ، پھوپھی زاد بھائی رندھیر سنگھ کا اور اور پانچ چھ آدمی رشتہ دار ان کے مارے گئے اور چودھری رندھیر سنگھ کو قید کر کے براہ نگینہ نجیب آباد لے گئے اور ایک مکان میں نظر بند کر دیا جس قدر اسباب ہلدور میں تھا سب لٹ گیا اور مکانات چودھریان ہلدور کے جلا دیئے گئے اور ہلدور ویران محض ہو گئی۔[2]

نوابی لشکر کا روڑکی پر ناکام حملہ

گنگا پار کے باغیوں کی ترغیب پر مفسدانہ سرگرمیاں

نا محمود خاں اور اس کے ہمراہی سب طرف سے بے فکر ہو گئے اور چودھریوں میں سے کسی کا اندیشہ ان کے دل میں نہ رہا اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گئے۔ گنگا پار کے جو باغی تھے انہوں نے بھی اپنے لئے بجنور سے زیادہ کوئی مامن نہ دیکھا چنانچہ دلیل سنگھ اور قدم سنگھ گوجر اور

رضا حسن عرف چھنن اور عنایت علی خاں قاضی تھانہ بھون مع اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کے اس ضلع میں آئے۔ اس ضلع کے باغیوں نے ان کو امن دیا۔ ان کے سوا مرزا الطاف اور مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ شاہزادگان مفرور دہلی اس ضلع میں آئے اور نا محمود خاں اور ماڑے نے اول اول بہت عزت اور توقیر کی۔ ان باغیوں نے اس ضلع میں آن کر زیادہ تر فساد مچایا اور نا محمود خاں اور احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور ماڑے کو ورغلانا اور گنگا پار اترنے اور ضلع مظفر نگر اور سہارن پور میں فساد مچانے اور غدر ڈالنے پر ترغیب کی۔ یہ جاہل ان کے داموں میں آگئے اور پار اترنے پر مستعد ہو گئے اور کئی دفعہ پار کو اترے اور چند چوکیات سرکاری میں نقصان پہنچایا..... ان وارداتوں کے بعد باغیوں کو اور زیادہ حوصلہ ہوا اور شفیع اللہ خاں نے روڑکی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا..... ساتویں جنوری ۱۸۵۸ء کو وہ فوج سوار اور پیادہ کی مع اپنے افسروں کے پایاب گنگا تری اور کچھ پیدل میاپور کے ڈرام نہر پر ہو کر اتر آئے اور چوکی میاپور پر حملہ کیا..... بعد اس کے یہ سب باغی کنکھل میں آئے اور تار برقی پل میاپور سے کنکھل تک توڑ دیا۔[1]

سرکاری فوج کی کارروائی

تین بجے دن کے اس واردات کی خبر روڑکی میں اور وہاں سے منگلور میں، جہاں کچھ فوج سرکاری مقیم تھی، پہنچی۔ رات کو حکام انگریزی اور کچھ فوج نے کوچ کیا۔ صبح ہوتے آٹھویں جنوری ۱۸۵۸ء کو افسران اور فوج..... بمقام میاپور پہنچی..... نویں جنوری ۱۸۵۸ء کو بارہ بجے شیو پرشاد نیٹو ایجنٹ نہر نے خبر دی کہ نواب کی فوج پار اتر رہی ہے۔ افسران انگریزی نے بگل تیاری کا کیا اور ڈورمینڈ صاحب بہادر نے ڈرام نہر پر کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھا کہ در حقیقت فوج اتر رہی ہے۔ کچھ تو اس پار اتر آئی ہے اور کچھ پایاب پانی میں چلی آتی ہے۔ یہ نادان اس ارادہ سے اترے تھے کہ کنکھل میں مقام کریں گے کیونکہ سب کے ساتھ آٹا اور مختصر برتن اور اوڑھنا بچھونا بھی تھا۔ کپتان ڈورمینڈ صاحب بہادر نے بمجرد دریافت اس بات کے ڈرام نہر کا کھول دیا اور پانی نہر کا گنگا میں چھوڑ دیا اور فلپ صاحب بہادر کو اس پر متعین کر کے خود کنکھل کو تشریف لائے۔ یہ دانائی اور یہ حکمت کپتان ڈورمینڈ صاحب بہادر کی بہت قابلِ تحسین ہے۔ در حقیقت اس حکمت سے دشمن کو موت کے چنگل میں پکڑ لیا اور بجائے آبِ شمشیر موجِ آب سے ان کا کام تمام کیا۔[2]

باغیوں کی فوج کا زبردست نقصان

یہ فوج باغیوں کی جو اتری ان میں سب کا سردار شفیع اللہ خاں بھانجا محمود خاں کا تھا..... وہ لوگ کنکھل میں داخل ہونے نہ پائے تھے کہ افسران انگریزی مع اپنی فوج کے ان کے مقابل ہوئے اور حویلی ایکڑی والا پر مورچہ توپ قائم کیا۔ باغیوں نے باڑ بندوقوں اور توپوں کی سر کی جب قریب

آئے تو سرکاری فوج نے توپوں کا گراب ان پر مارا بیسیوں آدمی گر پڑے اور مارے گئے۔ باغیوں کا منہ پھر گیا اور بھاگ نکلے۔ سرکاری فوج نے دفعتاً دھاوا کر دیا اور مارے بندوقوں کے جس قدر آدمی کہ ڈرام کے پانی کو اتر آئے تھے اور جس قدر کہ پانی کے بیچ میں تھے اور جس قدر کہ اس کنارہ ڈرام کے کھڑے تھے سب کو مار دیا اور بیسیوں آدمی ڈرام کے پانی میں' جو بسبب چھوٹ جانے آبِ نہر کے گہرا ہو گیا تھا' ڈوب گئے۔①

شفیع اللہ خاں ہاتھی پر فرار

عین اس معرکہ میں کپتان بارکن صاحب بہادر نے کمال دلاوری سے تنہا اپنا گھوڑا شفیع اللہ خاں کے ہاتھی کے پیچھے ڈالا اور بندوق فیر کی۔ کفایت اللہ خاں' جو خواصی میں بیٹھا تھا' اس کو گولی لگی' وہ مرکر گر پڑا۔ جب صاحب بہادر نے دوسرا فیر شفیع اللہ خاں پر کیا' اس کی قضا نہ تھی' وہ خالی گیا اور شفیع اللہ خاں ہاتھی بھگا کر بھاگ گیا۔ بہت سے ہتھیار اور گھوڑے سواروں کے' جو مارے گئے تھے' اور ایک تھیلا سیگزین کا' جو ہاتھی پر سے گرا تھا' فوج سرکاری کے ہاتھ آیا اور فتح و نصرت نصیب اولیائے دولت سرکار ہوئی۔ اس معرکہ میں چار سو آدمی تخمیناً باغیوں کا مارا گیا' حسن رضا خاں' جو کنارہ آب ڈرام پر سرنگے زخمی ہو کر بیٹھ گیا تھا' اس کا سر تلوار سے کاٹ لیا۔ سرکاری فوج میں کسی شخص کے پھول کی بھی چوٹ نہیں آئی۔ باقی آدمی باغیوں کے' جو کنارہ نیل دھارا پر تھے' مع توپوں کے بھاگ گئے۔ شیو پرشاد نیٹو ایجنٹ نہر کو بجلدوے اس خبر رسانی کے سو روپیہ انعام ملے۔②

باغیانِ فوج میں کھلبلی

جب اس شکست کی خبر نجیب آباد پہنچی تمام باغیان فوج میں کھلبلی پڑ گئی اور سب کے ارادے جو پار اترنے کے تھے وہ سست پڑ گئے...... سلاطین دہلی اور تلنگان باغی' جو جمع تھے' متفرق ہونے لگے اور بریلی کی طرف کسی حیلہ اور بہانہ سے چلے گئے۔③

انگریز فوج باقاعدہ میدان عمل میں

روڑکی میں سرکاری لام بندی کا حکم

سولھویں فروری ۱۸۵۸ء کو چٹھی صاحب سیکرٹری گورنمنٹ ...... بنام صاحب کلکٹر بہادر ضلع بجنور بمقام میرٹھ پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور بمقام روڑکی روانہ ہو اور واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے فوج کی لام بندی کا بمقام روڑکی حکم ہوا چنانچہ جناب مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر

صاحب کلکٹر اور مجسٹریٹ ضلع بجنور اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جائنٹ مجسٹریٹ ضلع بجنور روڑکی میں تشریف لائے اور باقی عملہ اور رئیسانِ ضلع بجنور' جو گنگا پار تھے'...... بتواریخ مختلف روڑکی میں پہنچے۔[1]

سید تراب علی کا باغیوں کے قبضہ سے بچ نکلنا

یہاں تو لام بندی فوج کی واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے ہو رہی تھی اور بجنور میں بے وقوف اپنے تئیں مالک ملک کا جان کر تقسیم ملک اور انتظامِ ولی عہدی میں معروف تھے...... اس وقت میں کہ سب باغی آپس کے رفع نزاع میں مشغول تھے سید تراب علی تحصیل دار بجنور' جو نگینہ میں باغیوں کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے' باعانت مولوی محمد علی اور میر اشرف علی رئیسانِ نگینہ' جو انجام تک خیر خواہ سرکار رہے' نگینہ سے نکل آئے۔[2]

نا محمود خاں کی مقابلہ کو تیاریاں

نا محمود خاں کو فراہمی فوج کی بمقام روڑکی خبر پہنچی تو اس نے یہ بات چاہی کہ کسی طرح رعایا اس ضلع کو بھی ورغلا کر لڑائی میں اپنے ساتھ شریک کیا جائے...... اس پر بھی رعایا اس ضلع میں سے بجز ان لوگوں کے جو ملازم نواب تھے اور کوئی سرکار کے مقابلہ پر نہیں آیا بلکہ ملازمین میں سے بھی بہت لوگ جان چھپا کر بھاگ گئے...... احمد اللہ خاں اور اس کے صلاح کاروں نے ہر ایک مقام پر جہاں جہاں سے سرکاری فوج کے اترنے کا احتمال تھا کچھ کچھ فوج متعین کی۔[3]

جنرل جونس کی آمد پر آنبہ سوت میں غنیم کی شکست

نواب نے ہر طرح سے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ادھر سرکاری فوج بمقام روڑکی جمع ہوتی تھی کہ دفعتاً تیرہویں اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونس صاحب بہادر اس فوج کے کمانڈر مقرر ہو کر روڑکی میں داخل ہوئے۔[4]

چودھویں اپریل ۱۸۵۸ء کو کپتان ڈیمینڈ صاحب بہادر آفیسر کمان انجینئر اور کپتان برن لو صاحب بہادر انجینئر' دو توپیں ہاتھیوں پر رکھ کر مع ایک کمپنی گورا اور ایک کمپنی سکھ آٹھ بجے کے قریب موضع کنکھل بمقام گھاٹ شیشم والی گنگا پار اتر گئے اور مورچے لگا دیئے........... احمد اللہ خاں دارانگر میں تھا' اس کو خبر پہنچی کہ دو انگریز اور تھوڑی سی فوج پار اتر آئی ہے اس لئے اس نے دارانگر سے آنبہ سوت پر کوچ کیا اور ماڑے کے لشکر میں سے ہزار سپاہی اور کچھ سوار اپنے ساتھ لے کر سولہویں تاریخ کو آنبہ سوت پر پہنچا.......... درحقیقت اس کا ارادہ چھاپہ مارنے کا تھا لیکن

آئے تو سرکاری فوج نے توپوں کا گراب ان پر مارا جس سے بیسیوں آدمی گر پڑے اور مارے گئے۔ باغیوں کا من پھر گیا اور بھاگ نکلے۔ سرکاری فوج نے دفعتاً دھاوا کر دیا اور مارے بندوقوں کے جس قدر آدمی کہ ڈرام کے پانی کو اتر آئے تھے اور جس قدر کہ پانی کے بیچ میں تھے اور جس قدر کہ اس کنارہ ڈرام کے کھڑے تھے سب کو مار دیا اور بیسیوں آدمی ڈرام کے پانی میں' جو بسبب چھوٹ جانے آبِ نہر کے گہرا ہو گیا تھا' ڈوب گئے۔[1]

شفیع اللہ خاں ہاتھی پر فرار

عین اس معرکہ میں کپتان بارگن صاحب بہادر نے کمال دلاوری سے تنہا اپنا گھوڑا شفیع اللہ خاں کے ہاتھی کے پیچھے ڈالا اور بندوق فیر کی۔ کفایت اللہ خاں' جو خواصی میں بیٹھا تھا' اس کو گولی لگی' وہ مر کر گر پڑا۔ جب صاحب بہادر نے دوسرا فیر شفیع اللہ خاں پر کیا' اس کی قضا نہ تھی' وہ خالی گیا اور شفیع اللہ خاں ہاتھی بھگا کر بھاگ گیا۔ بہت سے ہتھیار اور گھوڑے سواروں کے' جو مارے گئے تھے اور ایک تھیلا میگزین کا' جو ہاتھی پر سے گرا تھا' فوج سرکاری کے ہاتھ آیا اور فتح و نصرت نصیب اولیائے دولت سرکار ہوئی۔ اس معرکہ میں چار سو آدمی تخمیناً باغیوں کا مارا گیا۔ حسن رضا خاں' جو کنارہ آب ڈرام پر سر ننگے زخمی ہو کر بیٹھ گیا تھا' اس کا سر تلوار سے کاٹ لیا۔ سرکاری فوج میں کسی شخص کے پھول کی بھی چوٹ نہیں آئی۔ باقی آدمی باغیوں کے' جو کنارہ نیل دھارا پر تھے' مع توپوں کے بھاگ گئے۔ شیو پرشاد نیو لیجنٹ نہر کو بجلدوے اس خبر رسانی کے سو روپیہ انعام ملے۔[2]

باغیانِ فوج میں کھلبلی

جب اس شکست کی خبر نجیب آباد پہنچی تمام باغیان فوج میں کھلبلی پڑ گئی اور سب کے ارادے جو پار اترنے کے تھے وہ سست پڑ گئے...... سلاطین دہلی اور تلنگان باغی' جو جمع تھے' متفرق ہونے لگے اور بریلی کی طرف کسی حیلہ اور بہانہ سے چلے گئے۔[3]

انگریز فوج باقاعدہ میدان عمل میں

روڑکی میں سرکاری لام بندی کا حکم

سولہویں فروری ۱۸۵۸ء کو چٹھی صاحب سیکرٹری گورنمنٹ ..... بنام صاحب کلکٹر بہادر ضلع بجنور بمقام میرٹھ پہنچی کہ تم مع عملہ ضلع بجنور بمقام روڑکی روانہ ہو اور واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے فوج کی لام بندی کا بمقام روڑکی حکم ہوا چنانچہ جناب مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر

صاحب کلکٹر اور مجسٹریٹ ضلع بجنور اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جائنٹ مجسٹریٹ ضلع بجنور روڑکی میں تشریف لائے اور باقی عملہ اور رئیسانِ ضلع بجنور جو گنگا پار تھے'...... بتواریخ مختلف روڑکی میں پہنچے۔[1]

سید تراب علی کا باغیوں کے قبضہ سے بچ نکلنا

یہاں تو لام بندی فوج کی واسطے انتظام روہیل کھنڈ کے ہو رہی تھی اور بجنور میں بے وقوف اپنے تئیں مالک ملک کا جان کر تقسیم ملک اور انتظامِ ولی عہدی میں معروف تھے...... اس وقت میں کہ سب باغی آپس کے رفع نزاع میں مشغول تھے سید تراب علی تحصیل دار بجنور' جو نگینہ میں باغیوں کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے' باعانت مولوی محمد علی اور میر اشرف علی رئیسانِ نگینہ' جو انجام تک خیر خواہ سرکار رہے' نگینہ سے نکل آئے۔[2]

نامحمود خاں کی مقابلہ کو تیاریاں

نامحمود خاں کو فراہمی فوج کی بمقام روڑکی خبر پہنچی تو اس نے یہ بات چاہی کہ کسی طرح رعایا اس ضلع کو بھی ورغلا کر لڑائی میں اپنے ساتھ شریک کیا جائے...... اس پر بھی رعایا اس ضلع میں سے بجز ان لوگوں کے جو ملازم نواب تھے' اور کوئی سرکار کے مقابلہ پر نہیں آیا بلکہ ملازمین میں سے بھی بہت لوگ جان چھپا کر بھاگ گئے...... احمد اللہ خاں اور اس کے صلاح کاروں نے ہر ایک مقام پر جہاں جہاں سے سرکاری فوج کے اترنے کا احتمال تھا کچھ کچھ فوج متعین کی۔[3]

جنرل جونس کی آمد پر آنبہ سوت میں غنیم کی شکست

نواب نے ہر طرح سے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ادھر سرکاری فوج بمقام روڑکی جمع ہوتی تھی کہ دفعتاً تیرہویں اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونس صاحب بہادر اس فوج کے کمانڈر مقرر ہو کر روڑکی میں داخل ہوئے۔[4]

چودھویں اپریل ۱۸۵۸ء کو کپتان ڈیمینڈ صاحب بہادر آفیسر کمان انجینئر اور کپتان برن لو صاحب بہادر انجینئر دو توپیں ہاتھیوں پر رکھ کر مع ایک کمپنی گورا اور ایک کمپنی سکھ آٹھ بجے کے قریب موضع کنکھل بمقام گھاٹ شیشم والی گنگا پار اتر گئے اور مورچے لگا دیئے........... احمد اللہ خاں دارانگر میں تھا' اس کو خبر پہنچی کہ دو انگریز اور تھوڑی سی فوج پار اتر آئی ہے اس لئے اس نے دارانگر سے آنبہ سوت پر کوچ کیا اور ماڑے کے لشکر میں سے ہزار سپاہی اور کچھ سوار اپنے ساتھ لے کر سولہویں تاریخ کو آنبہ سوت پر پہنچا......... درحقیقت اس کا ارادہ چھاپہ مارنے کا تھا لیکن

وہ اس ارادہ سے نا امید ہوا اور سرکاری توپ خانہ اور رفیل کی پلٹن اور ملتانی رسالہ نے غنیم پر ایسی آگ برسائی کہ وہ بالکل سراسیمہ ہو گئے۔ اس وقت جنرل جونس صاحب بہادر نے دفعتاً سواروں اور توپ خانہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کپتان کیورنین صاحب نے ہر مقام پر غنیم پر یورش کی اور شراپنل کا گولہ برابر غنیم پر پڑنے لگا دشمن بھاگ نکلا اور بجز چند توپوں اور بندوقوں کے فائر کرنے کے اس سے اور کچھ نہ ہو سکا خاص آنبہ سوت پر، جو بہت مشکل اور مورچہ کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی اور غنیم نے بہت مدت سے یہاں مورچہ درست کیا تھا اس کو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا۔[۱]

لاشوں کی شناخت میں مصنف کی دلچسپی

سینکڑوں آدمی جوتیاں اور وردی کے کپڑے اور اپنے ہتھیار پھینک کر بھاگے۔ تمام جنگل اور سڑک پر ہتھیار بکھرے ہوئے تھے اور ہر ہر قدم پر لاش پڑی تھی۔ میں، جو لشکر محارب کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا، مقصد الاشوں کو دیکھتا تھا کہ شاید کوئی شناخت میں آئے مگر کوئی نامی آدمی نہیں مارا گیا البتہ دو لاشیں تلنگان نمک حرام کی نظر پڑیں اور میری دانست میں تخمیناً تین سو ساڑھے تین سو آدمی غنیم کا مارا گیا اور سرکار کی طرف بجز ایک آدمی کے اور کسی کا نقصان نہیں ہوا۔[۲]

جملہ باغیان کا نجیب آباد سے فرار

بعد شکست کھانے کے احمد اللہ خاں مع چند سواروں کے جدا بھاگا اور شفیع اللہ خاں مع چند سواروں کے جدا بھاگا .... شفیع اللہ خاں بھاگا ہوا نانگل میں پہنچا اور اس کے تھوڑی دیر بعد احمد اللہ خاں پہنچا اور یہ سب مل کر نجیب آباد آئے اور اسی وقت بھاگنے کی تیاری کی۔ پانچ بجے تک جملہ باغیان نجیب آباد سے بھاگ گئے .... تمام رعایا شہر سے نکل گئی اور شہر بالکل خالی ہو گیا۔[۳]

نجیب آباد اور قلعہ پتھر گڑھ کی فتح

جنرل جونز صاحب کو خبر پہنچی کہ نانگل سے بھی غنیم اپنے خیموں کو استادہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی وقت میجر اسماعیل صاحب کو حکم دیا کہ بھاری توپیں اور سامان حرب گنگا کے پار اتاریں، چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی .... اٹھارھویں تاریخ کو اسی قاعدہ سے لشکر کا کوچ بھاگو والہ سے نجیب آباد ہوا .... شہر بالکل خالی پڑا تھا۔ جب قلعہ پتھر گڑھ کی طرف بڑھے تو کچھ لوگ باغی قلعہ میں سے بھاگتے دکھائی دیئے۔ ان کے تعاقب میں سواروں نے گھوڑے ڈالے اور تیس آدمی ان میں کے مارے، شہر اور قلعہ بالکل فتح ہو گیا اور سرکار دولت مدار کے قبضہ میں آ گیا۔[۴]

شہر آتش زنی سے تباہ مگر ہمارے حاکم بے گناہ!

شہر نجیب آباد کا لٹ گیا اور تمام شہر میں بکثرت آگ لگ گئی۔ نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی اور بسبب اس کے کہ شہر خالی پڑا تھا اور پانی بھی وہاں بہت کمیاب ہے، آگ کے بجھانے کا کچھ علاج نہ ہوا مگر عموماً یہ بات مشہور ہوئی کہ ہندوؤں نے، جن کے گھر نواب نے جلا دیئے تھے، اس فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر مقصداً تمام شہر میں آگ لگوادی اور جو رنج کہ ان کے دلوں میں تھا اس کا بدلہ بخوبی نکال لیا، اور کچھ شک نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو۔[1]

محمود خاں کے بھائی کو سزائے موت

انیسویں تاریخ کو خبر ملی کہ جلال الدین خاں بھائی محمود خاں کا اور سعد اللہ خاں، جو پہلے مصنف امروہہ تھا، کوٹ قادر میں ہیں۔ اسی وقت جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میجر اسماعیل صاحب بہادر کے کچھ سوار ساتھ لے کر ان کی گرفتاری کو گئے مگر پہنچنے سے پہلے ان دونوں نے اپنے تئیں ملتانی سواروں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ وہ دونوں گرفتار آئے اور گوروں کے پہرہ میں مقید ہوئے اور بیسویں تاریخ سے ان کا کوٹ شروع ہوا اور بعد ثبوتِ جرم کے جنرل جون صاحب بہادر کے حکم سے نور پور کے مقام ۲۳ تاریخ کو گولی سے مارے گئے۔[2]

نامحمود خاں کے مکانات کی مکمل تباہی

بیسویں اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات نامحمود خاں اور جلال الدین خاں، جو اُن کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں، اڑا دیئے جائیں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی ان پنشن دار نمک حراموں سے ظاہر ہو اور لوگوں کو بخوبی عبرت ہو، چنانچہ اسی تاریخ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ، جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی جگہ تھی، اڑا دیا گیا۔[3]

نجیب آباد میں مصنف کی ذمہ داریاں

اسی تاریخ یہ تجویز ہوئی کہ ایک کمپنی سکھ اور توپ خانہ اپنی تحت حکومت میجر اسماعیل صاحب بہادر اور اول پنجاب رسالہ تحت حکومت کپتان ہوس صاحب بہادر پتھر گڑھ میں رہے اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جائنٹ مجسٹریٹ انتظام نصف شمالی ضلع کا اپنے ذمہ لیں۔ چنانچہ صاحب ممدوح ہمراہ اس فوج کے بمقام نجیب آباد مقیم رہے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر

وہ اس ارادہ سے نا امید ہوا اور سرکاری توپ خانہ اور رائفل کی پلٹن اور ملتانی رسالہ نے غنیم پر ایسی آگ برسائی کہ وہ بالکل سراسیمہ ہو گئے۔ اس وقت جنرل جونس صاحب بہادر نے دفعتاً سواروں اور توپ خانہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کپتان کیورٹین صاحب نے ہر مقام پر غنیم پر یورش کی اور شراپنل کا گولہ برابر غنیم پر پڑنے لگا دشمن بھاگ نکلا اور بجز چند توپوں اور بندوقوں کے فائر کرنے کے اس سے اور کچھ نہ ہو سکا خاص آنبہ سوت پر 'جو بہت مشکل اور مورچہ کے لئے بہت عمدہ جگہ تھی اور غنیم نے بہت مدت سے یہاں مورچہ درست کیا تھا اس کو بھی چھوڑ کر بھاگ گیا۔[1]

لاشوں کی شناخت میں مصنف کی دلچسپی

سینکڑوں آدمی جوتیاں اور وردی کے کپڑے اور اپنے ہتھیار پھینک کر بھاگے۔ تمام جنگل اور سڑک پر ہتھیار بکھرے ہوئے تھے اور ہر ہر قدم پر لاش پڑی تھی۔ میں 'جو لشکر محارب کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا' مقصد الاشوں کو دیکھتا تھا کہ شاید کوئی شناخت میں آئے مگر کوئی نامی آدمی نہیں مارا گیا البتہ دو لاشیں تلنگان نمک حرام کی نظر پڑیں اور میری دانست میں تخمیناً تین سو ساڑھے تین سو آدمی غنیم کا مارا گیا اور سرکار کی طرف بجز ایک آدمی کے اور کسی کا نقصان نہیں ہوا۔[2]

جملہ باغیان کا نجیب آباد سے فرار

بعد شکست کھانے کے احمد اللہ خاں مع چند سواروں کے جدا بھاگا اور شفیع اللہ خاں مع چند سواروں کے جدا بھاگا .... شفیع اللہ خاں بھاگا ہوا ناننگل میں پہنچا اور اس کے تھوڑی دیر بعد احمد اللہ خاں پہنچا اور یہ سب مل کر نجیب آباد آئے اور اسی وقت بھاگنے کی تیاری کی۔ پانچ بجے تک جملہ باغیان نجیب آباد سے بھاگ گئے .... تمام رعایا شہر سے نکل گئی اور شہر بالکل خالی ہو گیا۔[3]

نجیب آباد اور قلعہ پتھر گڑھ کی فتح

جنرل جونس صاحب کو خبر پہنچی کہ ناننگل سے بھی غنیم اپنے خیموں کو استادہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی وقت میجر اسمٰعیل صاحب کو حکم دیا کہ بھاری توپیں اور سامان حرب گنگا کے پار اتاریں' چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی .... اٹھارہویں تاریخ کو اسی قاعدہ سے لشکر کا کوچ بھاگو والہ سے نجیب آباد ہوا .... شہر بالکل خالی پڑا تھا۔ جب قلعہ پتھر گڑھ کی طرف بڑھے تو کچھ لوگ باغی قلعہ میں سے بھاگتے دکھائی دیئے۔ ان کے تعاقب میں سواروں نے گھوڑے ڈالے اور تیس آدمی ان میں کے مارے شہر اور قلعہ بالکل فتح ہو گیا اور سرکار دولت مدار کے قبضہ میں آ گیا۔[4]

شہر آتش زنی سے تباہ مگر ہمارے حاکم بے گناہ!

شہر نجیب آباد کا لٹ گیا اور تمام شہر میں بکثرت آگ لگ گئی۔ نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح سے شہر کا جلانا منظور نہ تھا۔ شاید اتفاقیہ آگ لگی اور بسبب اس کے کہ شہر خالی پڑا تھا اور پانی بھی وہاں بہت کمیاب ہے' آگ کے بجھانے کا کچھ علاج نہ ہوا مگر عموماً یہ بات مشہور ہوئی کہ ہندوؤں نے' جن کے گھر نواب نے جلا دیئے تھے' اس فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر مقصداً تمام شہر میں آگ لگوادی اور جو رنج کہ ان کے دلوں میں تھا اس کا بدلہ بخوبی نکال لیا' اور کچھ شک نہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو۔[11]

محمود خاں کے بھائی کو سزائے موت

انیسویں تاریخ کو خبر ملی کہ جلال الدین خاں بھائی محمود خاں کا اور سعد اللہ خاں' جو پہلے مصنف امروہہ تھا' کوٹ قادر میں ہیں۔ اسی وقت جناب صاحب کلکٹر بہادر اور میجر اسماعیل صاحب بہادر کے کچھ سوار ساتھ لے کر ان کی گرفتاری کو گئے مگر پہنچنے سے پہلے ان دونوں نے اپنے تئیں ملتانی سواروں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ وہ دونوں گرفتار آئے اور گوروں کے پہرہ میں مقید ہوئے اور بیسویں تاریخ سے ان کا کوٹ شروع ہوا اور بعد ثبوتِ جرم کے جنرل جونز صاحب بہادر کے حکم سے نور پور کے مقام ۲۳ تاریخ کو گولی سے مارے گئے۔[12]

نامحمود خاں کے مکانات کی حکماً تباہی

بیسویں اپریل ۱۸۵۸ء کو یہ تجویز ہوئی کہ مکانات نامحمود خاں اور جلال الدین خاں' جو اُن کی سرداری اور حکومت کے نشان ہیں' اڑا دیئے جائیں تاکہ سرکار کی کمال ناراضی ان پنشن دار نمک حراموں سے ظاہر ہو اور لوگوں کو بخوبی عبرت ہو' چنانچہ اسی تاریخ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور دیوان خانہ' جو بہت بڑا مکان اور حکومت کی جگہ تھی' اڑا دیا گیا۔[13]

نجیب آباد میں مصنف کی ذمہ داریاں

اسی تاریخ یہ تجویز ہوئی کہ ایک کمپنی سکھ اور توپ خانہ اپنی تحت حکومت میجر اسماعیل صاحب بہادر اور اول پنجاب رسالہ تحت حکومت کپتان ہوس صاحب بہادر پتھر گڑھ میں رہے اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر جائنٹ مجسٹریٹ انتظام نصف شمالی ضلع کا اپنے ذمہ لیں۔ چنانچہ صاحب ممدوح ہمراہ اس فوج کے بمقام نجیب آباد مقیم رہے اور جناب صاحب کلکٹر بہادر

نے مجھ صدر امین کو حکم دیا کہ تم بھی جناب صاحب جائنٹ مجسٹریٹ بہادر کی خدمت میں حاضر رہ کر ان کی اطاعت میں کام کرو۔ چنانچہ میں نے اس حکم کی تعمیل کی اور صاحب ممدوح کی تابعداری میں حاضر رہا۔[11]

چودھری رندھیر سنگھ کی رہائی اور لشکر میں شمولیت

جب یہ باغی نجیب آباد سے بھاگے ہیں تو نگینہ ہوتے ہوئے دھام پور گئے اور راستہ میں احمد اللہ خاں نے چودھری رندھیر سنگھ کو اپنی قید میں سے چھوڑ دیا اور وہ باعانت زمینداران پورینی نجیب آباد میں پہنچے اور لشکر میں شامل ہوئے۔[12]

باغیوں کی مکمل پسپائی

حرام زادہ ماڑے کا ارادہ مقابلہ

جب حرام زادہ ماڑے نے دارانگر میں خبر سنی کہ فوج سرکاری نجیب آباد میں داخل ہو گئی تو اس نے سرکار کے مقابلہ کا ارادہ کیا اور دارانگر سے مع اپنی تمام فوج براہ بجنور نگینہ کو آیا اور بجنور میں ہردیال جاٹ کو قتل کیا اور چند ہندوؤں کو گرفتار کر کے نگینہ لے آیا اور نگینہ کے باغوں میں مورچہ قائم کئے اور احمد اللہ خاں کے بلانے کو سوار بھیجے اور جتنی فوج کہ متفرق ہو گئی تھی اور جتنے باغی فرار ہوئے تھے سب کو بلا کر جمع کیا' چنانچہ سب باغی یعنی ماڑے خاں اور قاضی عنایت علی اور دلیل سنگھ گوجر اور احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں اور حبیب اللہ خاں اور کلن خاں اور نتھو خاں متعین افضل گڑھ کل اپنی جمعیت اور توپوں کو لے کر بمقام نگینہ جمع ہو گئے مگر نا محمود خاں نگینہ پر نہیں آیا۔[13]

سرکار کے خیر خواہ کی مکمل مخبری

بیسویں تاریخ رات کے وقت جناب صاحب کلکٹر بہادر کو بذریعہ مخبروں کے' جو جناب ممدوح نے مقرر کر رکھے تھے' مفصل خبر غنیم کے ہر ایک مورچہ اور توپوں کی تعداد کی نجیب آباد میں پہنچی اور میر اشرف علی ساکن نگینہ نے جو نواح نگینہ میں موجود تھا اور سرکار کے خیر خواہوں میں ہے' مفصل حالات کی عرضی بحضور جناب صاحب کلکٹر بہادر روانہ کی۔ غرض کہ جملہ حالات نگینہ کے بخوبی بمقام نجیب آباد دریافت ہو گئے۔[14]

نگینہ میں غنیم کو شکست

اکیسویں تاریخ کو فوج کا نجیب آباد سے نگینہ پر کوچ ہوا............ باغیوں کی طرف سے گولہ چلنا شروع ہوا۔ سرکار کی طرف سے بھی توپ سر ہوئی............ پلٹن پیادگان سکھ نے آگے بڑھ کر باڑ ماری۔ غنیم سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلا۔ داہنی طرف سے سرکاری فوج نے بڑھنا شروع کیا اور کپتان کیورنین صاحب بہادر نے ملتانی رسالہ کے سوار ساتھ لے کر بائیں طرف کو رخ کیا۔ غنیم کی فوج بے اختیار بھاگی جاتی تھی اور صدہا آدمی مارے جاتے تھے۔ تمام مورچہ دشمن کے سرکار کے قبضہ میں آ گئے۔ ①

مشہور حرام زادہ عنایت رسول کی ہلاکت

جس فوج نے دائیں طرف غنیم پر یورش کی تھی اور باغی بھاگے جاتے تھے اس وقت سرکاری فوج متصل ٹیکے باغ کے' جو بائیں کے نام سے مشہور ہے' پہنچی۔ اس باغ میں کچھ لوگ مسلح شہر سے بھاگ کر آن چھپے تھے اور کچھ باغی بھی بھاگتے وقت گھس گئے تھے۔ من جملہ ان کے عنایت رسول' جو نامی باغی اور مشہور حرام زادہ تھا' مع جان محمد اپنے ملازم کے اس باغ میں گھس گیا تھا۔ جب سرکاری فوج کے چند سوار اس باغ کے قریب پہنچے تو اس نے یا اس کے نوکر نے ان سواروں پر بندوق فیر کی۔ اس وقت یقین ہوا کہ اس باغ میں باغی چھپے ہوئے ہیں۔ سرکاری فوج نے اس باغ میں جا کر قریب پچاس ساٹھ آدمی کے قتل کیا اور ساٹھ ستر آدمیوں کو زندہ پکڑ کر گولیوں سے مار دیا۔ عنایت رسول مع اپنے نوکر کے مارا گیا اور اکثر آدمی قاضی محلہ کے' جو اس باغ میں چھپے ہوئے تھے' وہ بھی مارے گئے' جس قدر عورتیں اس باغ میں سے نکلیں ان سے کسی نے کچھ مزاحمت نہ کی۔ ②

باغیوں کا ایس پی ہلاک

جس وقت نگینہ پر لڑائی شروع ہونے کو تھی نجیب آباد میں میجر ہوس صاحب بہادر نے اپنے رجمنٹ کے سوار ساتھ لے کر بڈھ پور کو کوچ کیا تھا اس ارادہ سے کہ باغی اس طرف سے بھاگنے نہ پائیں۔ افسوس ہے کہ صاحب کے پہنچنے سے بہت پہلے دلیل سنگھ بڈھ پور سے پھر چکا تھا۔ میجر صاحب نے بڈھ پور کے جنگل میں تلاش کیا تو سعد اللہ خاں سابق تھانہ دار نگینہ' جو باغیوں کی طرف سے سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا' جنگل میں بھاگتا ہوا ملا اور اسی جگہ مع ایک اور سوار کے مارا گیا۔ ③

انتظام شہر نگینہ

بمجرد فتح ہونے نگینہ کے جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر اور جناب اندرسین صاحب بہادر برگٹ میجر مع سپاہیان پلٹن خاکی کے شہر نگینہ میں تشریف لے گئے اور سید تراب علی تحصیل دار کو واسطے انتظام شہر کے اپنے ساتھ لیا اور شہر کی ناکہ بندی کر کے 'جیسا کہ چاہیے' انتظام شہر کا فرمایا اور تین سو آدمی شہر میں سے گرفتار کیے۔ ان میں سے چوّن آدمی اسی وقت مارے گئے اور باقیوں نے اسی وقت رہائی پائی۔ اسی وقت جناب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے مولوی محمد علی رئیس نگینہ کو 'جو خیر خواہ سرکار تھے' تلاش کر کے بلایا اور اپنے لشکر میں رہنے کا حکم دیا اور جہاں تک ممکن ہوا ان کے گھر کو بھی لٹنے سے بچایا۔ باقی تمام شہر نگینہ کا شام تک لٹتا رہا۔[1]

انگریز لیفٹیننٹ کی دلاورانہ ہلاکت پر افسوس

اس لڑائی میں سرکار کی جانب سے بہت کم نقصان ہوا مگر افسوس ہے کہ لیفٹیننٹ کاننگ صاحب بہادر اس معرکہ میں بہت دلاوری سے کام آئے۔[2]

خیر خواہوں کی دوبارہ تقرریاں

رات کے وقت جناب صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ بہادر نے مولوی قادر علی تحصیل دار نگینہ کو بدستور نگینہ کی تحصیل داری پر مامور کیا اور سید تراب علی تحصیل دار بجنور کو حکم دیا کہ تم نگینہ میں ٹھہرو اور تمام تحصیل و تھانہ جات متعلقہ تحصیل نگینہ کا انتظام کرو اور جس قدر کہ آدمی مناسب سمجھو 'نوکر رکھ لو۔ چنانچہ سید تراب علی نے بخوبی انتظام کیا جس سے حکام بخوبی راضی رہے۔[3]

لشکر کی مراد آباد کو روانگی

صبح بائیسویں تاریخ کو لشکر نے نگینہ سے کوچ کیا اور دھام پور پہنچ کر مقام ہوا............ یہ بھی معلوم ہوا کہ جملہ باغی اس ضلع سے بھاگ گئے اور مراد آباد کی طرف چلے گئے۔ چونکہ مراد آباد میں فیروز شاہ آگیا تھا اس لئے تمام لشکر نے ۲۳ تاریخ کو مراد آباد کی طرف کوچ کیا اور جناب مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر نے بمقام نور پور تمام ضلع کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا اور لشکر سے جدا ہوئے۔[4]

بجنور میں داخلہ اور ضلع میں امن کا قیام

جنرل جونز صاحب بہادر نے فوج مقیم میران پور کو' جو مقابلہ گھاٹ دارانگر پایاب کی

حفاظت کرتی تھی، حکم دیا کہ دریا عبور کر کے بجنور میں داخل ہوں۔ چنانچہ پچیسویں تاریخ کو اس فوج نے عبور کیا۔ جناب صاحب کلکٹر بہادر نے جس قدر توپیں فتح نگینہ میں ہاتھ آئی تھیں، جنرل جون صاحب سے اپنے قبضہ میں لیں، اور باوجودیکہ اس وقت سب فوج کا کوچ مراد آباد کی طرف ہو گیا مگر صاحب ممدوح نے بکمال دانائی و دلاوری سب توپوں کو اپنی حفاظت میں لے کر پچیسویں★ اپریل کو بجنور میں داخل ہوئے............ میں بھی ہمرکاب صاحب ممدوح بجنور میں پہنچا اور چھبیسویں تاریخ سے کچہری صدر امین کی کھول دی............ اپریل کا مہینہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ جناب مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر اور جناب مسٹر جارج پامر صاحب بہادر کی حسن تدبیر اور سعی کوشش سے تمام ضلع میں امن ہو گیا۔[1]

مسلمان افسروں کے واقعاتِ جاں نثاری کا خلاصہ

اکیسویں مئی 1857ء کو یعنی جب کہ جیل خانہ ٹوٹا اور نگینہ تک سفر مینا کی سرکش پلٹن روڑکی سے آگئی اور ہم نے کنوئیں میں خزانہ ڈالا، بہت براسخت وقت تھا اور جب مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر نے قیدیوں پر تن تنہا حملہ کیا تو اس وقت سوائے میرے اور میرے ساتھی مسلمان دو افسروں کے اَور کوئی شخص صاحب ممدوح کے ساتھ نہ تھا مگر میری دانست میں دو وقتوں سے زیادہ سخت وقت کوئی ہم پر نہیں گزرا اور اس وقت بھی مسلمانوں کے سوا کوئی شخص مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کے ساتھ جان دینے کو تیار نہ تھا۔ پہلا وقت وہ تھا جب دفعتاً 29 نمبر کی کمپنی سہارن پور سے بجنور میں آگئی۔ میں اس وقت صاحب ممدوح کے پاس نہ تھا۔ دفعتاً میں نے سنا کہ فوج باغی آگئی اور صاحب کے بنگلہ پر چڑھ گئی۔ میں نے یقین جان لیا کہ سب صاحبوں کا کام تمام ہو گیا مگر میں نے نہایت بری بات سمجھی کہ میں اس حادثہ سے الگ رہوں۔ میں ہتھیار سنبھال کر روانہ ہوا............ مگر ہماری خوش نصیبی اور نیک نیتی کا یہ پھل ہوا کہ اس آفت سے ہم بھی اور ہمارے حکام بھی سب محفوظ رہے مگر مجھ کو ان کے ساتھ اپنی جان دینے میں کچھ دریغ نہ تھا۔ دوسرا زمانہ وہ ہے کہ جب جون کی آٹھویں رات کو باغیوں نے حکام یورپین کے قتل کا ارادہ کیا اور مجھ کو خبر ملی اور فی الفور میں نے مسٹر الیگزینڈر شیکسپیئر صاحب بہادر کو اطلاع دی۔ وہ رات جس مصیبت سے گزری ہم سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا مگر اس وقت تین افسر جو جان دینے کو موجود تھے وہ تینوں مسلمان تھے۔ جو شخص کہ عین اس وقت میں باغیوں کے غول میں گیا اور اس فتنہ کو دبایا اور حکام یورپین کو بخیر و عافیت روانہ ہونے کی

★۔ اصل مسودہ میں پچیسویں جون درج ہے جب کہ سیاق و سباق سے اصل تاریخ پچیسویں اپریل بنتی ہے۔ اگلے عنوان کے تحت ایک عبارت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

فرصت ملی وہ شخص بھی مسلمان تھا اور اسی سبب سے میں مسلمانوں کو جاں نثار خیر خواہ اپنی گورنمنٹ کا سمجھتا ہوں۔ ⁽⁴⁾

یہ تمام ہنگامہ باغیوں کا ضلع بجنور میں ہو رہا تھا کہ دفعتاً ہمارے نام حکم آیا کہ سرکار کی طرف سے ضلع بجنور کا انتظام کرو۔ اس وقت بھی ہم اپنی جان کا بچنا باغیوں کے ہاتھ سے ہرگز نہیں جانتے تھے مگر ہم نے انتظام ضلع کا اٹھایا اور سرکار کے نام سے تمام ضلع میں منادی کی اور اشتہارات سرکار کے نام سے جاری کئے اور انتظام ضلع کا سرکار کی طرف سے کیا اور ضلع بجنور کے زمینداروں کو اپنے ساتھ لے کر باغیوں سے مقابلہ کیا۔ جب ہماری شکست ہوئی تو ہم بھاگے اور چاندپور کے مقام پر باغیوں کے ہاتھ گھر گئے۔ ہماری زندگی باقی تھی کہ بہت بڑا صدمہ اٹھا کر وہاں سے نکلے اور میرٹھ پہنچے اور پھر 25ر اپریل 1858ء کو بفتح وفیروزی بجنور میں داخل ہوئے۔ ⁽⁵⁾

قدر دان گورنمنٹ سے انعام واکرام

دیکھو ہماری قدر دان گورنمنٹ کی قدر دانی کو کہ جن لوگوں نے اس ہنگامہ میں اپنی خیر خواہی ظاہر کی، کس قدر ان کی قدر و منزلت بڑھائی۔ ⁽⁶⁾

اس کے عوض میں سرکار نے میری بڑی قدر دانی کی۔ عمدہ صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر، ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدد خرچ کے مرحمت فرمایا۔ ⁽⁷⁾ ★

★۔ سرسید کی خیر خواہی کا خصوصی اعتراف اور ترقی کی سفارش اس سرکاری رپورٹ سے ظاہر ہے جو الیگزینڈر شیکسپیئر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع بجنور نے اپنی چٹھی نمبر 56 مورخہ 5 جون 1858ء بنام کمشنر روہیل کھنڈ بھیجی۔ اس میں سرسید، رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور میر تراب علی تحصیل دار کے متعلق یوں تحریر ہے: "ان تینوں صاحب نے سرکار کی بہت خیر خواہی کی۔ اگر ہم ان میں سے کسی کی زیادہ تر توصیف کریں تو نسبت سید احمد خاں صاحب کی ہی کر سکتے ہیں کس واسطے کہ یہ صاحب بہت دانا ہیں، ان کی خیر خواہی ایسی جاں فشانی سے ہوئی ہے کہ اس سے زیادہ ہرگز ممکن نہیں۔ اور ہم کو یقین کامل ہے کہ قدر اور منزلت ان کی حکام کی نظر میں اس قدر ہے کہ بلا لحاظ خیر خواہی کے ان کی ترقی عمدہ صدر الصدوری پر جلد ہو گی۔" (لائف اینڈ ورک آف انڈیا، حصہ اول، ص 25)

محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر بجنور کو دیہات زمینداری متصل خورجہ ضلع بلند شہر میں، جس کی جمع مالگزاری پانچ ہزار روپیہ سالانہ سے کم نہ ہو، مرحمت ہونے تجویز فرمائے اور میر تراب علی تحصیلدار کو اوپر عہدہ فائزہ ڈپٹی کلکٹر مجسٹریٹی کے ممتاز فرمایا اور دیہات زمینداری ضلع آگرہ میں، جس کی جمع مالگزاری ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ سے کم نہ ہو، مرحمت ہونے تجویز فرمائے۔[1]

نواب اور چودھریوں کی سپاہ کا حال

نواب کے اچھے سپاہی

میں کچھ نامناسب نہیں سمجھتا اگر اس مقام پر طرفین کی سپاہ کا کچھ حال بیان کروں نواب کی سپاہ میں سب لوگ ملازم تنخواہ دار تھے اور اکثروں کے پاس بندوقیں تھیں اور وہ لوگ بندوق لگانی بھی جانتے تھے بلکہ بہت سے پٹھان بہت اچھے بندوقچی تھے اور تخمیناً چالیس تلنگہ نمک حرام فوج کے، جس کا افسر رام سروپ جمعدار جیل خانہ جات تھا، بہت عمدہ سپاہی قواعد دان تھے اور باقی دھنے جولاہے تھے جنہوں نے سوت کے تار کے سوا کبھی تلوار نہ پکڑی تھی۔ سوار بھی نواب کے بہت اچھے تھے، علی الخصوص چند سوار سرکاری رجمنٹوں کے جو وہاں موجود تھے، وہ ہر طرح کی لڑائی جانتے تھے اور انہوں نے بہت سے سواروں کو اگر قواعد دان نہ بنایا تھا تو سپاہی تو ضرور کر لیا تھا۔[2]

چودھریوں کی مانگی پکار

چودھری صاحبوں کی طرف صرف مانگی پکار تھی کہ جب گنواری بگل گاؤں میں پٹتا تھا سب گنوار جمع ہو جاتے تھے۔ چودھری صاحب، جو اُن کو اکٹھا کرتے تھے، دونوں وقت پوریاں اور کھانا پکا پکا کر دیتے تھے، اس سبب سے چودھری صاحبوں نے بہت زیر باری اٹھائی۔ چودھری پرتاپ سنگھ رئیس تاج پور کے ہاں مدت تک ہزارہا گنوار جمع رہے اور پانچ پانچ چھ چھ ہزار آدمی کو انہوں نے کھانا دیا۔ شیر کوٹ کی چڑھائی میں چودھری پرتاپ سنگھ کے سبب بہت آدمی جمع ہوئے تھے اور در حقیقت دھام پور میں لام کا اس کثرت سے جمع ہونا اور چودھریان کانٹ کا مع اپنی جمعیت کے آنا صرف چودھری پرتاپ سنگھ کا سبب تھا اور اسی جہت سے نہایت زیر باری ان لوگوں کے کھانا دینے میں چودھری صاحب نے اٹھائی۔ علیٰ ہذا القیاس چودھریان ہلدور بھی مدت تک ان گنواروں کے کھانا دینے میں زیر بار رہے میں نے اپنی آنکھ سے ہلدور میں دیکھا کہ دن رات چودھریان ہلدور کے ہاں ان گنواروں کو کھانا دیا جاتا تھا۔ کوئی وقت دن رات میں ایسا نہ تھا کہ دو دو سو تین تین سو

آدمیوں کا غول بیٹھا کھانا کھاتا ہو۔ چودھریان بجنور نے بھی جہاں تک ان سے ہو سکا اس قسم کی زیرباری اٹھائی۔[۵۱]

لالچی اور بزدل گنوار

پھر ان گنواروں کے غول کا یہ حال تھا کہ صرف لوٹ کے لالچ سے جمع ہوتے تھے اور لوٹنے کے سوا اور کچھ مطلب اور دلی مقصد ان کا نہ تھا۔ اطاعت کا یہ حال تھا کہ جو اپنا دل چاہتا تھا وہ کرتے تھے اور کسی چودھری کی بات نہ مانتے تھے بلکہ بارہا چودھریوں کے سامنے سخت کلامی اور بدزبانی سے پیش آتے تھے۔ لاچار چودھریوں کو خود دبنا پڑتا تھا۔ بہادری کا یہ حال تھا کہ جہاں کسی کے غول میں سے کوئی آدمی زخمی ہو کر یا مر کر گرا اور سارا غول بھاگا۔ پھر اگر رسی باندھ کر کھینچو تو نہ کھنچتے تھے۔ بہتیرا کہتے تھے کہ ارے بھائیو، پوریاں تو یوں دوڑ دوڑ کر لیتے تھے اور اب بھاگے جاتے ہو، کوئی نہ سنتا تھا۔ ہتھیار اور سامان کا یہ حال تھا کہ بڑے سے بڑے غول میں آٹھ سات دس بندوقوں سے سوا نہ ہوتی تھیں باقی اکثروں کے پاس برچھی اور ٹوٹی تلوار یا گنڈاسا اور بعضوں کے پاس نری لاٹھی۔[۵۲]

نواب کی اتفاقیہ شکست

نتیجہ اس بیان کا یہ ہے کہ نواب کی دونوں جگہ شکست ہونی ایک اتفاقیہ بات تھی۔ دونوں طرف کے فوجوں کا سچا سچا حال سن کر کوئی عقل مند اس بات پر رائے نہیں دینے کا کہ یہ گنواروں کی بھیڑ نواب کی فوج پر فتح پاتی۔ اصلی سبب ان دونوں جگہ کی فتح کا یہ ہوا کہ اس زمانہ میں نواب کے پاس توپیں صرف دو تھیں اور وہ دونوں شیر کوٹ پر گئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک توپ پھٹ گئی اور ایک گر پڑی۔ احمد اللہ خاں صرف اسی دہشت کے مارے کہ توپوں کا، جو چودھریوں کے پاس ہیں، مقابلہ نہ ہو سکے گا اور آدمیوں کی کثرت سے ڈر کر رات کو گڑھی میں سے بھاگ گیا۔ بجنور میں ناممود خاں کے پاس کوئی توپ نہ تھی۔ جب اس کے کان میں چودھریوں کی توپ کی آواز پہنچی اسی ڈر سے نواب بھاگ گیا کیونکہ اس زمانہ تک توپ کا ڈر بہت تھا اور یہ بات پیچھے تجربہ میں آئی ہے کہ ہندوستانی توپ سے کوئی آدمی نہیں مر سکتا۔[۵۳]

اناڑی گولہ انداز

اب بے اختیار دل چاہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا توپوں کا بھی حال لکھوں۔ طرفین کی توپیں اور گولہ انداز ایسے خوب تھے کہ اگر ہمالیہ پہاڑ نشانہ کی جگہ رکھ کر ان سے کہا جائے کہ اس پر گولہ مارو تو ان سے امید یہی ہے کہ ہمیشہ خطا کرے گا، بلکہ اگر خطا سے بھی خطا نہ کرے تو خطادار ہو گا۔

بلوہ کی شکست کے دن نواب کے گولہ اندازوں نے اس مکان پر جس میں مَیں اور ڈپٹی صاحب تھے ہزار گولہ سے کم نہ مارا ہو گا مگر ایک بھی نہ لگا حالانکہ اس کے سامنے بہت صاف میدان اور بہت اچھا موقع نشانہ لگانے کا تھا۔ جب کہ ہم نے ان کے توپ کے مورچہ پر اپنے مکان سے جزائل اور بندوق کی گولیاں مارنی شروع کیں تب انہوں نے ہمارے مکان کے مقابل سے مورچہ توپ کا اٹھالیا۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ اتنی لڑائیوں میں ایک آدمی بھی توپ کے گولہ سے نہ مرا ہو گا۔★ (۵)

بجنور میں زمانۂ غدر کی عمل داریاں

ایک دوسرے پر ظلم اور زیادتی

اس ضلع میں تین حالتیں گزر گئیں۔ چند روز تعطل عمل داری رہا اور کسی کی عمل داری کو زور و طاقت نہ تھی۔ اس زمانہ میں خیال کرو کہ باہم رعایا نے کس قدر اپنے ہم جنسوں پر ظلم اور زیادتی کی۔ ہزاروں گھر لوٹ لئے اور بیسیوں گاؤں جلا دیئے۔ سینکڑوں آدمی مارے گئے' ہزاروں آدمی لٹ کر فقیر ہو گئے۔ کسی کا مقدور نہ تھا کہ ایک گاؤں میں سے دوسرے گاؤں تک بے خطر راستہ چل سکے۔ (۵)

مسلمانوں کی عمل داری میں بے گناہ ہندوؤں کی ہلاکت

پھر مسلمانوں نے اول اور آخر اس ضلع میں زور پکڑا اور جو بہت بڑے موروثی نواب کہلاتے تھے اور گویا ان ہی کے بزرگوں نے اس ضلع کو بسایا تھا انہوں نے عمل داری کی۔ ان کی عمل داری کا مزا دیکھ لیا کہ کس قدر ہندو اس ضلع کے تباہ اور برباد اور قتل اور غارت ہوئے! بڑے بڑے رئیس اس ضلع کے تباہ و برباد ہو کر جلا وطن ہو گئے۔ بیسیوں ہندو بے گناہ پکڑے گئے اور مارے گئے

★۔ یہاں پر توپ کی موجودگی میں لڑائی کی حکمت عملی کے متعلق مسٹر ولسن جج و سپیشل کمشنر کی ان ہدایات کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا جو انہوں نے چودھری امراؤ سنگھ کو ان جھڑپوں کے دوران لکھیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:
"اہلِ ہند' جنہوں نے توپ نہیں دیکھی' توپ سے بہت ڈرتے ہیں' مگر جب توپ ناواقف کے ہاتھ میں ہے تب وہ توپ ہتھیار نہیں جیسا لوگ خیال کرتے ہیں۔ اگر یہ پٹھان لوگ اہلِ ہنود پر جو توپ لگادیں تو یہ تدبیر کرنی چاہئے کہ دو دو آدمی چاروں طرف پھیل جاؤ اور بیچ میں فاصلہ سو سو قدم کا چھوڑ دو اور چاروں طرف سے ایک ہی وقت گولہ اندازوں پر حملہ کرو جب وہ توپ چلا چکیں۔ جب توپ پچاس قدم رہ جائے تب گویا تمہارے ہاتھ لگ گئی سمجھو۔ مگر جو بھیڑ کی مثال خوف ناک ہو کر ایک ہی جگہ کھڑے ہو جاؤ گے تو تمہارا نقصان عظیم ہو گا ورنہ توپ کچھ خاک بھی نہیں کر سکتی۔" (سرکشی ضلع بجنور' ص 67)

اور مال اسباب گھر سب لٹ گئے۔ مسلمانوں کو جو اس وقت میں ان نوابوں کے ہاتھ سے نقصان نہیں پہنچا یہ بات بھی ایک مصلحت کی تھی کہ وہ بدذات جانتے تھے کہ کسی طرح مسلمان ہمارے برخلاف نہ ہو جائیں۔[1]

ہندوؤں کی عمل داری میں مسلمان جورو بیٹی کی بے عزتی

ان نوابوں کی عمل داری کے درمیان چند روز ہندوؤں کا غلبہ اور زور ہو گیا اور چودھریوں نے اس ضلع میں ان دنوں حکومت کر لی............ ہندوؤں کی حکومت کا مزا چکھ لیا کہ ان کے ہاتھ سے مسلمانوں پر کیا کیا گزرا اور کتنے گھر لٹے اور کتنے گاؤں مسلمانوں کے جلے اور جورو بیٹی تک کی بے عزتی ہوئی۔[2]

سرکار انگلشیہ کی عمل داری میں امن و امان کا دور دورہ

سچ بتاؤ کہ سرکار انگلشیہ نے چون برس اس ضلع میں عمل داری کی، کسی شخص ہندو مسلمان نے کسی قسم کی تکلیف اور ایذا پائی؟ سرکار انگلشیہ کی عمل داری میں ہندو مسلمان سب امن اور آسائش سے رہتے تھے۔[3]

طرفین کی لڑائیوں میں سرکار انگریزی کا مقام

اس امر میں رائے لکھنے کو میں بہت عمدہ بات سمجھتا ہوں کہ یہ لڑائیاں جو ہوئیں آیا لوگوں کے دل میں، جو طرفین کی طرف لڑنے کو جمع ہوتے تھے، یہ بھی خیال تھا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ ہو کر لڑنا سرکار دولت مدار انگریزی کے برخلاف لڑائی کرنی ہے۔ میں اس میں شک نہیں کرتا کہ نواب کے حال و قال اور جو جو کام وہ کرتا تھا ان سے سب کو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ نواب سرکار کے برخلاف ہے اور اس کا دلی ارادہ سرکار کی بدخواہی اور دل کی دعا (کہ خدا اس کی دعا کو اسی پر ڈالے) زوال حکومت سرکار تھا، اور چودھری صاحبوں کا کچھ ارادہ خودسری حکومت اور ملک گیری کا نہ تھا۔ مگر ضلع کے لوگوں کا میری رائے میں یہ حال تھا کہ ان لڑائیوں میں نواب کے ساتھ ہو کر چودھریوں سے لڑنے کو سرکار سے لڑنا یا برخلاف سرکار کے لڑائی کرنی نہیں سمجھتے تھے۔ سب کے خیالوں میں چودھریوں اور نواب کا مقابلہ تھا جس میں گویا سرکار بیچ میں سے علیحدہ تھی۔ اور اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جو لوگ چودھری صاحبوں کے ساتھ ان لڑائیوں میں شریک تھے اپنے تئیں چودھری صاحبوں کا حامی اور مددگار سمجھتے تھے، سرکار دولت مدار انگریزی

سب کے دلوں سے الگ تھی۔[1]★

غدر کے اسباب

ہندوستانی فوج کا غرور و تکبر

ہماری گورنمنٹ کا انتظام فوج ہمیشہ قابل اعتراض کے تھا۔ فوج انگلشیہ کی کمی ہمیشہ اعتراض کی جگہ تھی...... ہم نے مانا کہ ہندوستانی فوج سرکار کی بڑی تابع دار اور خیر خواہ اور جاں نثار تھی مگر یہ کہاں سے عہد ہو گیا تھا کہ کبھی اس فوج کی خلافِ مرضی حکم نہ ہو گا اور کسی حکم سے یہ فوج آزردہ خاطر نہ ہو گی...... علاوہ اس کے ہندوستانی فوج کو بھی بے انتہا غرور تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے' فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ تمام ہندوستان کی فتوحات صرف اپنی تلوار کے زور سے جانتے تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ برما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے۔ علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اب ان کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تکبر کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور مقام پر تکرار کرنے لگتی۔[2]

نئے کارتوسوں کے مسئلہ پر پلٹن کی موقوفی

ایسے وقت میں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور و تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے خواہ مخواہ سرکار کو ماننا پڑے گا' ان کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا۔ انہوں نے اس کے کاٹنے سے انکار کیا۔ جب بارک پور کی

★۔ طرفین کی ان لڑائیوں میں سرکار انگریز کی اپنی سوچ کیا تھی' یہ جے لارنس کی یادداشت مورخہ 18 اگست 1857ء سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "دلی پر ہمارا قبضہ اولین ہونا چاہئے اور جب تک ہم اس پر قابض نہیں ہوتے میری رائے میں کسی اور اہم بات کی طرف توجہ نہیں دینی چاہئے اور گنگا پار تو یقیناً نہیں اترنا چاہئے' ایسا کرنا محض پاگل پن ہو گا .... اور یقیناً یہ بات اس سے زیادہ روہیل کھنڈ پر حملہ کرنے کے سلسلے میں صادق آتی ہے۔ اگر مسلمان اور ہندو لڑتے ہیں تو یہ جتنا بھی لڑیں ہمارے لئے بہتر ہی ہے۔ انہیں آپس میں ایک دوسرے کو ذبح کرنے دیجئے اور دلی پر قبضہ کے بعد ہمارے لئے پورے روہیل کھنڈ پر دوبارہ فتح پانا مشکل نہ ہو گا۔" (بحوالہ سرکشی ضلع بجنور مرتبہ شرافت حسین مرزا' ص 339)

پلٹن اس جرم میں موقوف ہو گئی اور حکم سنایا گیا تو تمام فوج نہایت رنجیدہ ہوئی کیونکہ وہ یوں سمجھتے تھے کہ بسبب تخلل مذہب کے بارک پور کی پلٹن کا کچھ قصور نہ تھا' وہ محض بے قصور اور صرف سرکار کی ناانصافی سے موقوف ہوئی ہے۔ تمام فوج نہایت رنجیدہ تھی کہ ہم نے سرکار کے ساتھ رفاقتیں کیں' اپنے سر کٹائے' سرکار کو ملک در ملک فتح کر دیئے اور سرکار ہمارے مذہب لینے کے درپے ہوئی اور واجبی بات پر موقوف کر دیا۔[1]

وفادار سپاہ کی سزاؤں پر رنجیدگی کا ردِ عمل

دفعتاً تقدیر سے کم بخت مئی ۱۸۵۷ء کی آ گئی۔ میرٹھ میں سپاہ کو بہت سخت سزا دی گئی جس کو ہر ایک عقل مند بہت برا اور ناپسند جانتا ہے۔ اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا' بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھ کر روتے تھے۔ وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلہ میں جو اُن کو انعام ملا تھا' دیکھتے تھے اور علاوہ اس کے ان کا بے انتہا غرور' جو اُن کے سر میں تھا اور جس کے سبب وہ اپنے تئیں ایک بہت ہی بڑا سمجھتے تھے' ان کو زیادہ رنج دیتا تھا۔ پھر سب فوج مقیم میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ یا ہم کو کارتوس کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہو گا۔ اسی رنج اور غصہ کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کی نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملنے کی۔ اس فوج کو کیا چارہ رہا تھا اس حرکت کے بعد بجز اس کے کہ جہاں تک ہو سکے مفسدے پورے کرے۔ جہاں جہاں فوج میں یہ خبر پہنچی تمام فوج زیادہ تر رنجیدہ ہوئی۔ میرٹھ کی فوج سے جو حرکت ہوئی تھی اس سے تمام ہندوستانی فوج نے یقین جان لیا تھا کہ اب سرکار کو ہندوستانی فوج کا اعتبار نہ رہا' سرکار وقت پاکر سب کو سزا دے گی.........

......سب نے فساد پر کمر باندھ لی اور بگڑتے گئے' جن کے دل میں کچھ فساد نہ تھا وہ بھی بسبب شامل ہونے فوج کے اس جتھہ سے الگ نہ ہو سکے۔ ہندوستانی رعایا جانتی تھی کہ سرکار کے پاس جو کچھ ہے وہ ہندوستانی فوج ہے۔ جب تمام فوج کا بگڑنا مشہور ہو گیا سب نے سر اٹھایا' عمل داری کا ڈر دلوں سے جاتا رہا اور سب جگہ فساد برپا ہو گیا۔[2]

سارے فساد کی اصل جڑ مگر اس کا نتیجہ؟

اصلی سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں' اور یہ سمجھ میری کچھ وہمی اور قیاسی ہی نہیں ہے بلکہ اگلے زمانے کے بہت سے عقل مندوں کی رائے کا اس بات پر اتفاق ہو چکا ہے اور تمام مصنفین پر نسپل آف گورنمنٹ کے اس

باب میں میرے طرف دار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں.......... بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مداخلت غیر ممکن اور بے فائدہ محض تھی مگر لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں اور جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔[11]

باایں ہمہ گورنمنٹ کا بغاوت نے کیا کر لیا؟ ایک گورا ولایت سے ہندوستان میں قدم نہیں رکھنے پایا تھا کہ اس سرے سے اس سرے تک صاف ہو گیا اور امن ہو گیا۔[12]

غدر اور ہندوستانی مسلمان

کارتوس کاٹنے کے گناہ کا درجہ

یہ تمام بغاوت جو ہوئی' بنا اس کی کارتوس تھا۔ کارتوس کاٹنے سے مسلمانوں کے مذہب کا کیا نقصان تھا؟ ہمارے مذہب میں اہلِ کتاب کا کھانا کھانا درست ہے' ان کا ذبیحہ ہم پر حلال ہے۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ اس میں سؤر کی چربی ہوگی ' تو بھی ہمارا کیا نقصان تھا؟ ہمارے ہاں شرع میں ثابت ہو چکا ہے کہ جس چیز کی حرمت اور ناپاکی معلوم نہ ہو وہ چیز حلال اور پاک کا حکم رکھتی ہے۔ اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ اس میں یقیناً سؤر کی چربی تھی تو اس کے کاٹنے سے بھی مسلمانوں کا دین نہیں جاتا۔ صرف اتنی بات تھی کہ گناہ ہوتا' سو وہ گناہ شرعاً بہت درجے کم تھا ان گناہوں سے جو اس غدر میں بدذات مفسدوں نے کیے۔[13]

مسلمانوں کا خون بمقابلہ عیسائیوں کا خون

اس نازک وقت میں سب ہندوستان کی رعایا کو واجب تھا کہ سرکارِ انگلشیہ کی طرف داری کرتی اور جو حق عمل داری سرکار کا ان کے ذمہ تھا اس کو ادا کرتے۔ اور طرف داری کے یہ معنی ہیں کہ 'جہاں تک ہو سکتا' سرکار کی امداد و اعانت کرتے اور مخالفینِ سرکار کو مدد نہ دیتے۔[14]

جن مسلمانوں نے ہماری سرکار کی نمک حرامی اور بدخواہی کی میں ان کا طرف دار نہیں ہوں اور میں ان سے بہت زیادہ ناراض ہوں اور حد سے زیادہ برا جانتا ہوں کیونکہ یہ ہنگامہ ایسا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے مذہب کے بموجب عیسائیوں کے ساتھ رہنا تھا جو اہلِ کتاب اور ہمارے مذہبی بھائی بند ہیں' نبیوں پر ایمان لائے ہیں' خدا کے دیئے احکام اور خدا کی دی ہوئی کتاب اپنے پاس رکھتے ہیں جس کا تصدیق کرنا اور جس پر ایمان لانا ہمارا عین ایمان ہے۔ پھر اس ہنگامہ میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا وہیں مسلمانوں کا بھی خون گرنا چاہیے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا

اس نے علاوہ نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو ہر ایک رعیت پر واجب ہے' اپنے مذہب کے بھی بر خلاف کیا۔ پھر بلا شبہ وہ اس لائق ہیں کہ زیادہ تر ان سے علاوہ الفن ہوا جائے۔(۱)

محمدی جھنڈے کی مذہبی حیثیت کا تعین

جان لینا چاہئے کہ جو بعضے متکلمین اور مصنفین کتب بغاوت خیال کرتے ہیں کہ محمدی جھنڈے کا کھڑا ہونا کوئی مذہبی بات ہے' یہ محض غلط ہے۔ مذہب میں اس طرح پر اس کی کچھ اصل نہیں۔ ایک قدیم دستور تمام قوموں کا ہے کہ جب دو فوجیں جمع ہوتی ہیں' ان فوجوں میں نشان ہوتے ہیں۔ ہر ایک قوم کی فوج کا نشان اسی کے نام سے مشہور ہوتا ہے۔ یہ جو مشہور کر رکھا ہے کہ واسطے قائم کرنے جہاد کے محمدی جھنڈا کھڑا ہوتا ہے' محض بے اصل بات ہے۔ اس تمام ہنگامہ میں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ جہاں دو غول واسطے آپس کی لڑائی کے جمع ہوئے ہیں سب کے ساتھ نشان تھے۔ ہندو کیا اور مسلمان کیا' یہاں تک کہ جب مسلمان ایک غول نے دوسرے غول مسلمان پر چڑھائی کی تب بھی دونوں کے ساتھ نشان تھے مگر یہ مسلمانوں کی بدبختی تھی کہ جہاں جہاں مسلمانوں کے غول میں نشان تھے ان کو متکلمین اور مصنفین کتب بغاوت نے ایک مذہبی بات قرار دی اور "محمدی جھنڈا" اس کا نام اس طرح پر لیا کہ جس سے ایک مذہبی جہاد کی بات پائی جائے حالانکہ کیسا جہاد کیسا محمدی جھنڈا؟ جتنے مقدمہ آپس کی لوٹ اور غارت کے قائم ہوئے ان میں سے بہت سوں میں یہی مذکور ہوا کہ خداوند' مسلمانوں نے تو ہم پر جہاد کیا تھا! وہ تو گاجی بنے تھے ہجور! انہوں نے محمدی جھنڈا کھڑا کیا تھا! ہمارے مہربان متکلمین اور مصنفین کتب بغاوت نے اصلی حال پر غور و فکر نہ کر (کے) ناحق جہاد کا مسلمانوں پر غل مچا دیا۔(۲)

وہابیوں کی خیر خواہی

ہندوستان کے وہابیوں کی نسبت تجربہ کی رو سے میری یہ رائے ہے کہ گورنمنٹ پر جہاد نہ کرنے میں ان کی اور ہندوستان کے اور مسلمانوں کی ایک رائے ہے اور جس طرح اور سب مسلمان اس کو حرام سمجھتے ہیں اسی طرح یہ بھی حرام سمجھتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جب بخت خاں دہلی میں تھا اور اس نے دہلی کے مولویوں کو جواز جہاد کے فتوے پر مجبور کیا تھا تو دہلی کے دو پکے وہابیوں نے ہی نہایت جرأت کے ساتھ بخت خاں کے مقابلہ یہ بات کہی تھی کہ گورنمنٹ پر جہاد جائز نہیں ہے حالانکہ بخت خاں کی فوج اس کی طرف دار تھی' اور ان وہابی شخصوں میں ایک بڑا نامی گرامی فاضل تھا جس کو دہلی میں حد سے زیادہ عزت حاصل تھی۔(۳)

مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے سرغنہ بخت خاں

نے میں ہنگامہ غدر میں طلب کیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ اس زمانہ میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں مگر مولوی محبوب علی صاحب نے صاف انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں' ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور طرہ بریں یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور بچوں کو دی تھی اس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی۔[1]

مجھ کو یاد ہے کہ غدر کے زمانہ میں وہابیوں میں سے صرف ایک ہی شخص باغیوں کے شریکِ حال ہوا تھا اور وہ بھی اس بات میں مجبور تھا۔[2]

غدر کے مسلمان شرکا کی بد کرداریاں

جاہل' بے علم' بد معاش اور واہی مولوی

ایک عجیب ماجرا ہے کہ اس ہنگامہ میں نہایت بد معاش اور جاہل بے علم آدمی' جو مولوی کے نام سے مشہور تھے' نہ اس سبب سے کہ وہ خود پڑھے لکھے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ دادوں میں کوئی مولوی تھا وہ بھی مولوی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے' ان کو تمام اخباروں میں اس طرح چھاپا گیا جیسے کہ کوئی سچ مچ کا مولوی اور مسلمانوں کا بڑا عالم اور بڑا خدا پرست ہے۔ کسی کو ایک بڑا فقیر کر کے لکھا گیا اور فلاں شاہ اور ڈھمک شاہ اس کا نام چھاپا۔ ہمارے حکام جب ان ناموں کو دیکھتے ہوں گے تو خیال کرتے ہوں گے کہ اوہ ہو' بڑے بڑے مولویوں اور خدا پرستوں نے فساد کیا ہے' حالانکہ وہ لوگ محض جاہل اور بے علم اور بد معاش اور واہی آدمی تھے۔ کوئی مسلمان ان کو اچھا نہیں جانتا تھا اور ان میں سے کوئی شخص مسلمانوں میں مذہب کی باتوں میں مقتدا اور پیشوا اور مولوی نہ تھا۔ جس قدر کہ اچھے اور خدا پرست اور سچ مچ کے مولوی اور درویش تھے ان میں سے کوئی شخص اس فساد میں شریک نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ مفسدوں کو برا اور اس فساد کو بے جا جانتے تھے۔[3]

میں نہیں دیکھتا کہ اس تمام ہنگامہ میں کوئی خدا پرست آدمی یا کوئی سچ مچ کا مولوی شریک ہوا ہو۔ بجز ایک شخص کے' اور میں نہیں جانتا کہ اس پر کیا آفت پڑی۔ شاید اس کی سمجھ میں غلطی پڑی کیونکہ خطا ہونا انسان سے کچھ بعید نہیں۔[4]

بد عہد' نمک حرام' بے ایمان' کافر مُفسِد سیاہ

اس ہنگامہ میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے موافق نہیں ہوئی۔[5]

اس ہنگامہ میں برابر بدعہدی ہوتی رہی' سپاہ نمک حرام عہد کر کے پھر گئی' بدمعاشوں نے عہد کر کے دغا سے توڑ ڈالا۔[9] بعض جگہ اس ہنگامہ میں بعضے عیسائیوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں' ہم کو قتل مت کرو" اور بعضے ہو گئے اور ان بے ایمان مفسدوں اور کافروں نے ان کو مار ڈالا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان عیسائیوں نے ظاہر میں اقرار کیا اپنی جان کے ڈر سے' دل سے وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر ہمارے مذہب میں ایسے شخص کا بھی قتل کرنا نہایت گناہِ عظیم قریبِ کفر ہے۔[9]

پاجی' شراب خور' تماش بین' بدذاتوں کے نعرۂ جہاد کی حرام زدگی

جو لوگ عقلمند ہیں وہ دیکھیں گے کہ خود مسلمان اس ہنگامہ کے بر خلاف اور متاثر اور محاربہ پر موجود تھے اور اس بات سے خود سمجھ لیں گے کہ آیا انصاف اجازت دیتا ہے کہ اس قسم کے بدمعاشوں کے ہنگاموں کو مسلمانوں کا مذہبی جہاد کہا جائے۔[9]

جہاد کا مسئلہ مسلمانوں میں دغا اور بے ایمانی اور غدر اور بے رحمی نہیں ہے جیسا کہ اس ہنگامہ میں ہوا۔ کوئی شخص بھی اس ہنگامہ مفسدی اور بے ایمانی اور بے رحمی اور خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام کی نافرمانی کو جہاد نہیں کہہ سکتا۔[4]

عجب تعجب ہے اس شخص پر جو کہ اس ہنگامۂ قتل و غارت کو مسلمانوں کا مذہبی جہاد کہے۔[5]

میری رائے میں کبھی مسلمانوں کے خیال میں بھی نہیں آیا کہ باہم متفق ہو کر غیر مذہب کے حاکموں پر جہاد کریں' اور جاہلوں اور مفسدوں کا غلغلہ ڈال دینا کہ جہاد ہے جہاد ہے اور ایک نعرۂ حیدری پکارتے پھرنا قابلِ اعتبار کے نہیں۔[6]

ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا............ جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے اور کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے.......... چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے کو اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرام زدگیوں میں سے ایک حرام زدگی تھی' نہ واقع میں جہاد۔[7]

مفسدوں نے صرف فساد مچانے اور غلغلہ ڈالنے اور ہنگامہ کرنے کو اپنے فسادوں کو جھوٹا "جہاد" کے نام سے مشہور کیا تھا۔ در حقیقت کوئی مسلمان ان بغاوتوں کو جہاد خیال نہیں کرتا تھا۔[8]

حاصل یہ کہ ان فسادات کو مذہبی باتوں سے کیا علاقہ ہے؟ ایک تقدیری فساد تھا وہ ہوا' ہر ایک

نے غدر اپنے رنج و تکلیف کے گو وہ خیال ان کا غلط ہو' فساد کیا۔[1]

غدر میں شامل چند نامی بد معاشوں کا ماضی

نا محمود خاں اور اس کا خاندان

نا محمود خاں پوتا ہے نجیب خاں کا جو احمد شاہ کے وقت میں' یعنی ۱۷۴۸ء میں' دوندے خاں کا نوکر تھا اور اس کی طرف سے پرگنہ دارانگر کی تحصیل کرتا تھا۔ اس نے بہت سے لوگ اپنے ساتھ جمع کیے اور ان پرگنہ جات پر' جو اب ضلع بجنور میں ہیں' قبضہ کر لیا۔ پھر دوندے خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی' اس سبب سے مستقل مالک اس ملک کا ہو گیا اور بادشاہ کے دربار تک بھی رسائی کر لی۔ جب عالمگیر ثانی تخت پر بیٹھا' یعنی ۱۷۵۳ء میں' تو نجیب خاں نے جیت سنگھ ڈکیت کو مار کر کچھ گنگا پار کا علاقہ بھی' جو اب ضلع سہارن پور میں شامل ہے' اپنے ملک میں ملا لیا اور بادشاہ کے دربار سے اس کو نجیب الدولہ امیر الامرا کا خطاب ملا' اور ۱۷۵۵ء میں اس نے قلعہ پتھر گڑھ بنایا اور نجیب آباد بسایا۔[2]

جب نجیب الدولہ ۱۷۷۰ میں مر گیا اس کا بیٹا ضابطہ خاں اس کی جگہ بیٹھا۔ نواب شجاع الدولہ لکھنؤ والے نے بسبب نہ ادا ہونے روپیہ معاملہ مرہٹوں کے' جس کا ضامن شجاع الدولہ ہو گیا تھا' ضابطہ خاں کو ۱۷۷۴ء میں اس ملک سے خارج کر دیا۔ ضابطہ خاں نے نواب عبدالاحد کی سفارش سے ۱۷۷۶ء میں باونی سہارن پور کی سند بادشاہ سے حاصل کی اور غوث گڑھ میں رہنا اختیار کیا۔ اس کے مرنے کے بعد غلام قادر خاں اس کا بیٹا اس کی جگہ بیٹھا اور اس نے شاہ عالم کو اندھا کیا۔ مہاراجہ سندھیا نے اس جرم میں اس کو بعد مقابلہ گرفتار کیا اور لوہے کے پنجرہ میں قید کر کے اور ایک ایک عضو جدا جدا کر کے مار ڈالا۔ معین الدین خاں عرف بھنبو خاں' غلام قادر کا بھائی' بھاگ کر پنجاب چلا گیا۔[3]

جب سرکار دولت مدار انگریزی نے اضلاع دہلی کو فتح کیا تب بھنبو خاں کو بلا کر بہت خاطر کی اور پانچ ہزار روپیہ مہینے کی پنشن مقرر کر کے بریلی میں رہنے کا حکم دیا' اور پھر مسٹر کول بروک صاحب بہادر کی رپورٹ سے ۱۸۱۲ء میں نجیب آباد میں آباد ہوا۔ اس کے مرنے کے بعد سرکار دولت مدار انگریزی نے بنظر ترحم محمود خاں اور جلال الدین خاں اس کے بیٹے اور بیٹیوں کے لئے ہزار روپیہ ماہوار پنشن مقرر کی اور ہر ایک شخص کو اس خاندان میں سے بہت بڑے بڑے معزز عہدے عطا فرمائے کہ تمام خاندان بکمال عزت اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ بھنبو خاں نے اس زمانہ

میں جب کہ ایک جعلی غلام قادر خاں دہلی میں اکبر بادشاہ کے دربار میں آیا تھا' یعنی ۱۲۴۷ھ بمطابق ۱۸۳۱ء کے بادشاہ کے ہاں رسائی پیدا کی اور اپنے بیٹوں کے نام خطاب حاصل کیا۔ اب اس غدر میں اس خاندان نے سرکار دولت مدار انگریزی سے نمک حرامی کی۔(۱۱)

مسٹر کول بروک صاحب یہاں ۱۸۱۲ء میں ایک بہت بڑا کانٹوں دار درخت ہو گئے تھے یعنی بسا گئے تھے اجڑے ہوئے اور جلاوطن ہوئے بھنبو خاں باپ نا محمود خاں کو نجیب آباد میں جس کے سبب گویا یہ برباد ہوا ہوا خاندان پھر لوگوں کی نظروں میں سا گیا تھا۔(۷)

مولوی منو

یہ منو پوتا تھا مولوی وجیہہ الدین کا اور بھتیجا تھا مولوی اسماعیل کا جو............ شاہ اودھ کی طرف سے سفیر ہو کر لندن گئے تھے اور وہاں سے مراجعت کے وقت مرے۔ اس منو کا اصلی نام وہاج الدین تھا۔ وضع اس کی ایسی تھی جیسی اچھے بد معاشوں کی ہوتی ہے۔ مطلق لکھا پڑھا نہ تھا' یہاں تک کہ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ بد معاشی کا یہ حال تھا کہ جرائم سنگین میں دو مرتبہ قید ہو چکا تھا' ایک دفعہ دس برس' ایک دفعہ سات برس۔ پچھلی قید جیل خانہ میں پوری کی تھی۔ اب ہماری کتاب پڑھنے والے خود انصاف کر لیں گے کہ یہ شخص مسلمانوں کے مذہب کا مولوی اور خدا پرست تھا یا بد معاش؟(۳)

ماڑے خاں

ماڑے قوم کا شیخ اور قدیمی بد معاش آدمی ہے۔ نصف قصبہ شیر کوٹ کا اس کے بڑوں کی زمینداری میں تھا' اس سبب سے اس کے بڑے چودھری کہلاتے تھے مگر یہ شیخ بہت مفلس اور بد معاش ہو گیا تھا۔ چودھری پرتاپ سنگھ اس کی ماں کو ڈیڑھ روپیہ مہینہ دیتے تھے۔ ماڑے بد معاش مارچ ۱۸۵۵ء میں بہ اجلاس مسٹر چارلس جان ونگفیلڈ صاحب بہادر کے بہ علت بد معاشی بہ میعاد ایک سال قید ہوا تھا۔(۹)

دلی کے بادشاہ کی قدر و قیمت

بے وقعت بادشاہ

دلی کے بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔(۵)

دلی میں ایک بڑا گروہ مولویوں اور ان کے تابعین کا ایسا تھا کہ وہ مذہب کی رو سے معزول

بادشاہ دِلّی کو بہت برا اور بدعتی سمجھتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دلی کی جن مسجدوں میں بادشاہ کا قبض و دخل اور اہتمام ہے ان مسجدوں میں نماز درست نہیں۔[1]

خاص دِلّی کے اور اس کے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے۔[2]

دِلّی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزو مند نہ تھا۔ اس خاندان کی لغو اور بے ہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں سے اس کی قدر اور منزلت گرا دی تھی۔[3]

مالیخولیا والا آدمی

دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابع دار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا۔[4]

دلی کا معزول بادشاہ ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں' اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے' ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہے سے کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو تعجب نہیں۔[5]

فوج کا بادشاہ سے رجوع کا پس منظر

فوج باغی کا پہلے سے دلی کے معزول بادشاہ سے سازش کرنا محض بے اصل ہے۔[6]

بے شک دلی کا بادشاہ بھوبل میں کی ایک چنگاری تھا جس نے ہوا کے زور سے اڑ کر تمام ہندوستان کو جلا دیا۔[7]

بلاشبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی مگر جب اس نے سرکار سے بگاڑ دی تھی تو دِلّی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا کہ جس کی طرف فوج رجوع کرتی۔ اس میں کچھ پہلے سے سازش کی حاجت نہ تھی۔[8]

ہندوستان کا بہت قدیم قاعدہ چلا آیا ہے کہ جب دارالسلطنت پر کوئی بادشاہ' خواہ ازروئے استحقاق کے اور خواہ بغیر استحقاق کے' قائم ہوا سب سردار ملکوں کے اس کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس ہنگامہ میں بھی یہی ہوا کہ جب دلی کا بادشاہ تخت پر بیٹھا اور ملکوں میں خبر پہنچی کہ دلی کے بادشاہ نے تخت سنبھالا سب نے بادشاہ کی طرف رجوع کی۔ جبکہ دلی کا بادشاہ پکڑا گیا اور وہ دارالسلطنت ہماری گورنمنٹ کے قبضہ میں آیا سب کو یقین تھا کہ جملہ مفسد' جنہوں نے سر اٹھایا ہے' اطاعت کریں گے۔[9]

غدر کے منفی اثرات

مسلمانوں کے خاندانوں کی بربادی

غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے وہ بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمان اور مسلمانوں کے خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔[4]

قانونِ اسلحہ کا اجرا

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جو گورنمنٹ نے تمام ہندوستان سے ہتھیار چھین لئے اور بغیر لائسنس کے کسی کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں دی اس میں گورنمنٹ کا کچھ قصور ہی نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کے اعمال کی سزا ہے جو انہوں نے غدر ۱۸۵۷ء میں کیئے تھے۔ ہر ایک انصاف کرنے والا سمجھتا ہو گا کہ ہندوستانیوں نے اپنی بد اعمالی ایسے درجہ کو پہنچادی تھی کہ گورنمنٹ کو بمجبور قانون اسلحہ کا جاری کرنا پڑا تھا۔[5]

ملکی ترقی ایک صدی پیچھے

غدر ۱۸۵۷ء جسے مسٹر "کے" کے نظریہ کے مطابق جنگِ سپاہ کہنے میں حق بجانب ہوں اور جو چند افسروں کی غلطیوں کے باعث واقع ہوا' اس نے ہندوستان کی ترقی کو ایک صدی پیچھے دھکیل دیا۔ اگر غدر نہ ہوا ہوتا تو سپاہیانہ مزاج رکھنے والے ہمارے سینکڑوں جوان والنٹیر ہوتے قانون اسلحہ کا جاری نہ ہوتا اور ہم میں سے بہت سے فوج میں کیپٹن اور کرنل اور جرنیل ہوتے۔[5]

اختتام حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی

کمپنی کی حکومت کی شائستگی

ابتدائے حکومت انگریزی سے لغایت ۱۸۵۸ء تم سب لوگوں نے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں اپنی زندگی بسر کی۔ حق یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت شائستگی اور نرمی اور بحفاظت مذاہب مختلف حکومت کی۔ اس کی حکومت میں بجز اس کے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ بادشاہانہ حکومت نہ تھی اور جس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان میں ہو۔[4]

ملکہ معظمہ کی حکومت سے حقیقی تبدیلی

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد .... بموجب شرائط برٹش کانسٹی ٹیوشن ملکہ معظمہ نے خود اپنے

ہاتھ میں عنانِ حکومت لی اور ۱۸۵۸ء کے مشہور اشتہار کے ذریعہ سے مشتہر کیا۔ میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو کہ ہندوستان کے طریقۂ حکومت میں جو یہ تبدیلی واقع ہوئی اس کو یوں ہی برائے نام خیال کرتے ہیں، کیونکہ جو کوئی ہندوستان کی اُس زمانہ کی تاریخ سے واقف ہے جانتا ہے کہ سوداگروں کی جماعت کے ہاتھ سے خواہ وہ کتنے ہی خلائق دوست اور اشراف اور کارکن کیوں نہ ہوں، مالکِ تخت و تاج کے ہاتھ میں حکومت چلے جانے سے ایک حقیقی اور عظیم تبدیلی واقع ہوئی۔ ①★

★ ملکہ وکٹوریہ نے جو اشتہار جاری کیا اس میں معافی کے متعلق یوں کہا گیا: "بعض مفسدوں نے جھوٹ موٹ افواہیں اڑا کر اپنے ہم وطنوں کو ورغلایا، ان سے بغاوت فاش کرائی اور ملک ہند پر ایک بلا نازل کرائی۔ ہم کو نہایت افسوس ہوا اور ہمارے اقتدار کی کیفیت تو لوگوں کو فرو کرنے فساد باغیوں میں بیچ میدانِ کارزار معلوم ہو گئی ہے لیکن اب ہمارا یہ منشا ہے کہ ان لوگوں کا عفو جرائم کر کے، جو اس طرح دھوکہ کھا گئے ہیں اور پھر اطاعت میں آنا چاہتے ہیں، اپنا اظہار ترحم کریں۔ اس نیت سے کہ آئندہ زیادہ خوں ریزی نہ ہونے پائے اور ہمارے ملک ہند میں جلدی امن و امان ہو جائے ہمارے قائم مقام اور گورنر جنرل بہادر نے ایک علاقے میں، کہ جہاں لوگوں نے ان ایام غدر مکروہ میں جرم مخالف سرکار کئے تھے ان میں اکثروں کو مُشتہر صدر عفو قصورات کا بشرائط مخصوص کیا ہے اور جن لوگوں کی تقاصیر نے ان کو احاطہ ترحم سے باہر کر دیا ہے ان کی سزاؤں کی بھی تشریح کر دی گئی ہے چنانچہ ہم اپنے قائم مقام اور گورنر جنرل کے اس عمل مذکورہ کو پذیرا اور قبول کرتے ہیں۔ علاوہ اس کے حسب ذیل اعلان فرماتے ہیں یعنی سوائے ان لوگوں کے جن کی نسبت ثابت ہوا یا اب ثابت ہو کہ وہ رعیت سرکار انگریزی کے قتل میں بذاتہ شریک ہوئے باقی اَور جملہ ملزموں کی نسبت اظہار ترحم کیا جائے گا مگر بہ نسبت شرکائے قتل کے انصاف مقتضی اس بات کا ہے کہ ان پر ترحم نہ ہو۔ جن لوگوں نے جان بوجھ کر قاتلوں کو پناہ دی ہو یا جو لوگ باغیوں کے سردار ہوئے یا ترغیب بغاوت دی ہو ان کی نسبت صرف یہی وعدہ ہو سکتا ہے کہ ان کی جاں بخشی ہو گی لیکن ایسے لوگوں کی تجویز سزا میں ان سب احوال پر جن کے اعتبار سے وہ اپنی اطاعت سے پھر گئے کامل غور کیا جائے گا اور ان لوگوں کی نسبت جو بے سوچے مفسدوں کی جھوٹی باتوں میں آکر مجرم ہو گئے بڑی رعایت کی جائے گی۔ باقی اَور سبھوں سے جو سرکار کے مقابل ہتھیار بند ہیں بموجب اس قرطاس کے وعدہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں اور اپنے اپنے پیشہ صلح و سداد میں مصروف ہوں تو ان کے قصورات جو ہماری نسبت اور ہماری سلطنت اور منزلت کی نسبت سرزد ہوئے بلا شرط معاف اور در گزر اور فراموش کرا دیئے جائیں گے۔ ہماری یہ مرضی شاہانہ ہے کہ رحم اور عفو کی شرائط مذکور ان سبھوں سے متعلق ہوں جو قبل از تاریخ کیم جنوری 1859ء شرائط مذکور کی تعمیل کریں۔" (جنگِ آزادی 1857ء (محمد ایوب قادری) ص 499 تا 501)

جس وقت کمپنی کی عمل داری گئی اور ملکہ معظمہ کے ہاتھ میں آئی اس وقت پارلیمینٹ سے ایک قانون پاس ہوا جس میں یہ لکھا ہے کہ تمام رعایا خواہ گورا ہو یا کالا' خواہ یورپین ہو یا کوئی' سب مساوی ہیں اور عہدے پانے کے مستحق ہیں' اس کے بعد ملکہ معظمہ کا ایک اشتہار اسی وعدہ کا جاری ہوا اور دوبارہ وعدہ مستحکم کیا گیا۔[۹]

ملکہ معظّمہ کے اشتہارِ معافی پر یادگار جشن

اشتہار کا الہام سے اجرا' ملکہ کے سر پر خدا کا ہاتھ

خدا ہمیشہ ہماری ملکہ معظمہ وکٹوریہ کا حافظ ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا خوبی اس پُر رحم اشتہار کی جو ہماری ملکہ معظمہ نے جاری کیا۔ بے شک ہماری ملکہ معظمہ کے سر پر خدا کا ہاتھ ہے۔ بے شک یہ پُر رحم اشتہار الہام سے جاری ہوا۔[۲]

میری کمال آرزو خدائے تعالیٰ سے یہ ہے کہ ہماری گورنمنٹ اور ہندوستان کی رعایا ایسا اتحاد اور اتفاق پیدا کریں کہ گورنمنٹ و رعایا سب مل کر انتظامِ ملکی میں ایک رائے ہو جائیں۔ اس سبب سے جو بات رعایا اور گورنمنٹ کے اتحاد کی میں دیکھتا ہوں میرا دل بہت خوش ہوتا ہے اور چاہتا ہوں کہ اس کا یادگار رہے' اس لئے تذکرہ اس شکریہ کا' جو مراد آباد کے مسلمانوں نے ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء روز پنج شنبہ کو واسطے امن و امان ہندوستان کے کیا' ہمیشہ کی یادگاری کے لئے لکھتا ہوں۔[۳]★

دعائے شکریہ کا اہتمام

اس شہر کے سب مسلمانوں نے باہم متفق ہو کر پانچ سو روپیہ واسطے خیرات اور روشنی کے بطور چندہ جمع کئے اور یہ بات قرار دی کہ ایک مسجد میں' جو بہت وسیع میدان میں ہو' سب لوگ جمع ہوں اور خدا کا شکر ادا کریں اور نماز کے بعد وہ دعائے شکریہ' جو خاص اس امر کے لئے مرتب ہوئی تھی' پڑھی جائے۔ چنانچہ اسی تاریخ چار بجے اس مسجد میں' جو درگاہ شاہ بلاقی کے پاس ہے' اس شہر کے مسلمان جمع ہوئے۔ اول سب نے نماز پڑھی اور سجدہ شکر کا اپنے مذہب کے موافق درگاہِ باری تعالیٰ میں ادا کیا اور سب لوگوں نے متفق ہو کر ایک شخص کو واسطے پڑھنے دعا کے مقرر کیا۔ وہ شخص✻ مسجد کے اونچے کونے پر کھڑا ہوا اور تمام مسلمان' جس قدر حاضر تھے' اس کے گرد

★۔ حالی لکھتے ہیں: "اس اشتہار کے مشتہر ہونے پر سرسید نے مراد آباد کے مسلمانوں کو مطلع کیا کہ ملکہ معظمہ کی اس عنایت و مہربانی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے۔ تمام مسلمانوں نے بہت خوشی سے قبول کیا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص ۹۱)

✻۔ یعنی خود سرسید (حالی' حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص ۹۱)

جمع ہوئے۔ اس نے اس دعا کو نہایت دل سے پڑھا۔ ہر فقرہ جب ختم ہوتا تھا سب لوگ نہایت دلی انکسار سے کہتے تھے "آمین"۔ سب نے مل کر ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام سلطنتہا کے لئے اور پھر وائسرائے لارڈ کیننگ کے لئے دل سے دعا مانگی اور مسٹر ریڈ صاحب بہادر ممبر صدر بورڈ کو' جن کا رحم سب میں مشہور ہے' اپنی دعا میں شامل کیا۔ جس وقت یہ دعا پڑھی گئی تھی میرے اندازہ میں بارہ پندرہ ہزار آدمی سے کم موجود نہ تھا۔ ہر ایک کے دل کو میں بہت نرم اور خدا کی طرف متوجہ پاتا تھا جس سے میں یقین کرتا ہوں کہ سب نے نہایت دلی محبت سے یہ شکرانہ ادا کیا۔[11]

خیرات اور چراغاں

اس کے بعد بہت کثرت سے کھانا محتاجوں کو تقسیم ہوا اور اس مسجد میں' جہاں شکرانہ ادا ہوا تھا' اور شاہ بلاقی صاحب کی درگاہ میں بہت دھوم سے روشنی ہوئی۔ علاوہ اس کے اس مسجد کی پشت پر جو ایک بہت بڑا وسیع میدان ہے اس میں بہت بڑا باڑہ دائرہ کے طور پر باندھا گیا تھا اور اس میں بہت دھوم سے روشنی ہوئی' اس باڑہ میں چار دروازے بنائے (گئے) تھے اور ہر دروازہ پر دو دو پیچ سرخ کاغذ کے تھے۔ جب وہ روشن ہوئے تو ان میں فارسی اور انگریزی حرفوں سے ملکہ وکٹوریا پڑھا جاتا تھا۔ آٹھ بجے رات کو یہ جلسہ بہت خوش نمائی سے ختم ہوا......... اس جلسہ میں تمام شہر کے عمدہ رئیس اور بھلے مانس شریک تھے' اور بڑی خوشی کی یہ بات ہے کہ اصل میں یہ جلسہ رعایا کی جانب سے تھا جس میں دلی اطاعت ہماری گورنمنٹ کی پائی جاتی ہے۔ بڑے مہتمم اس جلسہ کے قاضی عباس قاضئ شہر اور سعید الدین خاں صاحب رئیس اور شیخ زین الدین صاحب اور میر ظہور حسین وکیل عدالت تھے اور باقی سب مسلمان اہل کار سرکار کے ان کے مددگار تھے۔[12]

حکام انگریزی کے حق میں پرخلوص دعا

اب ہم اس مقام پر اس دعا کو' جو اس وقت پڑھی گئی تھی' نقل کرتے ہیں:-

..........الٰہی' ہمارے گناہ حد سے زیادہ ہو گئے تھے۔ الٰہی ہماری شامتِ اعمال کی کچھ انتہا نہیں رہی تھی...... ان پچھلے دو برسوں میں جو تیری نگاہِ قہر آلود تیرے عاجز بندوں کی طرف ہوئی وہ بے شک ہماری شامتِ اعمال کا ظاہری نتیجہ تھا۔ الٰہی' ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ الٰہی' ہم اپنے گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں۔ الٰہی' تو ہمارے گناہ سب معاف کر۔ آمین![13]

"الٰہی' یہ پچھلا زمانہ تیری مخلوقات پر ایسے گزرا کہ انسان اور حیوان' تمام چرند و پرند بلکہ

شہر و جہر کسی کو چین اور آرام نہ تھا۔ کوئی شخص اپنی جان و مال و آبرو پر مطمئن نہ تھا۔ ان پچھلے فسادوں نے زمین و آسمان کو گویا الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ الٰہی، تو نے اپنے فضل و کرم سے ان تمام فسادوں اور آفتوں کو دور کیا۔ الٰہی، تو نے پھر اپنے عاجز بندوں پر رحم کیا اور جو امن اور آسائش ان بدبخت برسوں سے پہلے تو نے اپنے بندوں کو دی تھی پھر وہی امن اور آسائش تو نے اپنے بندوں کو نصیب کی۔ الٰہی، تیرے اس رحم کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں۔"[1]

"الٰہی، تیرا ایک بہت بڑا احسان بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تو نے اپنے بندوں کو، جن کو تو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے، اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تو نے اس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم تو نے ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، تو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول کر۔ آمین!"[2]

"الٰہی، جو بھلائی کہ تیرے بندے کو کسی تیرے بندے سے پہنچتی ہے وہ درحقیقت تیری ہی طرف سے ہے اور اس تیرے بندے کا شکر ادا کرنا درحقیقت تیرا ہی شکر ادا کرنا ہے۔ سب کے دلوں کا حال تجھ پر روشن ہے کیونکہ تو دانائے نہاں و آشکارا ہے۔ اہلِ ہند جو اس اتفاقیہ آفت میں گرفتار ہو گئے تھے ان پر رحم کرنا تو نے ہی ہمارے حکام کے دل میں ڈالا۔ تیرے ہی القا سے ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریہ دام سلطنتہا نے پُررحم اشتہار معافی کا جاری کیا۔ ہم دل سے اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنی جان سے ملکہ کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی، تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ آمین! الٰہی، ہماری ملکہ وکٹوریا ہو اور جہان ہو"[3]

"تمام اہلِ ہند ناظم کشورِ ہند وائسرائے لارڈ کیننگ دام اقبالہم کا یہ رحم اور احسان کبھی دل سے نہیں بھولیں گے جس نے تمام اصلی حالاتِ فساد پر غور کر کے اس پُررحم اشتہار کے جاری ہونے کی صلاح دی۔ اس کی مستحکم رائے کسی طرح اس معاملہ میں نہیں ڈگمگائی جس سے تمام رعایا نے امن پایا۔ تمام اہلِ ہند اس کے اس احسان کے بندے ہیں اور دل و جان سے اس کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی، تو ہماری دعا قبول کر۔ آمین! الٰہی، جہان ہو اور ہمارا وائسرائے لارڈ کیننگ ہو"[4]

"اہلِ ہند رحم کے اس سے بہت زیادہ خواہش مند ہیں جتنا ایک بہت پیاسا نہایت گرمی کی شدت اور آفتاب کی تیزی اور دھوپ کی تپش اور ریتے کے جنگل میں پانی کی آرزو رکھتا ہو۔ جس حاکم کو دیکھتے ہیں کہ اس کی رحم کی نظر ہے اس کو دل سے پیار کرتے ہیں، اس کا دل سے شکر ادا

کرتے ہیں۔ تمام اہلِ ہند جانتے ہیں کہ اصلی حالاتِ فساد پر غور کر کے نہایت رحم کی نگاہ سے اہلِ ہند کو مسٹر ریڈ صاحب بہادر ممبر صدر بورڈ نے دیکھا ہے اس لئے اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور دل سے ان کو دعا دیتے ہیں۔ الٰہی 'تو ہماری اس دعا کو قبول کر۔ آمین! الٰہی ' ہمارا مسٹر ریڈ ہمیشہ سلامت رہے" [1]

"اب ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ فضل و کرم اور امن و امان 'چین چان رکھے اور تمام رعایائے ہند کو اطاعت گورنمنٹ سے سرخ روئی دے اور ہمارے حکام اپنی رعایا اور خدا کے بندوں پر مہربان رہیں۔ آمین!" [2]

سرسید کی کوششوں کا ثمر

(از الطاف حسین حالی)

"۔۔۔۔۔ اس کوہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری' یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعتِ کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے' اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روزِ سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو ان کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی' بلکہ اپنا وجود' ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں۔ ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں۔"

(کلیاتِ نثر حالی' جلد دوم' مجلس ترقی ادب لاہور' 1968ء ص 57)

تصانیف سرسید کی اشاعت ہائے اوّل سے چند اہم اقتباسات کے عکس

اِس رات بجنور میں بہت بڑا اندیشہ رہا کیونکہ تلنگوں کا ارادہ مرادآباد جانے کا ابھي تک کھلا نہ تھا بلکہ بجنور ھي آنیکا یقین تھا اور ھمکو کچھہ اُمید نہ تھي کہ آج کي رات خیر سے گذریگي اور بڑا اندیشہ ھم کو حکام انگریزي اور جناب میم صاحبہ کا تھا کیونکہ یہہ نمک حرام کمبخت تلنگہ خاص حکام انگریزي کے نقصان پہونچانے کے درپے تھے ھندوستاني آدمیوں یا اہلکاروں سے چنداں سروکار نہیں رکھتے تھے ھم اپنے دل کا حال بیان کرتے ھیں کہ جناب مستر الکزنڈر شکسپیر صاحب بہادر دام اقبالہ اور جناب مستر جارج پامر صاحب بہادر دام اقبالہ جو جو اخلاق اور عنایت ھمارے حال پر فرماتے تھے اُن اخلاقوں اور عنایتوں نے ھمارے دل میں ایسي محبت اِن صاحبوں کي ڈالدي تھي کہ اِن صاحبوں کي خدمت گذاري میں ھم اپني جان کي کچھہ بھي حقیقت نہیں سمجھتے تھے بے مبالغہ میں اپنے دل کي کیفیت بیان کرتا ھوں کہ محبت کے سبب اِن صاحبوں کي نسبت جو وھم دلمیں آتا تھا وہ بُراھي بُرا دیکھائي دیتا تھا اور جب اُس وھم کا اثر دل پر پہونچتا تھا تو دل سے ایک محبت کا بہت بڑا شعلہ نکلتا تھا اور وہ اِن صاحبوں کو گھیرلیتا تھا اور ھمارا دلي ارادہ یہہ تھا کہ خدا نخواستہ اگر بُرا وقت آوے تو اول ھم پروانہ کي طرح قربان ھو جاویں پھر جو کچھہ ھو سو ھو اور میں کچھہ شک نہیں کرتا کہ میرے ساتھي دونوں افسروں کا بھي یھي حال تھا ھم جب اُس رات کوٹھي پر آنکر بیٹھے ھیں تو اِس ارادہ سے نہیں آئے تھے کہ ھم زندہ یہاں سے پھر اپنے گھر پر آویں گے مگر نہایت خدا کا شکر ھے کہ ھماري اِس سچي نیت نے ھمکو بہت بڑا پھل دیا کہ ھمارے محبوب حکام کو بھي سب طرح اپنے فضل میں رکھا اور ھمکو بھي ھر آفت سے بچایا اور آج وہ دن ھے کہ اللہ کي عنایت سے ھم سب لوگ جو اِس اچھي نیت میں شریک تھے معہ اپنے محبوب حکاموں کے زندہ اور سلامت اکھٹے ھیں اور دل کي خوشي سے خدا کا شکر کرتے ھیں آمین *

سرکشی ضلع بجنور مطبوعہ 1858ء

† دلي کے معزول بادشاہ کي سلطنت کا کوئي بھي آرزومند نتھا اِس
خاندان کي لغو اور بيہودہ حرکات نے سب کي آنکھوں ميں سے اُسکي
قدر اور منزلت گرادي تھي ہاں بيرونجات کے لوگ جو بادشاہ کي
حالات اور حرکات اور اقتدار اور اختيار سے واقف نہ تھے بلاشبہہ بادشاہ کي
بڑي قدر سمجھتے تھے اور اُسکو ہندوستان کا بادشاہ اور انريبل ايسٹ
انڈيا کمپني کو منتظم ہندوستان جانتے تھے اِلا خاص دلي کے اور
اُسکے قرب و جوار کے رہنے والے بادشاہ کي کچھہ بھي وقعت خيال
ميں نہ لاتے تھے باوجود اِن سب باتوں کے ہندوستان کے سب آدميوں
† کو بادشاہ کے معدوم ہونے سے کچھہ بھي رنج نہ تھا ياد ہوگا کہ جب
سنہ ۱۸۲۷ ع ميں لارڈ امہرسٹ صاحب بہادر نے علانيہ کہديا تھا کہ
ہمارے گورمنٹ اب کچھہ تيموريہ خاندان کے تابع نہيں ہے بلکہ وہ
خود ہندوستان کي بادشاہ ہے تو اُسوقت رعايا اور واليان ہندوستان
کو کچھہ بھي خيال نہيں ہوا تھا کو خاص بادشاہي خاندان کو
کچھہ رنج ہوا ہو *

† دلي کے معزول بادشاہ کي وقعت دلي کے لوگونميں اور اُن شہروں ميں جو دلي کے قريب تھے کچھہ نہ تھي مگر بيرونجات ميں

The position of the Ex-King of Delhie well known within the town, and its environs, but over-rated in the district Provinces.

† لارڈ امہرسٹ صاحب کا کہنا کہ خاندان تيمور دلي کا بادشاہ نہيں

The declaration of Lord Amherst, in the year 1827, to the effect that the sovereignty of India belongs to the British Government, and that it no longer existed in the Timour family did not offend any one.

مسلمانوں کا بہت روزوں سے آپسميں سازش اور مشورہ کرنا اِس
ارادہ سے کہ ہم باہم متفق ہوکر غير مذہب کے لوگوں پر جہاد کريں
اور اُنکي حکومت سے آزاد ہو جاويں نہايت بے بنياد بات ہے جبکہ
مسلمان ہمارے گورمنٹ کے مستامن تھے کسيطرح گورمنٹ کي
عملداري ميں جہاد نہيں کرسکتے تھے پيں‌تيس برس پيشتر ايک
بہت بڑے نامي مولوي محمد اسمعيل نے ہندوستان ميں جہاد کا
وعظ کہا اور سب آدميوں کو جہاد کي ترغيب دي اُسوقت اُس نے
صاف بيان کيا کہ ہندوستان کے رہنے والے جو سرکار انگريزي کے امن
ميں رہتے ہيں ہندوستان ميں جہاد نہيں کرسکتے اسليئے ہزاروں آدمي
جہادي ہرايک ضلع ہندوستان ميں جمع ہوئے اور سرکار کي عملداري
ميں کسيطرح کا فساد نہيں کيا اور غربي سرحد پنجاب پر جاکر
لڑائي کي اور يہہ جو ہر ضلع ميں پاجي اور جاہلوں کيطرف سے
جہاد کا نام ہوا اگر اُسکو ہم جہاد ہي فرض کريں تو بھي اُسکي
سازش اور صلاح قبل دسويں مئي سنہ ۱۸۵۷ ع مطلق نہ تھي *

پہلے سے کچھہ سازش مسلمانوں ميں جہاد کي نہ تھي

The Mahomedans did not contemplate Jehad against the Christians prior to the outbreak.

مولوي محمد اسمعيل کے وعظ اور جہاد کا ذکر

The preaching of Jehad in India, (35) thirty-five years before with this reservation, its practice against the British Government was opposed to the doctrines of the Mahomedan religion, and from the same cause its practice on the other side of the Indus provinces, i. e., against the Seiks was held before.

غور کرنا چاہيئے کہ اِس زمانہ ميں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا
بلند کيا ايسے خراب اور بد رويہ اور بد اطوار آدمي تھے کہ بجز
شراب خواري اور تماش بيني اور ناچ اور رنگ ديکھنے کے اور کچھہ
وظيفہ اُنکا نہ تھا بھلا يہہ کيونکر پيشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جاسکتے
تھے اِس ہنگامہ ميں کوئي بات بھي مذہب کے مطابق نہيں
ہوئي سب جانتے ہيں کہ سرکاري خزانہ اور اسباب جو امانت تھا
اُسميں خيانت کرنا ملازمين کو نمک حرامي کرني مذہب کے
روسے درست نہ تھي صريح ظاہر ہے کہ بيگناہونکا قتل علي الخصوص
عورتوں اور بچوں اور بُڈھونکا مذہب کے بموجب گناہ عظيم تھا پھر
کيونکر يہہ ہنگامہ غدر جہاد ہوسکتا تھا ہاں البتہ چند بدذاتوں نے
دنيا کي طمع اور اپني منفعت اور اپنے خيالات پورا کرنيکو اور جاہلوں
کے بہکانيکو اور اپنے ساتھہ جمعيت جمع کرنيکو جہاد کا نام ليديا پھر
يہہ بات بھي مفسدوں کي حرمزدگيوں ميں سے ايک حرمزدگي تھي
نہ واقع ميں جہاد *

اِس ہنگامہ ميں کوئي بات مسلمانونکے مذہب کے مطابق نہيں ہوئي

None of the acts committed by the Mahamedan rebels during the disturbances were in accordance with the tenets of the Mahomedan religion.

اسباب سرکشی ہندوستان مطبوعہ 1859ء

۴ الهي تيرا ايک بهت بڑا احسان بندوں پر يهه هے که اپنے بندونکو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے - سو برس تک تونے اپنے اُن بندوں کو جنکو تونے خطه هندوستان ميں جگهه دي هے اِسيطرح عادل اور منصف حاکموں کے هاتهه ميں ڈالرکهاتها کيمدت برسوں میں جو بسبب نہونے اُن حاکموں کے همارے شامت اعمال همارے پيش آئے اب تونے اُسکا عوض کيا اور پهر وهي عادل اور منصف حاکم تونے همپر مسلط کئے تيرے اِس احسان کا هم دل سے شکر ادا کرتے هيں تو اپنے فضل و کرم سے اُسکو قبول کر آمين*

۵ الهي جو بهلائي که تيرے بنديکو کسي تيرے بندے سے پهونچتي هے وه درحقيقت تيري هي طرف سے هے اور اُس تيرے بنديکا شکر ادا کرنا درحقيقت تيراهي شکر ادا کرنا هے سب کے دلونکا حال تجهپر روشن هے کيونکه تو داناے نهان و آشکارا هے اهل هند جو اِس اتفاقه آفت ميں گرفتار هوگئے تهے اُنپر رحم کرنا تونے هي هماري حکام کے دلميں ڈالا تيرے هي القاء سے ملکه معظمه کوئين وکٹوريا دام سلطنتها نے پر رحم اشتهار معافي کا جاري کيا هم دلسے اُسکا شکر ادا کرتے هيں اور اپني جان سے ملکه کو دعا ديتے هيں الهي تو هماري اِس دعا کو قبول کر آمين الهي هماري ملکه وکٹوريا هو اور جهان هو*

۶ تمام اهل هند ناظم کشور هند ويسراے لارڈ کيننگ دام اقبالهم کا يهه رحم اور احسان کبهي دل سے نهيں بهوليں گے جسنے تمام اصلي حالات فساد پر غور کرکر اِس پر رحم اشتهار جاري هونے کي صلاح دي اُسکي مستحکم راے کسيطرح اِس معامله ميں نهيں ڈگمگائي جس سے تمام رعايا نے امن پايا تمام اهل هند اُسکے اِس احسان کے بندے هيں اور دل و جان سے اُسکو دعا ديتے هيں الهي تو هماري دعا قبول کر آمين الهي جهان هو اور همارا ويسراے لارڈ کيننگ هو*

۷ اهل هند رحم کے اُس سے بهت زياده خواهشمند هيں جتنا ايک بهت پياسا نهايت گرمي کي شدت اور آفتاب کي تيزي اور دهوپ کي تپش اور ريتے کے جنگل ميں پاني کي آرزو رکهتا هو جس حاکم کو ديکهتے هيں که اُسکي رحمکي نظر هے اُسکو دل سے پيار کرتے هيں اُسکا دل سے شکر ادا کرتے هيں تمام اهل هند جانتے هيں که اصلي حالات فساد پر غور کرکر نهايت رحم کي نگاه سے اهل هند کو مسٹر ريڈ صاحب بهادر ممبر صدر بورڈ نے ديکها هے اِسلئے اُنکا شکر ادا کرتے هيں اور دل سے اُنکو دعا ديتے هيں الهي تو هماري اِس دعا کو قبول کر آمين الهي همارا مسٹر ريڈ هميشه سلامت رهے*

۸ اب هماري يهه دعا هے که الله تعالى هميشه فضل و کرم اور امن و امان چين چان رکهے اور تمام رعاياے هند کو اطاعت گورمنت سے سرخروئي دے اور همارے حکام اپني رعايا اور خدا کے بندوں پر مهربان رهيں آمين وصلى الله تعالى على خير خليفه محمد واله واصحابه اجمعين وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين*

شکریہ (مراد آباد کے مسلمانوں کا) مطبوعہ 1859ء

Be it known however that I am no advocate of those Mehomedans who behaved undutifully, and joined in the Rebellion; on the contrary I hold their conduct in utter abhorrence, as being in the highest degree criminal, and wholly inexcusable; because at that momentous crisis it was imperatively their duty, a duty enjoined by the precepts of our religion, to identify themselves heartily with the Christians and to espouse their cause; seeing that they have,—like ourselves,—been favored with a revelation from Heaven, and believe in the Prophets, and hold sacred the word of God in his holy book, which is also an object of faith with us. It was therefore needful and proper, that where the blood of Christians was spilt, there should also have mingled with it that of Mahomedans; and those who shrunk from manifesting such devotedness, and sided with the rebels, wilfully disobeyed the injunctions of religion, besides proving themselves ungrateful to their salt, and thereby incurring the severe displeasure of Government, a fact that is patent to every peasant.

جن مسلمانوں نے هماري سرکار کي نمکحرامي اور بد خواهي کي میں اُنکا طرفدار نهیں میں اُنسے بهت زیاده ناراض هوں اور حد سے زیاده بُرا جانتا هوں کیونکه یهه هنگامه ایسا تها که مسلمانوں کو اپنے مذهب کي بموجب عیسائیوں کے ساتهه رهنا تها جو اهل کتاب اور همارے مذهبي بهائي بند هیں نبیوں پر ایمان لائے هیں خدا کے دئے احکام اور خدا کي دي هوئي کتاب اپنے پاس رکهتے هیں جسکا تصدیق کرنا اور جسپر ایمان لانا همارا عین ایمان هے پهر اِس هنگامه میں جهاں عیسائیونکا خون گرتا وهیں مسلمانوں کا بهي خون گرنا چاهئے تها پهر جسنے ایسا نهیں کیا اوسنے علاوه نمکحرامي اور گورمنٹ کي ناشکري کي جو هرایک رعیت پر واجب هے اپنے مذهب کے بهي برخلاف کیا پهر بلاشبهه وه اِس لایق هیں که زیاده تر اُنسے ناراض هوا جاوے

لائل محمڈنز آف انڈیا مطبوعه 360 ، ،

The leader of the Jihadis was Syed Ahmed, but he was no preacher. Moulavi Ismail was the man whose preaching worked marvels on the feelings of Mahomedans. Throughout the whole of his career not a word was uttered by this preacher calculated to incite the feelings of his co-religionists against the English. Once, at Calcutta, whilst preaching the *jihad* against the Sikhs, he was interrogated as to his reasons for not proclaiming a religious war against the British, who were also infidels. In reply, he said that under English rule Mahomedans were not persecuted, and, as they were the subjects of that Government, they were bound by their religion not to join in a *jihad* against it. At this time, thousands of armed men and large stores of munitions of war were collected in India for the *jihad* against the Sikhs. Commissioners and magistrates were aware of this, and they reported the facts to the Government. They were directed not to interfere, as the Government was of opinion that their object was not inimical to the British.

ریویوڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر مطبوعہ 1872ء

اُس زمانہ مین مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے مگر وہ واعظ نہ تھے واعظ مولوي محمد اسمعیل صاحب تھے جنکي نصیحتون سے مسلمانون کے دلون مین ایک ایسا ولولہ اثر خیز پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسي بزرگ کي کرامت کا اثر ہوتا ھي مگر اِس واعظ نے اپنے زمانہ مین کبھي کوئي لفظ اپني زبان سے ایسانہ نکالا جس سے اُن کے ہم مشربون کي طبیعت ذرا بھي گورنمنٹ انگریزي کي طرف سے منحرف ہوکر برافروختہ ہو بلکہ ایک مرتبہ وہ کلکتہ مین سکھون پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے اثناے وعظ مین کسي شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ تم انگریزون پر جہاد کرنے کا وعظ کیون نہین کہتے وہ بھي تو کافر ہین اِس کے جواب مین مولوي محمد اسمعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزون کے عہد مین مسلمانون کو کچھہ اذیت نہین ہوتي اور چونکہ ہم انگریزون کي رعایا ہین اِسلیئے ہمپر اپنے مذہب کي رو سے یہہ بات فرض ھي کہ انگریزون پر جہاد کرنے مین ہم کبھي شریک نہون بس اِس زمانہ مین ہزارون مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھون پر جہاد کرنے کیواسطے ہندوستان مین جمع ہوگیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اِس امر کي اطلاع ہوئي تو انہون نے گورنمنٹ کو اطلاع دي گورنمنٹ نے اُن کو صاف لکھا کہ تمکو اس معاملہ مین ہرگز دست اندازي نہین کرني چاہیئے کیونکہ اُن کا ارادہ کچھہ گورنمنٹ انگریزي کے مقاصد کے خلاف نہین ھي

اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا — جسنے اُنکو امن دیا ہو ' مسلمان ہو یا کافر ' اُسکی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہی — کافروں کے ساتھہ جو عہد و اقرار ہوئے ہوں اُنکو نہایت ایمانداری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہی — خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خونریزی کی اجازت نہیں دیتا - کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اُس میں بالجبر اسلام پھیلایا جاوے حملہ کرکے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا ' یہانتک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا — صرف دو صورتوں میں اُسنے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہی — ایک اِس حالت میں جبکہ کافر اسلام کی عداوت سے ' اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے' نہ کسی ملکی اغراض سے ' مسلمانوں پر حملہ آور ہوں' کیونکہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں ' خواہ مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمان و کافروں میں ' وہ دنیاوی بات ہی مذہب سے کچھہ تعلق نہیں ہی — دوسرے جبکہ اُس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہہ سے کہ وہ مسلمان ہیں اُنکی جان و مال کو امن نہ ملے' اور فرایض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہو — مگر اس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمانداری کا بتایا ہی کہ جو لوگ اُس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں' یا امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو ' اور گو صرف بوجہہ اسلام اُن پر ظلم ہوتا ہو تو بھی اُنکو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی - یا اُس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں ' یعنی اُس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں - ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اُس ملک میں امن لیئے ہوئے یا بطور رعیت کے نہیں ہیں ' بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں ' اُنکو اُن مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جنپر صرف اسلام کی وجہہ سے ظلم ہوتا ہی ' یا اُنکے لیئے امن اور اُنکے لیئے اداے فرایض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے کو تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہی — لیکن جسوقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اُسکو مذہب اِسلام کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا *

تفسیر القرآن مطبوعہ 1880ء
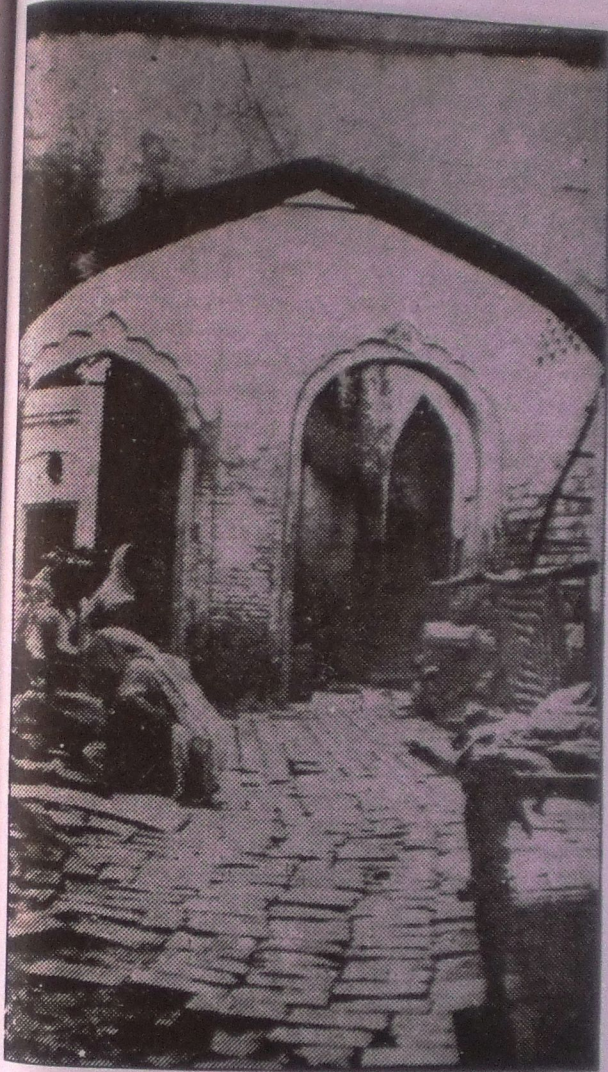
دہلی میں سرسید کا آبائی گھر جسے انگریزی فوج کے سپاہیوں نے شہر پر قبضہ کے بعد لوٹ لیا

والدہ کی یاد میں

غدر کے مصائب

گھر لٹ جانے پر لاوارث بڑھیا کی کوٹھڑی میں قیام

جس زمانہ میں غدر ہوا میں بجنور میں صدر امین تھا اور میری والدہ اور گھر کے لوگ اور بچے اور سب عزیز واقارب دہلی ہیں۔ وہ زمانۂ غدر میں لوگوں سے کہتی تھیں کہ انگریز تھوڑے دنوں میں پھر آجائیں گے، تم سب خاموش اپنے گھروں میں بیٹھے رہو، جو لوگ فساد میں شریک نہ ہوں گے انگریز اُن کو کچھ نہیں کہنے کے۔ ان کو یقینِ کامل تھا کہ انگریز، بجز ان کے جنہوں نے فساد کیا ہے، کسی کو کچھ تکلیف نہیں دینے کے۔ جب زمانہ فتح دہلی قریب ہوا اور کشمیری دروازہ فتح ہو گیا، سب زن و مرد شہر سے باہر چلے گئے مگر وہ اور ان کی ایک بہن، جو نابینا تھیں، اسی یقین پر کہ انگریز بے گناہوں کو نہیں ستانے کے، اپنے گھر سے نہیں گئیں۔ مگر افسوس کہ ان کا خیال غلط نکلا اور جب دہلی فتح ہوئی تو سپاہی گھروں میں گھس آئے۔ تمام گھر لوٹ لیا وہ مع اپنی بہن کے حویلی کو چھوڑ کر اس کوٹھڑی میں چلی آئیں جس میں زبا، لاوارث بڑھیا، رہتی تھی۔[1] ☆

☆۔ گھر کے لٹ جانے سے سرسید کا جو نقصان ہوا اس کا تخمینہ الیگزینڈر شیکسپیئر کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کی رپورٹ بنام کمشنر روہیل کھنڈ میں ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "شروع غدر میں ان کے عیال اور اطفال دہلی میں تھے اور ہم نے اس بات کو خوب دریافت کر لیا کہ بسبب ان کی خیر خواہی کے باغیوں نے ان کے گھر کو لوٹ لیا۔ مکانات تو ل گئے مگر نقصان مال اور اسباب کا، جو دہلی اور بجنور میں ہوا، تخمیناً تیس ہزار تین سو چوراسی روپیہ کا قرار دیتے ہیں۔" (لائف محمڈن آف انڈیا، حصہ اول، ص 26)

دہلی پہنچنے پر پیاسی ماں کے لئے پانی کی تلاش

آٹھ دس دن انہوں نے نہایت تکلیف سے بسر کئے۔ اس عرصہ میں راقم، جو میرٹھ میں آ گیا تھا، میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا اسی پر بسر تھی۔ دو دنوں سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی، انہوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ ہائیں، تم یہاں کیوں آ گئے؟ یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں۔ تم چلے جاؤ۔ ہم پر جو گزرے گی، گزرے گی۔ میں نے کہا " آپ خاطر جمع رکھئے مجھے کوئی نہیں مارے گا۔ میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعہ کے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں "۔ ان کو طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے پانی مطلق نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش میں نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ کنوؤں پر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے پانی نکالا جا سکے۔ ناچار پھر قلعہ میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب کے بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آب خورہ ہے اور کسی قدر بد حواس ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی پانی کی تلاش کو نکلی تھی۔ تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی اور پھر اٹھا نہ گیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے، دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے آب خورہ میں پانی دیا اور کہا " پانی پی لے"

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آب خورہ کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحبہ پیاسی ہیں ان کے لئے پانی لے جاؤں گی اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا "میرے پاس پانی بہت ہے۔ میں لے آیا ہوں، تو پانی پی لے "۔ پھر آب خورہ میں پانی دیا۔ اس نے پیا اور لیٹ گئی۔ میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔[۱]

بڑھیا کی دردناک موت اور ہماری میرٹھ کو روانگی

اب میں گھر سے نکلا کہ کچھ سواری کا بندوبست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا زبان لیٹی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کئے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے، مجھ کو دے دی جائے۔ میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔ منشی الطاف حسین صاحب سررشتہ دار کمشنری

میرٹھ نے، جو میرے ساتھ بچپن سے کھیلے ہوئے تھے اور ان کے خاندان اور میرے خاندان سے ارتباط قدیمی تھا، میرے رہنے کو ایک مکان خالی کر دیا۔ میں ہمیشہ ان کے اس احسان کو یاد رکھتا ہوں۔[1]

انتقال پُر ملال

اس تکلیف سے میری والدہ کی طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف ہو گئی اور صفرا کی نہایت شدت ہو گئی، جو دوا یا غذا دی جاتی تھی وہ قے ہو جاتی تھی۔ کبھی اس مرض میں کچھ تخفیف ہو جاتی کبھی شدت ہو جاتی۔ آخر کار اس مرض میں یکم ربیع الثانی ۱۲۷۴ ہجری مطابق ۱۸۵۷ء کے انہوں نے بمقام میرٹھ انتقال کیا، مگر ان کی نیک نیتی کا یہ نتیجہ تھا کہ انتقال سے چند روز پیشتر انکی بیٹی اور نواسیاں اور پوتے اور پوتیاں اور بہوئیں، جو مختلف مقامات میں چلی گئی تھیں، سب ان کے پاس میرٹھ میں جمع ہو گئی تھیں اور انہوں نے سب کو صحیح و سالم اور خیر و عافیت سے دیکھ کر نہایت خوشی کی تھی۔[2]

مجھ کو ماں کے مرنے کا اتنا رنج نہیں ہوا جتنا کہ بھائی کے مرنے کا ہوا تھا کیونکہ غدر کے مصائب کا زمانہ تھا اور ہر وقت یہ خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو میں پہلے مر جاؤں اور میرے بعد والدہ کی زندگی تلخی اور سختی میں گزرے۔[3]

وصیتیں

انہوں نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں مجھ کو کیں۔ ایک یہ کہ ان کو بغلی قبر میں، جو مسنون ہے، دفن کیا جائے۔ دوسری بات یہ کہی کہ ان کے ذمہ نہ تو کوئی روزہ قضا کا ہے اور نہ کوئی نماز قضا کی ہے۔ صرف ان ہی دنوں کی نمازیں اگرچہ میں نے پڑھی ہیں لیکن اگر میں زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ میرے مرنے کے بعد تم اس قدر دنوں کی نمازوں کا حساب کر کے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو دے دینا۔ جب کہ دوسرے دن انہوں نے قضا کی تو میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔[4]

اخلاق و اوصاف

انتقام سے گریز کی نصیحت

ان کی تعلیم اور ان کی نصیحتیں نہایت ہی حکیمانہ اور دل پر اثر کرنے والی تھیں۔ مجھ کو یاد ہے کہ ایک شخص نے جس کے ساتھ میں نے نیکی کی تھی، میرے ساتھ نہایت بدی کی اور تمام وجہ

ثبوت جس سے اس کو فوجداری عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی' میرے ہاتھ آ گئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے' جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے' اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف و ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کبھی دور نہیں ہوا' اور نہ ہو گا اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے' گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو' انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔[11]

لاوارث بڑھیاؤں کی خبر گیری

ان کی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بوڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں۔ زنانہ مکان کے باہر بطور جلوخانہ کے ایک میدان تھا اور اس کے ایک طرف متعدد کوٹھڑیاں اور یک درے ملازموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے۔ غریب اور لاوارث بڑھیا عورتوں کو اس میں رکھتی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک لاوارث بڑھیا مسماۃ زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی بیمار ہوئی۔ بیماری بھی قریب قریب ایک ہی تھی۔ جو دوا ان کے لئے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی مگر حکیم معالج نے میری والدہ کے لئے ایک نسخہ معجون کا' جو قیمتی تھا' تجویز کیا۔ جس قدر تیار ہوا وہ مقدار میں ایک ہی شخص کے لئے چند روز تک کھانے کے لائق تھا۔ میں اس زمانہ میں دلی میں منصف تھا۔ میں اس معجون کو تیار کر کے لے گیا اور کہا کہ یہ اتنے دنوں کی خوراک ہے اس کو استعمال فرمایئے۔ انہوں نے اس کو لے لیا اور اس خیال سے کہ وہ معجون زیبا کے لئے بھی ایسی ہی مفید ہو گی جیسی کہ مجھ کو' اور ان کو یقین نہ تھا کہ زیبا کے لئے بھی ایسی معجون تیار کر دی جائے گی' اس لئے خود انہوں نے اس معجون کو نہیں کھایا اور خفیہ خفیہ زیبا کو کھلایا اور اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی۔ اسی کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔ چند روز بعد میں نے ان سے کہا کہ اس معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا "تمہارے نزدیک بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دیتا"؟ میں متعجب ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ معجون ان کے عوض زیبا نے

کھائی اور خدا نے دونوں کو صحت عطا کی' ایک کو بہ حیلہ دوا کے اور ایک کو محض اپنے فضل و کرم سے۔[1]

ہر حالت میں نباہ کرنے والی عادت اختیار کرنے کا مشورہ

میں جب دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو کبھی پا پیادہ۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے' کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو' چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا' اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔[2]

یک طرفہ ہی سہی' اپنا فرض ادا کرتے رہنے کی تلقین

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب میں بہت دوستی تھی' آپس میں بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کی برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا تو میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا۔ ہفتہ میں دو روز ان کے پاس جاتا تھا اور وہ بھی وقتِ معین ہی میرے پاس آتے تھے۔ اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا اور ملتا رہا مگر انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک میں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو' اس کا کیا سبب ہے؟ میں نے جو بات تھی وہ کہی' انہوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جہاں دوستی ہے اس کو پورا کرنا چاہئے' یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوست کو دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے کیوں ذمہ دار ہوتے ہو؟ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں؟"[3]

شرک و بدعت سے پرہیز

میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی .... ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ

ثبوت جس سے اس کو فوجداری عدالت سے کافی سزا مل سکتی تھی' میرے ہاتھ آ گئی۔ میرے نفس نے مجھ کو بہکایا اور انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ مرحومہ نے یہ خبر سن کر مجھ سے کہا کہ اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے عمدہ کوئی کام نہیں ہے۔ اگر تم کو اس کی بدی کی حاکم سے سزا دلوانی ہے تو نہایت نادانی ہے کہ اس قوی اور زبردست احکم الحاکمین کے چنگل سے' جو ہر ایک کے اعمال کی سزا دینے والا ہے' اپنے دشمن کو چھڑا کر ضعیف و ناتواں دنیا کے حاکموں کے ہاتھ ڈالنا چاہو۔ پس اگر دشمنی اور انتقام ہی منظور ہے تو قوی حاکم کے ہاتھ میں اس کو رہنے دو۔ اس نصیحت کا میرے دل پر ایسا اثر ہے کہ کبھی دور نہیں ہوا' اور نہ ہو گا اور جب سے میرے دل میں کسی شخص سے' گو اس نے میرے ساتھ کیسی ہی دشمنی کی ہو' انتقام لینے کا خیال تک نہیں آیا بلکہ ان کی نصیحت پر غور کرنے سے میرے دل میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اب میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا بھی اس سے میرا بدلہ لے۔

لاوارث بڑھیاؤں کی خبر گیری

ان کی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ امر تھا کہ لاوارث بڑھیا عورتوں کی ہمیشہ خبر گیری کرتی تھیں۔ زنانہ مکان کے باہر بطور جلوخانہ کے ایک میدان تھا اور اس کے ایک طرف متعدد کوٹھڑیاں اور یک درے ملازموں کے رہنے کے لئے بنے ہوئے تھے۔ غریب اور لاوارث بڑھیا عورتوں کو اس میں رکھتی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک لاوارث بڑھیا مساۃ زیبا تھی۔ اتفاق سے ایک زمانہ میں میری والدہ بھی بیمار ہوئیں اور زیبا بھی بیمار ہوئی۔ بیماری بھی قریب قریب ایک ہی تھی۔ جو دوا ان کے لئے تیار ہوتی تھی اسی میں سے زیبا کو پلاتی تھیں۔ دونوں کو صحت ہو گئی مگر حکیم معالج نے میری والدہ کے لئے ایک نسخہ معجون کا' جو قیمتی تھا' تجویز کیا۔ جس قدر تیار ہوا وہ مقدار میں ایک ہی شخص کے لئے چند روز تک کھانے کے لائق تھا۔ میں اس زمانہ میں دلی میں مصنف تھا۔ میں اس معجون کو تیار کر کے لے گیا اور کہا کہ یہ اتنے دنوں کی خوراک ہے اس کو استعمال فرمایئے۔ انہوں نے اس کو لے لیا اور اس خیال سے کہ وہ معجون زیبا کے لئے بھی ایسی ہی مفید ہو گی جیسی کہ مجھ کو' اور ان کو یقین نہ تھا کہ زیبا کے لئے بھی ایسی معجون تیار کر دی جائے گی' اس لئے خود انہوں نے اس معجون کو نہیں کھایا اور خفیہ خفیہ زیبا کو کھلایا اور اس معجون سے زیبا کی صحت میں بہت ترقی ہوئی۔ اسی کے ساتھ ان کی صحت میں بھی زیادہ ترقی ہو گئی۔ چند روز بعد میں نے ان سے کہا کہ اس معجون نے آپ کو بہت فائدہ کیا۔ وہ ہنسیں اور کہا "تمہارے نزدیک بغیر دوا کے خدا صحت نہیں دیتا"؟ میں متعجب ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ وہ معجون ان کے عوض زیبا نے

کھائی اور خدا نے دونوں کو صحت عطا کی' ایک کو بہ حیلہ دوا کے اور ایک کو محض اپنے فضل و کرم سے۔[1]

ہر حالت میں نباہ کرنے والی عادت اختیار کرنے کا مشورہ

میں جب دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھ کو نصیحت کرتی تھیں کہ جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہو گا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو کبھی پا پیادہ۔ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے' کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نبھا سکو' چنانچہ میں نے جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں جانے کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا اکثر دونوں جگہ پیدل جاتا تھا اور کبھی سواری پر۔[2]

یک طرفہ ہی سہی' اپنا فرض ادا کرتے رہنے کی تلقین

میرے بھائی سید محمد خاں اور حکیم غلام نجف صاحب میں بہت دوستی تھی' آپس میں بھائی بھائی کہتے تھے۔ میں بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کی برابر سمجھتا تھا۔ سید محمد خاں کے انتقال کے بعد جب میں دہلی میں منصف ہو کر آیا تو میں اسی طرح حکیم غلام نجف صاحب سے ملتا تھا۔ ہفتہ میں دو روز ان کے پاس جاتا تھا اور وہ بھی وقتِ معین ہی میرے پاس آتے تھے۔ اتفاقاً حکیم غلام نجف صاحب کچھ ناراض ہو گئے۔ میں بدستور ان کے پاس جاتا رہا اور ملتا رہا مگر انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ بہت دنوں تک میں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ آخر کو میں نے بھی ان کے ہاں جانا بہت کم کر دیا۔ ایک دفعہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ تم اب حکیم غلام نجف کے پاس بہت کم جاتے ہو' اس کا کیا سبب ہے؟ میں نے جو بات تھی وہ کہی' انہوں نے کہا "نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی کرتے ہو۔ جہاں دوستی ہے اس کو پورا کرنا چاہئے' یہ تمہارا فرض ہے اور اس دوست کو دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض کے ادا کرنے کے کیوں ذمہ دار ہوتے ہو؟ تم کو بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔ اس سے تم کو کیا کہ دوسرا بھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں؟"[3]

شرک و بدعت سے پرہیز

میری ننھیال کو شاہ عبدالعزیز سے اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی ....
ننھیال کے بعض لوگ توہمات میں مبتلا تھے اور شاہ عبدالعزیز کے ہاں جو کچھ ہوتا تھا اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا اور اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ

سفید مرغ کو ذبح کر کے اس کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا تھا بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کھانے کا اس کو امتناع ہوتا تھا۔ سید حامد اور سید محمود دونوں میرے بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا، مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈا کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی' خدا پر ایمان رکھنے کے بر خلاف ہے۔ وہ ان دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔ وہ لڑکے پراٹھے اور انڈا پسند کرتے تھے' بے تامل ان کو پکوا کر کھلا دیتی تھیں"۔

اس زمانہ میں کہ میرے خیالات مذہبی محققانہ اصول پر ہیں اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر کسی قسم کے شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے' نہیں پاتا۔ بجز ایک عقیدہ کے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ عبادتِ بدنی یعنی قرآن مجید پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دے کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مردے کو پہنچتا ہے۔

بیٹے کی موت پر صبر و استقلال کا عالم

ایک امر جو نہایت صبر و استقلال کا ان سے ظہور میں آیا وہ نہایت ہی عجیب ہے اور بہت کم اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ سید محمد خاں' ان کے بڑے بیٹے' نے سینتیس اڑتیس برس کی عمر میں انتقال کیا۔ میری والدہ اور تمام لوگ چھوٹے بڑے ان کے زمانہ بیماری میں بیمار داری اور علاج معالجہ میں مصروف تھے۔ میری والدہ ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ قریب ایک مہینہ کے وہ بیمار رہے۔ آخر کار ایک دن صبح کے وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ سب لوگ گریہ وزاری کرنے لگے۔ جو رنج و غم ان کو ہوا ہو گا ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کسی کو نہ ہوا ہو گا۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو نکلتے تھے لیکن اسی حالت میں انہوں نے کہا کہ خدا کی مرضی' اور وضو کر کے صبح کی نماز پڑھنے لگیں اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اٹھیں۔ میں اس زمانہ میں فتح پور سیکری میں منصف تھا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے دہلی میں اپنی تبدیلی کرالی۔

اتفاق سے بعض رشتہ داروں کی ایک بیٹی (دختر) کی شادی اسی زمانہ میں قرار پا چکی تھی اور صرف چار دن شادی کے باقی رہے تھے۔ اور وہ تمام سامان شادی کا کر چکی تھیں کہ سید محمد کا انتقال ہو گیا اور' جیسا کہ دستور ہے' ان لوگوں نے اس لڑکی کی شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ میری والدہ تیسرے دن اپنے بڑے بیٹے کے انتقال کے' اور ایسے سخت صدمہ کی حالت میں' خود ان رشتہ دار کے گھر میں گئیں اور کہا کہ میں تمہاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم رکھنے کا

حکم نہیں ہے۔ شادی کے ملتوی کرنے سے تمہارا بڑا نقصان ہو گا۔ اور جو امر کہ خدا کو منظور تھا وہ ہو چکا تم ہر گز شادی کو ملتوی مت کرو اور جب کہ میں خود تمہارے گھر میں آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ اگر لوگ ان باتوں پر غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میری والدہ کیسی عالی خیال اور نیک صفات اور عمدہ اخلاق، دانش مند اور دور اندیش فرشتہ سیرت بی بی تھیں اور ایسی ماں کا ایک بیٹے پر، جس کی اس نے تربیت کی ہو، کیا اثر پڑتا ہے۔(1)

سر سید نے ایک شخص کا جسے ذکر کیا کہ جب میں صدر امین تھا تو اسکے ساتھ میں نے کچھ سلوک کیا تھا اور اسکو ایک سخت مواخذہ سے بچایا تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد اُسنے در پردہ میرے ساتھ برائی کرنی شروع کی اور مدت تک میری شکایت کی گمنام عرضیاں صدر میں بھیجتا رہا۔ آخر تمام وہ ثبوت جس سے اُسکو کافی سزا مل سکتی تھی میرے ہاتھ آ گئی اور اتفاق سے اُسوقت مجسٹریٹ بھی وہ شخص تھا جو اُسکے پھانسنے کی فکر میں تھا۔ میرے نفس نے مجھکو انتقام لینے پر آمادہ کیا۔ میری والدہ کو جب میرا یہ ارادہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے مجھسے کہا کہ "سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگذر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اُس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو جو ہر بدی کی پوری سزا دینے والا ہے۔ اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔" اُنکے اس کہنے کا مجھپر ایسا اثر ہوا کہ اُس دن سے آج تک مجھکو کبھی کسی اپنے دشمن یا بدخواہ سے انتقام لینے کا خیال نہیں آیا اور امید ہے کہ کبھی نہ آئیگا۔ بلکہ انہیں کی نصیحت کی بدولت میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آخرت میں خدا اُس سے میرا بدلا لے۔"

والدہ سر سید کی اخلاقی عظمت کا ایک واقعہ (عکس از حیات جاوید)

قومی ہمدردی کے کاموں میں دلچسپی کے ابتدائی سالوں میں سرسید چند نوجوان پیرو کاروں کے درمیان

قومی ہمدردی کے کاموں کا آغاز

ارادہ ترکِ وطن

غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا' جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا اور ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیئر نے' جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے' بعوض اس وفاداری کے تعلقہ جہاں آباد' جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا' مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں! میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے' اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی' اور جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔"★

★۔ مندرجہ بالا سطور میں سرسید نے جس تعلقہ کا ذکر کیا ہے' حالی اس کی نشان دہی کرتے ہیں: "میر صادق علی اور میر رستم علی رئیسانِ چاندپور کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی مرضی بادشاہ دہلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی' سرکار نے ضبط کر لیا تھا (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 79) واضح ہو کہ یہ وہی میر صادق علی ہیں جنھوں نے

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

قومی بھلائی کے لئے موقوفی ارادہ ہجرت

چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد میں آیا' جو ایک بڑا غم کدۂ بربادی ہماری قوم کے رئیسوں کا تھا' اس غم کو کسی قدر ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں' اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑی ہے! اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔[1]

میں نے غور کیا کہ............ اصلی سبب سوچنا چاہئے کہ قوم پر یہ مصیبت کیوں پڑی اور کیونکر دور ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ جواب ملا کہ قوم میں تعلیم و تربیت نہیں تھی اور انگریزوں سے' جن کو خدا نے ہم پر مسلط کیا ہے' میل جول اور اتحاد نہ تھا' اور باہم ان دونوں میں مذہبی اور رسمی منافرت بلکہ مثل آب زیرۂ کاہ عداوت کا ہوتا تھا۔ میں نے یقین کیا کہ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو یہ غدر واقع نہ ہوتا۔ اگر ہوتا تو جو سخت مصیبت گورنمنٹ پر' ملک پر' ہماری قوم پر واقع ہوئی اس قدر نہ ہوتی۔ پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس زمانہ کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا' آیا درحقیقت اسلام کے برخلاف ہے؟ مجھے

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

سرسید کو اس وقت' جب کہ وہ بجنور سے فرار ہو کر چاند پور پہنچے تھے اور سینکڑوں آدمی انہیں مارنے کو چڑھ دوڑے تھے' لوگوں کے غیظ و غضب سے عین اس وقت بچایا تھا جب بقول سرسید ان کے "مارے جانے میں کچھ شبہ باقی نہ تھا۔" (سرکشی ضلع بجنور' ص 104)

تعلقہ لینے سے انکار کا سبب اس سرکاری رپورٹ میں درج ہے جو کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور نے کمشنر روہیل کھنڈ کو 5 جون 1858ء کو سرسید کی خدمات 1857ء کے عوض انہیں انعام دینے کے سلسلے میں لکھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان چھوڑ دینے کے ارادہ سے تعلقہ لینے سے انکار کیا تھا اور یہ کہ انہیں اس کی بجائے پنشن سے نوازا گیا۔ کلکٹر نے لکھا تھا: "مناسب ہے کہ پنشن دو سو روپیہ ماہواری' خواہ دائمی خواہ حین حیات' ان کے اور ان کے بڑے بیٹے کے سرکار سے عنایت ہو۔ اور یہ تجویز اس نظر سے ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ سید احمد خان کا ارادہ ہے کہ بعد چند سال کے سیر اقالیم کی کریں' اس سبب سے زمینداری لینا منظور نہیں ہے۔"

(لائل محمڈنز آف انڈیا' حصہ اول' ص 25-26)

حالی لکھتے ہیں: "غدر کے بعد سرسید کا ارادہ مصمم ہو گیا تھا کہ پنشن لے کر مصر میں جا کر سکونت اختیار کریں۔" (حیات جاوید' حصہ اول' حاشیہ ص 81)

جواب ملا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ انگریزوں سے' جو ہمارے حاکم ہیں' اور عموماً عیسائیوں سے بھی دوستی اور بے ریا اتحاد اور دل کھول کر دوستانہ میل جول اور دوستانہ معاشرت اور آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کیا اسلام کے برخلاف ہے؟ جواب ملا کہ نہیں۔ بس ان ہی دونوں اصولوں کو میں نے اختیار کیا اور ان ہی اصولوں پر' جن کو میں کبھی نہیں چھوڑنے کا' قومی بھلائی پر کمر باندھی۔[۱]

میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔ میں نے پسند نہیں کیا مگر نہیں جانتا کہ کس نے پسند کیا اور کس نے آمادہ کیا۔[۲]

مراد آباد میں سکول کا قیام

جب کہ میں نے قومی بہتری کے وہ دو اصول مستحکم طور پر قائم کر لئے' ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اصلی اتحاد و دوستی' تو اول ۱۸۵۸ء میں میں نے ایک سکول مراد آباد میں قائم کیا جہاں اس زمانہ میں کسی قسم کے سکول کا وجود نہ تھا' مگر سر جان اسٹریچی کی مہربانی سے وہاں ایک اردو انگریزی سکول قائم ہوا اور دونوں کو ملا دیا گیا۔[۳]

غازی پور میں سکول کی بنیاد

پھر میں غازی پور گیا جہاں میں نے ایک سکول قائم کرنے کی بنیاد ڈالی جس میں اردو' انگریزی' عربی' فارسی پڑھائی جائے۔ اس کا فاؤنڈیشن سٹون میرے دوست مرحوم راجا سردار دیو نرائن سنگھ بہادر اور جناب مولانا محمد فصیح رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ سے رکھوایا گیا۔ وہ اسکول نہایت کامیابی سے چلتا ہے اور وکٹوریا اسکول کے نام سے موسوم ہے۔[۴]

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام

اس زمانہ میں میرے خیالات یہ تھے کہ بذریعہ ترجموں کے' جو اردو زبان میں ہوں' اپنی قوم کو اعلیٰ درجہ کے یورپین علوم و فنون سے بہرہ یاب کر سکتا ہوں۔ اس پر کوشش کی اور ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔[۵]

۱۸۶۴ء میں اس کا مقام علی گڑھ میں قرار پایا اور نہایت عمدہ عمارت مع خوش نما باغ کے اس کے لئے تعمیر ہوئی۔ اصلی مقصد اس سوسائٹی کا انگریزی زبان کی عمدہ عمدہ علوم و فنون کی کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنا اور چھاپنا تھا۔[۶]

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا

علمی کتابیں جو ترجمہ ہو کر اور چھپ کر ممبروں کے پاس پہنچیں انہوں نے اس کی کچھ قدر نہیں کی کیونکہ کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ ان کتابوں کو پڑھے اور سمجھے .... ملک بھی ان علوم سے جاہل تھا' اس لئے وہ کتابیں بجز چند تاریخ کی کتابوں کے فروخت نہ ہوئیں۔ بانیانِ سوسائٹی نے جب ممبروں کی دل برداشتگی کا یہ حال دیکھا تو انہوں نے ممبروں کے گرویدہ کرنے کے لئے ۱۸۶۶ء میں ایک اخبار جاری کیا جو اب تک جاری ہے۔[۱۱] ★

★ مولوی مقتدی خاں شروانی' جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر بھی رہے' تحریر کرتے ہیں کہ سرسید نے بعض اوقات "اخبار میں ایسے مضامین لکھے ہیں کہ ان پر یقین کرنا نہایت ہی مشکل ہے۔ مثلاً ایک واقعہ لکھا ہے کہ علی گڑھ شہر کے مشہور "اچل تالاب" (واقع گوشہ جنوب مغرب) میں ایک شخص اترا ہوا ہے جو پانی میں اس طرح ہے گویا پانی میں نہیں ہے بلکہ کسی ٹھوس اور سخت چیز تخت یا زمین پر ہے۔ وہ پانی پر چار زانو بیٹھتا ہے' لیٹتا ہے' لیٹ کر کروٹیں بدلتا ہے' بیٹھ کر حقہ پیتا ہے۔ یہ واقعہ کثرت سے ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں نقل ہوا اور اس پر صرف اس سبب سے اعتبار کیا گیا کہ وہ سرسید کے اخبار میں تھا۔"

آگے چل کر وہ ایک اور واقعہ یوں بیان کرتے ہیں: "سرسید باایں ہمہ متانت اعلیٰ درجہ کے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ بحیثیت صحافی ان کی شوخی کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک بار یہ خبر عام ہوئی کہ سرسید نے ایک ڈاکٹر کے ہاتھ اپنا سر دس ہزار روپیہ میں بیچا ہے اور ڈاکٹر نے اس غرض سے خریدا ہے کہ ان کے مرنے پر وہ ان کا سر کاٹ کر اور اس کا تجزیہ کر کے یہ دیکھے گا کہ اس میں وہ کیا چیز زیادہ ہے جس کے سبب یہ عقل کا پتلا بنا ہوا ہے۔ اس خبر کی اشاعت کے زمانے میں مَیں طفلِ مکتب سے بھی بہت زیادہ کمسن تھا مگر مجھے یہ چرچا اب تک بخوبی یاد ہے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ اخبار کا یومِ اشاعت' جو بدھ (چہار شنبہ) تھا' ایک سال یکم اپریل کو پڑا۔ اس پر سرسید کو اپریل فول کی سوجھی اور انہوں نے اخبار میں واقعہ دیا کہ فلاں تاریخ سید احمد خاں کا سر فلاں ڈاکٹر کے ہاں فلاں غرض سے اس قیمت میں بکا اور اس کی ضلع کے دفترِ رجسٹری میں رجسٹری ہوئی۔ اس پر من جملہ حاشیہ کے گواہوں کے ایک گواہ مولانا (بعد کے شمس العلما) عباس حسین شیعہ مجتہد اور کالج کے شیعہ ڈین بھی تھے۔ اخبار صبحِ صادق میں تیار ہو کر آفتاب کے ساتھ طلوع ہو جایا کرتا تھا۔ اخبار پڑھ کہ "تو چل میں چل" کے ساتھ مولانا عباس حسین پر چڑھائی ہوئی۔ اسرار سے ناواقف لوگ تو محض تصدیق کے لئے آئے مگر سید محمود نے (جو واقفِ راز تھے) آکر مولانا کو بڑا ڈانٹا اور ان کے خلاف سخت سے سخت عدالتی چارہ جوئی کی ان کو دھمکی دی۔ مولانا کی حالت قابلِ دید بتائی جاتی ہے۔ اس ساری لطف اندوزی کے بعد مقامی طور پر تو یہ علم ہو گیا کہ یہ اپریل فول تھا مگر بیرون جات میں یہ واقعہ ہی سمجھا جاتا رہا۔"

(برگِ گل کراچی' سرسید نمبر (نقشِ ثانی)' ص 184)

THE ALIGURH INSTITUTE GAZETTE

اخبار

سائینٹیفک سوسائیٹی علیگڈہ

جلد ۶] ۲۳ جون روز جمعہ سنہ ۱۸۷۱ ع [نمبر ۲۵

[Vol. VI. FRIDAY, JUNE 23, 1871 No. 25.]

TO PERMIT THE LIBERTY OF THE PRESS IS THE PART OF A WISE GOVERNMENT; TO PRESERVE IT, IS THE PART OF A FREE PEOPLE.

جایز رکھنا چھاپہ کي آزادي کا کام ہی ایک دانا گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اُسی آزادي کا کام ہی ایک آزاد رعیت کا

NOTICE

THIS PAPER IS PUBLISHED WEEKLY AND DISTRIBUTED OF ... TO ITS MEMBERS BY THE SCIENTIFIC SOCIETY.

For outsiders the Rates of Subscription are as follow.

For Subscribers for several copies, per annum,	... Rs.	12	0	0
For each copy per annum,	... Rs.	18	0	0
Postage for each copy *per annum*	... Rs.	3	0	0
Single copy	... Rs.	0	6	0

Resident Members of the Society pay an Annual Subscription of Rs. 24 and the outstation Members Rs. 27 inclusive of Postage for this Paper. They are entitled to receive, without further payment, all the Society's Publications, Books, Lectures, and Newspapers.

TERMS OF ADVERTISEMENT.

Every Advertisement under 6 lines	...	1	0	0
Ditto additional line, Vernacular	...	0	1	6
Ditto ditto English	...	0	1	6
Advertisements in Vernacular and English per line,	...	0	1	0

اطلاع

یہ اخبار سائینٹیفک سوسائیٹی علیگڈہ سے ہفتہوار جاری ہوتا ہے ممبران سائینٹیفک سوسائیٹی کو بلا قیمت ملتا ہے اور اُنکے سوا اور خریداروں کے لیئے اِسکی قیمت حسب تفصیل ذیل ہے ٭

سالانہ قیمت خریدار یکجائی کے لیئے ... ... [illegible]

سالانہ قیمت علاوہ خریدار یکجائی کے فی پرچہ [illegible]

سالانہ محصول ہر ایک کے لیئے جسکے پاس اخبار بھیجا جاویگا ... ... [illegible]

فی پرچہ ... ... [illegible]

جو ممبر ہماری سوسائیٹی کے علیگڈہ کے رہنے والے ہیں انکو چوبیس روپیہ سالانہ اور جو باہر کے رہنے والے ہیں اُن کو مع محصول اخبار ستائیس روپیہ سالانہ دینا پڑتا ہے اور کل کتابیں اور اخبار جو سوسائیٹی چھاپتی ہے بلا قیمت اُن کو ملتے ہیں ٭

اجرت طبع اشتہارات

ہر اشتہار جو چودہ سطر سے کم ہوگا اُسکا ایک روپیہ ہوگا اور زائد سطروں کے واسطے مفصلہ ذیل طرح پر لیا جاویگا ٭

صرف اُردو میں فی سطر ... ... [illegible]

صرف انگریزی میں فی سطر ... ... [illegible]

اور انگریزی اُردو دونوں میں فی سطر انگریزی اور فی اُردو ... [illegible]

”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ کے ایک شمارہ کا صفحہ اول

اور ممبروں کی بھی دل بستگی۔"(۱۱)
اخبار کے جاری ہونے سے بلاشبہ سوسائٹی کا فائدہ ہوا اور ممبروں کی بھی دل بستگی۔ گزٹ ہفتہ وار تھا اور جمعہ کو شائع
۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء سے لے کر مئی ۱۸۷۷ء کے اواخر تک .... جب گزٹ کے ساتھ
ہوا کرتا تھا لیکن جون ۱۸۷۷ء سے ہفتہ میں دوبار طبع ہونے لگا
تہذیب الاخلاق کو بھی شامل کر لیا گیا اور اخبار کا سلسلہ جدید شروع ہوا تو یہ پھر ہفتہ وار ہو گیا اور
ہفتہ میں صرف شنبہ کو شائع ہونے لگا۔"(۱۲)

"اس زمانہ میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ اس میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز اپنی ذاتی منفعت کے قومی بھلائی اور قومی منفعت کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی غرض مد نظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردہ سے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔"

"میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے نہیں! ان میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی عالی شان مسجدیں، کیسے کیسے عالی شان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی ہر شہر و قصبہ میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیر و خیرات کرتے ہیں، بھوکوں کو کھلاتے ہیں، حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں، مسجدیں بنواتے ہیں، کوئی ایسا کام جس میں ان کی دانست میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ مگر اے دوستو! میں ...... نہایت ادب و عاجزی سے سوال کرتا ہوں کہ ہر ایک شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سچے دل سے سوچے کہ وہ یہ سب نیکی کے کام کس لئے کرتا ہے؟ سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روز حشر میں ان کو ثواب حاصل ہوگا۔ اگر یہ میرا خیال صحیح ہے تو اے بھائیو! در حقیقت یہ سب کام خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں، نہ ابنائے جنس کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے۔ جب تک کہ ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لئے کریں، نہ اپنے ثواب آخرت کے لئے، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہو سکتا۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان ثواب کے کاموں کو برا جانتا ہوں یا ان کی کچھ حقارت کرتا ہوں بلکہ میرا مقصد اس تقریر سے اور ان مثالوں سے یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی کو آپ صاحبوں کے ذہن نشین کرنے میں کوشش کروں اور قومی ہمدردی کے کاموں میں دوسرے کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو تمثیلوں سے بتلاؤں۔"

(مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید ص 198- 199)

لندن کا سفر

پس منظر

گورنمنٹ ریزولیشن مورخہ ۳۰ جون ۱۸۶۸ء کے تحت نو وظائف ان ہندوستانی نوجوانوں کو دینے منظور کئے گئے جو انگلستان میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے خواہش مند ہوں .... میں نے مصمم ارادہ کیا کہ میں بذاتِ خود سب سے پہلے اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اس لئے میں نے درخواست دے کر ایک وظیفہ اپنے بیٹے کے لئے حاصل کیا جو اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور نامزدگی کے حق کا امتحان پاس کر چکا تھا۔[1]

گورنمنٹ نے اضلاع شمال مغرب کے طالب علموں میں سے سید محمود کو لندن میں جا کر تعلیم پانے کو منتخب کیا جس کے لئے میں اول سرجان اسٹریچی کا اور اس کے بعد سر ولیم میور اور لارڈ لارنس مرحوم کا ممنون ہوں۔ مجھے موقع ملا کہ میں بھی لندن جاؤں اور تعلیم و تربیت کے ان طریقوں سے واقف ہوں جن طریقوں سے انگلش قوم نے ایسے اعلیٰ درجہ کی ترقی پائی ہے۔[2]

ہم لوگ جو گورنمنٹ انگلشیہ کے سائے میں آباد ہیں ان کو اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک ہم انگلش نیشن کے عادات اور حالات سے خوب واقف نہ ہوں۔ اسی خیال سے میں نے ولایت کا سفر اختیار کیا تھا اور اس غرض سے کہ اور مربوں کو اپنی اولاد بھیجنے کی ترغیب ہو، اپنے لڑکوں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔[3]

چند خیالات مجھ کو تھے' میں نے جائداد بیچی اور دس ہزار کا قرض کیا۔"(۱۱)

اقتباس از درخواست رخصت برائے سفر انگلستان

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو' جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے' بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند' طاقت ور اور دانا ہیں' اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشت کاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں۔ مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہو گا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں"(۱۲)★

بنارس سے بمبئی

الہ آباد میں دوستوں کے تحفے

یورپ کا سفر اختیار کرنے سے چند روز پیشتر ہمارا ادھر ادھر جانا اور عزیز و اقربا' دوست آشنا سے ملنا کچھ سفر میں داخل نہ تھا۔ پہلی اپریل ۱۸۶۹ء روز پنج شنبہ کو ہم بنارس سے چلے۔ دوسری تاریخ الہ آباد میں قیام کیا۔ ہمارے دوست مسٹر والنز اسمتھ صاحب نے ریلوے اسٹیشن بنارس سے بچشم نم رخصت کرتے وقت محمد محمود کو جو سونے کی نہایت عمدہ ایک گھڑی بطور یادگار وقت رخصت دی تھی وہ ہمارے پاس میز پر رکھی ہوئی تھی اور محمود ان کی محبت اور مہربانیوں کا ذکر کر رہا تھا اور ہم سب اس میں شریک تھے۔ اگرچہ ہمارے محبِ دلی سید ظہور حسین صاحب بنارس میں ہم

★۔ بقول گراہم انہوں نے ہی سر سید کا انگلستان جانا تجویز کیا تھا (دی لائف اینڈ ورک آف سر سید احمد خاں' ص ۱۲۰)

سے ملنے آئے تھے اور ہم سب کو رخصت کر چکے تھے مگر عین اس وقت پر جب کہ مسز اسمتھ صاحب کی محبت اور نشانی رخصت کا ذکر ہو رہا تھا' ان کا آدمی پہنچا اور چاندی کی نہایت عمدہ ایک گھڑی ہیمیب کی دکان کی' میرے لئے بطور نشانِ محبت کے لایا۔ تذکارِ محبت دوبالا ہو گئے اور ہر ایک شخص نے ایسے دل سے جو مُحِبّوں کی محبت کی یاد سے مشتعل تھا اور چشم نم کے اس پر پانی چھڑکنے سے محبت کا جوش اَور بھی دھواں دار ہو رہا تھا' ان کو اور تمام دوستوں کو یاد کیا۔[4]

جدائی کے لمحے کا تصوّر

چار بجے میں جناب معلّیٰ القاب آنریبل سر ولیم میور صاحب بہادر کے سی ایس آئی نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر سے رخصت ہو کر اپنی فرود گاہ میں آیا۔ اتنے میں شبِ دیجورِ فرقت آپہنچی اور دوستوں کو الوداع کہنے کا گھنٹہ دم بدم قریب ہونے لگا۔ اس وقت یہ شعر ہمارے حسبِ حال تھا۔

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے[5]

ہوٹل میں طعام و نوش

ہم نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل کے اسی کمرے میں جس میں ٹھہرے ہوئے تھے' کھانا مانگا۔ ہوٹل کے خدمت گاروں نے فی الفور میز کو آراستہ کیا۔ میں نے اور حامد محمود اور ہمارے شفیق رفیقِ سفر مرزا خداداد بیگ اور میرے دلی مُحِب مخدوم مولوی مہدی علی صاحب اور میرے پیارے مولوی زین العابدین صاحب نے ایک ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پکی ہوئی مرغی کی نسبت مولوی مہدی علی صاحب نے دریافت کیا کہ مسلمان کی ذبح کی ہوئی ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ مسلمان کی ذبح کی ہوئی ہے۔[6]

دوستوں سے الوداعی کیفیت

تھوڑی دیر بعد میں اور حامد محمود مسٹر گوڈال صاحب اور مسز گوڈال صاحبہ سے رخصت ہونے گئے۔ وہاں ایک پیالہ چائے کا' جو نہایت چاہ سے بنائی گئی تھی' پیا۔ ان دونوں نے ایک دل سوزِ محبت سے ہم کو رخصت کیا۔ پھر ہم ریل کے اسٹیشن پر پہنچے اور جبل پور ٹرین میں اپنی جگہ لی۔ ایسے وقت میں حالات کا متغیر ہونا اور دل کا مستقل نہ رہنا جبلتِ انسانی کا لازمہ ہے جس کو قادرِ مطلق نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کی بلکہ حیوان کی بھی خلقت میں رکھا ہے چنانچہ ہم نے

چند خیالات مجھ کو تھے، میں نے جائداد بیچی اور دس ہزار کا قرض کیا۔"(۱)

اقتباس از درخواست رُخصت برائے سفر انگلستان

"یہ بات بخوبی میرے ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح و بہبودی کو کامل ترقی دینے اور گورنمنٹ انگریزی کے مطالب کو، جس کی ملازمت کا فخر مجھ کو حاصل ہے، بخوبی استحکام و پائداری بخشنے کے واسطے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اہلِ یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جائے۔ پس اس مقصد کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقت ور اور دانا ہیں، اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں جو اس امر کے نتیجے ہیں کہ تجارت کے باب میں انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشت کاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ پس اس خواہش سے میں یہ بات چاہتا ہوں کہ خود انگلستان جا کر اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نظیر قائم کروں۔ مجھ کو یقین ہے کہ صرف مجھ کو ہی اس سفر سے فائدہ نہ ہوگا بلکہ امید ہے کہ اپنے سفر کے نتیجوں سے ان کو مطلع کر کے ان کو بھی فائدہ پہنچا سکوں اور اس طرح پر جو عمدہ باتیں میں نے سیکھی ہوں ان کو بھی سکھاؤں اور ان کو بھی اپنی پیروی کی ترغیب دوں"(۲)★

بنارس سے بمبئی

الہ آباد میں دوستوں کے تحفے

یورپ کا سفر اختیار کرنے سے چند روز پیشتر ہمارا ادھر ادھر جانا اور عزیز و اقربا، دوست آشنا سے ملنا کچھ سفر میں داخل نہ تھا۔ پہلی اپریل ۱۸۶۹ء روز پنج شنبہ کو ہم بنارس سے چلے۔ دوسری تاریخ الہ آباد میں قیام کیا۔ ہمارے دوست مسٹر والنز اسمتھ صاحب نے ریلوے اسٹیشن بنارس سے بچشم نم رخصت کرتے وقت محمد محمود کو جو سونے کی نہایت عمدہ ایک گھڑی بطور یادگار وقتِ رخصت دی تھی وہ ہمارے پاس میز پر رکھی ہوئی تھی اور محمود ان کی محبت اور مہربانیوں کا ذکر کر رہا تھا اور ہم سب اس میں شریک تھے۔ اگرچہ ہمارے محبِ ولی سید ظہور حسین صاحب بنارس میں ہم

★ ۔ بقول گراہم انہوں نے ہی سرسید کا انگلستان جانا تجویز کیا تھا (دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص ۱۲۳)

سے ملنے آئے تھے اور ہم سب کو رخصت کر چکے تھے مگر عین اس وقت پر جب کہ مسز اسمتھ صاحب کی محبت اور نشانی رخصت کا ذکر ہو رہا تھا' ان کا آدمی پہنچا اور چاندی کی نہایت عمدہ ایک گھڑی ٹکیپ کی دکان کی ' میرے لئے بطورِ نشانِ محبت کے لایا۔ تذکارِ محبت دوبالا ہو گئے اور ہر ایک شخص نے ایسے دل سے جو مُجبّوں کی محبت کی یاد سے مشتعل تھا اور چشم نم کے اس پر پانی چھڑکنے سے محبت کا جوش اَور بھی دھواں دار ہو رہا تھا' ان کو اور تمام دوستوں کو یاد کیا۔[1]

جدائی کے لمحے کا تصوّر

چار بجے میں جناب معلّی القاب آنریبل سر ولیم میور صاحب بہادر کے سی ایس آئی نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر سے رخصت ہو کر اپنی فرود گاہ میں آیا۔ اتنے میں شبِ دیجورِ فرقت آپہنچی اور دوستوں کو الوداع کہنے کا گھنٹہ دم بدم قریب ہونے لگا۔ اس وقت یہ شعر ہمارے حسبِ حال تھا۔

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے[5]

ہوٹل میں طعام و نوش

ہم نے گریٹ ایسٹرن ہوٹل کے اسی کمرے میں جس میں ٹھہرے ہوئے تھے ' کھانا مانگا۔ ہوٹل کے خدمت گاروں نے فی الفور میز کو آراستہ کیا۔ میں نے اور حامد محمود اور ہمارے شفیق رفیقِ سفر مرزا خداداد بیگ اور میرے دلی مُحِب مخدوم مولوی مہدی علی صاحب اور میرے پیارے مولوی زین العابدین صاحب نے ایک ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پکی ہوئی مرغی کی نسبت مولوی مہدی علی صاحب نے دریافت کیا کہ مسلمان کی ذبح کی ہوئی ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ مسلمان کی ذبح کی ہوئی ہے۔[9]

دوستوں سے الوداعی کیفیت

تھوڑی دیر بعد میں اور حامد محمود مسٹر گوڈال صاحب اور مسز گوڈال صاحبہ سے رخصت ہونے گئے۔ وہاں ایک پیالہ چائے کا ' جو نہایت چاہ سے بنائی گئی تھی ' پیا۔ ان دونوں نے ایک دل سوزِ محبت سے ہم کو رخصت کیا۔ پھر ہم ریل کے اسٹیشن پر پہنچے اور جبل پور ٹرین میں اپنی جگہ لی۔ ایسے وقت میں حالات کا متغیر ہونا اور دل کا مستقل نہ رہنا جبلتِ انسانی کا لازمہ ہے جس کو قادرِ مطلق نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انسان کی بلکہ حیوان کی بھی خلقت میں رکھا ہے چنانچہ ہم نے

اور ہمارے دونوں دوستوں نے حکیم مطلق کی اس حکمت کی اطاعت کی اور نگاہوں ہی نگاہوں میں اثر برقِ محبت ایک دوسرے کے دلوں سے پار ہو گیا۔ وللہ درّ من قال ~

از سینہ بسینہ جلوہ کاہش
از دیدہ بدیدہ شاہ راہش

میں نے مولوی زین العابدین کے کان میں ایک بات کہی جس سے ان کا دل زیادہ متغیر ہو گیا، اور مجھ کو یقین ہے کہ ایسے وقت کے اس کلمۂ خیر کو وہ ضرور یاد رکھیں گے۔ پھر ہم نے ان دونوں سے ہاتھ ملائے اور ایک نے دوسرے کو دعائے خیر دی اور کلماتِ مسنونہ وقتِ رخصت ادا کئے اور خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ اُدھر وہ دونوں دوست بچشمِ گریاں پھرے اور اِدھر ہم بسینہ بریاں روانہ جبل پور ہوئے۔[1]

جبل پور میں سواری کے حصول کی بھاگ دوڑ

تیسری اپریل ۱۸۶۹ء کو ہم سب مسافر جبل پور میں پہنچے اور پامر ہوٹل کے دو کمرے لے کر آرام کیا۔ پامر صاحب کو بہت با اخلاق پایا۔ وہ ہمارے کمرے میں ہم سے ملنے کو آئے۔ ہم نے جبل پور سے ناگ پور تک ڈاک کے بندوبست کی ان سے فرمائش کی۔ ہمارے انتظامِ سفرِ یورپ کی پہلی غلطی ہم کو یہ معلوم ہوئی کہ ہم نے پہلے سے جبل پور پہنچنے کی تاریخ مقرر نہیں کی تھی اور اسی سبب سے قبل پہنچنے جبل پور کے ڈاک کا کچھ بندوبست نہ کیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ جب پہنچیں گے اس وقت یا پھر دوپہر بعد یا دوسرے دن مل جائے گی مگر یہ خیال بالکل غلط نکلا اور ہم کو گھوڑوں کی شکرم کی ڈاک، جو مطلوب تھی، نہ ملی۔ ہورڈ برادر نے جواب دیا کہ سترھویں تاریخ تک گھوڑے ڈاک کے خالی نہیں۔ جارڈین صاحب کے پاس سے بھی اسی قسم کا جواب ملا۔ اب تو ہم گھبرائے اور یقین ہوا کہ ہم نویں تاریخ تک بمبئی نہیں پہنچ سکتے اور نہ کسی طرح دسویں تاریخ تک کا جہاز ہم کو مل سکتا ہے۔ مسٹر پامر صاحب کی صلاح سے ہورڈ برادر کے کارخانے میں سے بیلوں کی دو شکرمیں کرایہ کیں اور تیسری رات آٹھ بجے رات کے روانہ ہوئے۔ راستے میں کہیں توقف نہیں کیا۔[2]

ناگ پور تک شکرم کا پُر صعوبت سفر

جبل پور سے ناگ پور تک بڑی تکلیف سے راستہ طے ہوا۔ سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ بیلوں کی شکرم سواری کو تھی جو "ہائے ہائے، ہانکو ہانکو" کرنے پر بھی بڑھیا کے چرخے سے بھی

آہستہ چلتی تھی۔ کھانے کی راستے میں بہت تکلیف تھی اور پانی کی اس سے بھی زیادہ۔ بسبب خشک سالی کے تمام کنوئیں خشک ہو گئے تھے۔ بعضوں میں تو مطلق پانی نہ تھا اور بعضوں میں اس قدر رستا تھا کہ دس بیس منٹ میں ایک لوٹا بھر سکیں اور بعضوں میں پینے کے لائق پانی مل سکتا تھا۔ اکثر جگہ خشک کنوئیں کھود کر اَور گہرے کئے جاتے تھے' غرض کہ پانی کی بہت قلت تھی۔ علاوہ اس کے دن کی دھوپ اور گرمی اور ہوا بند ہونے پر جس کی گھمس اور ہوا چلنے پر گرم ہوا کی دقت اور لُو کی کیفیت اَور بھی زیادہ تکلیف دیتی تھی......... پانچ پانچ میل کے فاصلے پر بیلوں کی چوکی تھی جہاں شکرم کے بیل بدلے جاتے تھے۔ جبل پور سے دھومان کی چوکی آٹھویں چوکی تھی۔ قریب ایک بجے کے وہاں پہنچے۔ اس جگہ ایک ڈاک بنگلہ ہے۔ وہاں بھی بہت سے انگریز اور میم اور بچے اترے ہوئے تھے۔ ہم ایک درخت کے نیچے ٹھہرے اور بازار سے دودھ منگا کر پیا۔ نہایت عمدہ اور شیریں اور گاڑھا دودھ تھا خانساماں سے ایک مرغی مول لی اور جھجو نے اس کا قورمہ پکایا اور خانساماں نے اپنے گھر سے پراٹھے پکوائے۔ وہ سب لے کر ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور شکرم میں بیٹھے ہوئے کھاتے چلے۔[1]

تین دن اور تین رات برابر چلے اور ایک سخت سفر اٹھا کر چھٹی اپریل ۱۸۶۹ء کو شام کے وقت ناگ پور میں پہنچے اور ریل کے اسٹیشن کے پاس.......... گئے۔ وہاں دیکھا کہ تمام کمرے انگریزوں اور میموں اور بچوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا کمرہ کونے کا اور گودام کے مکانوں میں ایک کمرہ' جس کو مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے درست کر لیا تھا' خالی ہیں۔ ہم نے ان ہی کو غنیمت سمجھا اور دونوں کمروں میں اترے اور بیلوں کی شکرم کی مصیبت کا سفر ختم ہوا۔[2]

ریلوے اسٹیشنوں پر ٹھنڈے پانی کی سبیلیں

ناگ پور سے ساتویں تاریخ آٹھ بجے دن کے ریل پر سوار ہوئے[1]

ہم بلگام اسٹیشن پر پہنچے تو ہم نے تین برہمنوں کو' جن میں سے ایک معزز معلوم ہوتا تھا اور پوشاک بھی معقول پہنے ہوئے تھا' دیکھا کہ لوگوں کو نہایت تمیز و صفائی سے پانی پلا رہے ہیں اور پانی بھی نہایت عمدہ' صاف' میٹھا' بہت ٹھنڈا' باسی ہے۔ وہ معزز برہمن پکارتا ہے کہ ریل والو' بہت ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ پینے والو پانی پیو' بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ برتن بھی ان برہمنوں کے' جن سے وہ پانی دیتے تھے' نہایت اچھے اور صاف خوب صورت تھے۔ اگرچہ شاید یہ انتظام بالتخصیص ہندوؤں کے آرام کے واسطے ہو مگر وہ سب کو پانی دیتے تھے اور تمام مسافروں کو نہایت آرام تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہم متعجب ہوئے۔ جب تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ جیون رام جادو اسیٹھ ساکن کامپٹی نے اس

اسٹیشن پر دھرم کے لئے پو (سبیل) بٹھائی ہے اور پانی پلانے کا بندوبست کیا تاکہ مسافروں کو اور بالتخصیص ہندوؤں کو تکلیف نہ ہو اور اسی سبب سے ایسا عمدہ سامان اور ایسا اچھا باسی ٹھنڈا پانی ہے۔ یہ بات مجھے نہایت پسند آئی اور دل میں بیٹھ گئی اور جب زیادہ تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ہر اسٹیشن پر جو کسی قصبہ یا شہر کے متصل ہے کسی خاص مہاجن نے، ورنہ اس شہر یا قصبہ کے دکانداروں نے آپس میں چندہ کر کے پو بٹھا رکھی ہے اور پانی پلانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ چنانچہ ہر ایک اسٹیشن پر ہم کو چندے کی بٹھائی ہوئی پو ملی، الا ویسی خوبی اور خوش اسلوبی اور پانی کی احتیاط دوسری جگہ نہ تھی۔[۱]

تار بابو کی دانائی کا معاوضہ

ایک اسٹیشن سے مجھے تار میں خبر بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ میں نے پرچہ پیام انگریزی میں لکھا ہوا تار گھر میں دیا اور ایک ناگر نے، جو خبر بھیجتا تھا، لے لیا اور حساب کر کے تین روپے طلب کئے جو درحقیقت صحیح محصول اس کا تھا، چنانچہ میں نے تین روپے دے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناگر میرے پاس آیا اور کہا کہ اگر میں تمہارا ایک روپے کا فائدہ کر دوں تو آٹھ آنے مجھے دو گے؟ میں نے کہا کہ کیونکر؟ اس نے کہا کہ دو لفظ اس خبر میں بلانقصان مضمون کم ہو سکتے ہیں اور ان کی کمی سے صرف دو روپے محصول رہ جائے گا۔ اس میں کمپنی کی کچھ چوری نہیں۔ میں نے اپنی عقل سے تمہارا ایک روپیہ بچایا، اس کے عوض میں آٹھ آنے چاہتا ہوں "نصف لی ونصف لکم"۔ اس کی اس بات نے مجھے عجب مزا دیا اور میں نے دو لفظ کاٹ دیئے، روپیہ پھیر لیا اور آٹھ آنے اس کی دانائی اور اپنی حماقت کی نذر کئے۔[۵]

بمبئی پہنچنے پر دوستوں کا استقبال

تمام مسافر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے، جو بمبئی جاتے ہیں، وہ ایک اسٹیشن ورے یعنی بائی کلا اسٹیشن پر اترتے ہیں کہ یہاں سے ہوٹلیں اور شہر قریب پڑتا ہے اس لئے ہم نے بھی بائی کلا اسٹیشن تک کا ٹکٹ لیا تھا اور وہیں اترے۔ جوں ہی ہم اسٹیشن میں داخل ہوئے ہم نے اپنے مہربان دوست مسٹر نوروزجی پارسی کو اور اپنے شفیق مرزا محمد علی بیگ کو اسٹیشن پر کھڑا پایا۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ادھر ہم ان کو دیکھ کر خوش ہوئے، ادھر وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ مگر جب ہم گاڑی پر سے اترے اور دیکھا کہ مرزا محمد علی بیگ بسبب ناموافقت آب و ہوائے ناگ پور و بمبئی بہت دبلے و ضعیف ہو گئے ہیں اور ان کا دل بھی ہشاش بشاش نہیں ہے بلکہ نہایت افسردہ و پژمردہ ہے تو ہم کو نہایت رنج اور افسوس ہوا۔ مسٹر نوروزجی نے ہم پر بڑی مہربانی کی۔ فی الفور اسباب

ہمارا اپنے ایک آدمی کی سپردگی میں کیا اور چھکڑے پر لدوا کر ہوٹل کو روانہ کیا اور دو گھوڑوں کی پالکی گاڑی ہمارے لئے موجود تھی اور وہ خود ہمارے ساتھ ہوئے اور پالن جی کے ہوٹل پہنچا دیا۔[11]

ہوٹل میں قیام و طعام

خدمتی حاضر باش اور غریب فرماں بردار اور اپنے کام میں ہوشیار .... مگر سب کے سب ہندوستانی عیسائی .... محمد محمود نے ان سے کہا کہ ہمارے لئے بغیر ذبح کی ہوئی مرغی مت پکانا۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہمیشہ مرغی و کبوتر کو ذبح کر کے پکاتے ہیں اور باقی گوشت مسلمان قصاب لاتا ہے۔ ہروقت ہوٹل میں متعدد قسم کا عمدہ کھانا تیار رہتا ہے۔ بہت سے انگریز بھی ٹھہرے ہوئے تھے مگر ہم نے دو کمرے اس ہوٹل میں لئے۔ چار پلنگ ان میں آراستہ ہوئے۔ ہم وہاں نہائے دھوئے، کپڑے بدلے میں اور حامد اور مرزا خداداد بیگ دو گھوڑوں کی گاڑی میں سوار ہو کر شہر و بازار کو روانہ ہوئے۔[12]

بمبئی میں مصروفیات

دستاویزاتِ سفر کا حصول

اول ہم گنیش داس کشناجی کی دکان پر گئے اور ان کے گماشتے کو ہنڈیاں دے کر روپیہ چاہا۔ مالک کوٹھی وہاں نہ تھے۔ گماشتے نے نوٹ اور ہنڈیاں ایک برہمن کے سپرد کر کے ہمارے ساتھ کیا کہ سیٹھ جی کے پاس لے جاؤ جو قلعہ کی کوٹھی میں گئے ہیں۔ چنانچہ ہم وہاں گئے۔ سیٹھ جی بہت خاطر تواضع اور اخلاق سے پیش آئے اور ہنڈیوں پر بھر پائے لکھوا کر نوٹ ہمارے حوالے کئے اور ایک آدمی دیا کہ ہم کو پی اینڈ او کمپنی جہاز کا دفتر بتلا دے۔ ہم نے ان کا شکر ادا کیا اور کمپنی کے دفتر میں آئے۔ وہاں کے منیجر صاحب نے چند خطوط و چٹھیات وغیرہ کاغذات، جو احباب نے ہمارے نام ان کے پتے سے بھیجے تھے، سب حوالہ کئے۔ ہم نے نوٹ کرایہ جہاز کے ان کو دیئے اور چٹھی رسید کرایہ جہاز اور ٹکٹ ہائے ریل عمل داری مصر' .... سویز سے اسکندریہ تک .... 'ان سے لے لئے۔ مصر کی ریل کے ٹکٹ انگریزی میں چھپے ہوئے بطور بیاض کے منیجر صاحب کے پاس موجود تھے۔ صرف نام کا خانہ خالی تھا اور اس پر ڈائریکٹر ریلوے مصر کی مہر عربی زبان و عربی خط میں ثبت تھی۔ ہم نے ہرچند کوشش کی کہ اس مہر کو پڑھیں مگر ہم سے نہیں پڑھی گئی .... منیجر صاحب نے ان پر ہمارا نام لکھ کر ہم کو دے دیا اور نصف مثنیٰ بیاض میں لگا

رکھا۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ سفید رنگ کا اور سیکنڈ کلاس کا' جو ہم کے لئے لیا ہے' سرخ رنگ کا ہمارے پاس الہ آباد کے نوٹ تھے' ہم نے وہ دینے چاہئے۔ منیجر صاحب نے کہا کہ اول .... ان کو ٹریژری سے بدلوا لو' وہاں بغیر بٹے کے بدل جائیں گے۔ تب بمبئی میں خرچ کرنا۔[1]

ایک پرستار بزرگ سے ملاقات

شام کے وقت میں اور محمود اور مرزا خداداد بیگ پھر سوار ہوئے اور بھنڈی بازار میں مرزا محمد علی بیگ صاحب سے ملنے کو گئے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور ہم سب ایک کتب فروش کی دکان پر بیٹھ گئے اور بازار کی اور لوگوں کے آنے جانے کی سیر دیکھا کئے۔ وہاں میر اشرف علی ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمارا وطن اور یہ کہ ہم کہاں جاتے ہیں' پوچھا۔ جب کہ انہوں نے جانا کہ ہم دہلی کے رہنے والے ہیں تو انہوں نے دہلی کے لوگوں کا حال پوچھا اور سید الاخبار کا' جو ایک زمانے میں ہمارے ہاں سے باہتمام سید عبدالغفور پدر حافظ عبدالرزاق مہتمم اخبار سائنٹیفک سوسائٹی نکلتا تھا' ذکر کیا اور کہا کہ سید احمد ایک ایسے شخص دہلی میں تھے جنہوں نے رسالہ "تسہیل فی اعمال جرالثقیل" اور رسالہ "نتائج الافکار فی اعمال الفرجار" اور "آثارالصنادید" لکھی اور "جوادالدولہ" ان کا خطاب تھا' اب وہ کس طرح ہیں اور کہاں ہیں؟ میں نے کہا کہ فضلِ الٰہی سے بہت خوش و خرم ہیں اور آپ کے سامنے بیٹھے ہیں" ۔ وہ دفعتاً کھڑے ہو گئے اور نہایت خوشی اور شوق سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوئے اور دیر تک کچھ ریاضی کی اور کچھ مسائلِ فقہ کی اور تقلید وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔[2]

ہم مشربوں کے ساتھ نماز کی ادائیگی

اسی دکان کے قریب ایک مسجد .... میں مغرب کی نماز کی اذان ہوئی۔ ہم لوگ نماز کو اٹھے اور محمود بھی نماز کے لئے ہمارے ساتھ ہوا۔ چلتے وقت مجھ کو خیال ہوا کہ ہماری قطع اور وضع لباس دیکھ کر ضرور لوگ متعجب ہوں گے مگر وہاں دیکھا کہ بہت سے آدمی ہماری سی سرخ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اتنا تو لوگوں نے دیکھا کہ کوئی شخص نماز کو آیا مگر اس کے سوا اور کچھ خیال بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ اکثر ترک ان مسجدوں میں نماز کو آجاتے ہیں اور ان کی وضع اور لباس بالکل ہمارا سا ہوتا ہے اس لئے کسی کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔ مسجد کا امام شافعی مذہب تھا۔ نمازی' جو قریب سوا سو ڈیڑھ سو آدمیوں کے ہوں گے' نصف سے زائد شافعی مذہب تھے (شاید ان میں کوئی غیر مقلد بھی ہو) امام کے پیچھے الحمد پڑھتے تھے اور پکار پکار کر آمین کہتے تھے۔ میری بھی خوب بن آئی اور اپنے ہم مشربوں کے ساتھ نہایت دلی صدق سے پکار پکار کر

آمین کہی۔ حتیٰ اہتزالمسجد۔ تعجب یہ ہے کہ محمود نے بھی' جواب تک حنفی مذہب کے مطابق نماز پڑھتا ہے' پکار پکار کر آمین کہی۔ مسجد سے نکلنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیوں پکار کر آمین کہی؟ اس نے کہا کہ بہت سے مسلمان کہہ رہے تھے' میرے دل نے بھی چاہا میں نے بھی پکار کر کہی۔[1]

مشہور دولت مند پارسی سہراب جی سے ملاقات

نویں اپریل کو ہمارے دوست مسٹر سہراب جی نے بمبئی کے نہایت عمدہ انبہ ہم کو بھیجے اور نو بجے خود بھی ملاقات کو آئے اور ہم چاروں آدمی ان کے ساتھ ان کی کوٹھی واقع قلعہ میں گئے.......... ہمارے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آئے۔ جب کہ ۱۸۶۸ء میں سہراب جی نوروز جی ہندوستان کی سیر کو آئے تھے تو بنارس میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ آج ہم کو بہت کام تھے اور متعدد محکموں میں جانا تھا' تھوڑی دیر بعد ہم ان سے رخصت ہوئے۔ انہوں نے نہایت مہربانی سے اپنا جمعدار' جو نہایت عمدہ سیاہ بانات کی سنہری لیس دار وردی پہنے ہوئے تھا اور تمام مقاموں اور محکموں سے واقف تھا' ہمارے ساتھ کیا۔[2]

زرِ مبادلہ اور تنخواہ کی وصولی

اول ہم ٹریژری میں گئے اور الہ آباد نوٹوں کو بمبئی نوٹوں سے بدلوایا۔ مبادلے کے افسر نے پوچھا کہ تم جہاز کے مسافر ہو؟ ہم نے کہا "ہاں"۔ اس نے نوٹ لئے اور ایک پرچہ لکھ کر دوسری جگہ بھیج دیا اور بمبئی نوٹ آ گئے۔ پھر ہم نے سو ساورن خرید کئے۔ چار آنے فی ساورن مبادلہ دینا پڑا اور اس طرح پر سو ساورن ہمارے پاس آ گئے۔ ان دنوں میں اورنٹیل بنک میں سات آنے فی ساورن مبادلے کا بھاؤ تھا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم اکاؤنٹنٹ کے دفتر میں گئے اور سرٹیفکیٹ تنخواہ کا' جو ولایت میں انڈیا آفس سے تنخواہ ملنے کا تھا' بدلوایا اور دس دن کی تنخواہ کا بل بہ تعداد ایک سو بتیس روپے کئی آنے کا لیا اور پھر ٹریژری میں آن کر اُس کا روپیہ وصول کیا۔[3]

بڑودہ جہاز کی سیر

ان سب کاموں سے فراغت ہو کر سب کی صلاح ہوئی کہ بڑودہ دخانی جہاز کو' جس پر ہم سوار ہوں گے' دیکھنے چلو۔ چنانچہ ہم سب میزیگان بندر پر آئے جہاں بڑودہ دخانی جہاز لنگر ڈالے ہوئے تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کنارے سے تخمیناً دو میل فاصلے پر وہ جہاز کھڑا ہے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی کشتی' جسے یہاں کے لوگ "بوٹ" کہتے ہیں' آمد و رفت کے لئے دو روپے کرایہ

کی۔ اس میں سوار ہوئے اور پہلی مرتبہ سمندر میں قدم رکھا۔ چلو میں ذرا سا پانی لے کر چکھا۔ نعوذ باللہ منھا' منہ پر نہ رکھا نہیں جاتا۔ بالکل ایسا ہوا ہے جیسے کہ پانی میں نہایت کھاری اور شور نمک گھول دیا ہو۔ سبحانہ وتعالیٰ شانہ۔ جاتے وقت ہوا موافق تھی اور ملائم بھی تھی۔ اس پر بھی وہ بادام کے آدھے چھلکے برابر کشتی ایسی کروٹیں لیتی تھی کہ کبھی یہ کنارہ اور کبھی وہ کنارہ پانی کے برابر ہو جاتا تھا۔ ملاح نے اسی کشتی میں بادبان چھوڑا اور موافق ہوا کے دھارے پر چھوڑ فی الفور بڑودے تک پہنچا دیا۔ ہم سیڑھی پر سے بڑودے پر چڑھے اور اندر جا کر سیر کی۔ جہاز کو اور جہاز کے کمروں کو مثل بادشاہی محل کے آراستہ پایا۔ عمدہ عمدہ میزیں اور کرسیاں اور جابجا شیشے کی جڑی ہوئی لالٹینیں اور چھوٹے چھوٹے آراستہ کمرے ضروری سامان سے سجے ہوئے تیار تھے۔ تھوڑی دیر ہم نے وہاں کی سیر کی اور پھر اپنے اسی بادام کے آدھے چھلکے پر سوار ہو کر شہر میں آنے کا ارادہ کیا۔[۱]

تند و تیز ہوا اور موجوں کا کشتی سے تصادم

اس وقت ہوا تند ہو گئی تھی اور آتے وقت مخالف بھی اور اس ظالم ملاح نے منع کرتے کرتے بادبان کشتی کا کھینچا اور بولا کہ تھوڑا سا چکر دے کر ابھی پہنچاتا ہوں۔ کھینے میں بڑی محنت ہو گی اور بہت دیر لگے گی۔ غرض کہ کشتی اور سمندر کی جانب چلی اور وہ بادبان کو منحرف کر کے کشتی کو قریب تین چار میل کے اوپر چڑھا کر لے گیا۔ ہوا کے صدمے سے کشتی لوٹ پوٹ ہو ہو جاتی تھی اور لہروں کے مارے اونچی اٹھتی تھی اور نیچے گرتی تھی۔ ہم لوگ جامنوں کی طرح ہلتے تھے' کبھی اس کنارے سے ٹکراتے تھے کبھی اُس کنارے جھک جاتے تھے۔ اگرچہ ہم میں سے کوئی خوف زدہ نہ تھا' آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے اور جب کشتی ٹیڑھی ہوتی تھی تو ہنس ہنس کر کوئی "اواو" کہتا تھا' کوئی "بسم اللہ" کہتا' کوئی "اللہ اکبر" کہتا تھا اور ملاح کہتا تھا "تم ڈرو مت' اگر کشتی کا ایک سرا پانی کے اندر چلا جائے اور پھر نکلے اور بیٹھ جائے یا کشتی پر لہر پھر جائے تو بھی کچھ اندیشہ نہیں ہے"۔ میں نے اس سے کہا کہ آخر کہاں لئے جاتا ہے؟ وہ یہی کہتا تھا کہ تھوڑی دور اَور چلو۔ غرض کہ کئی میل اوپر لے جا کر اس نے کشتی کو سیدھا گھاٹ کی طرف چھوڑا اور بہت جلد گھاٹ پر آ لگایا۔ قریب چھ سات میل کے چکر دیا ہو گا۔ آج کے سوا کبھی تمام عمر نہ ہم نے اتنا چوڑا اور اس قدر عمیق پانی دیکھا تھا' نہ اتنی چھوٹی کشتی میں بیٹھے تھے' نہ ایسی سخت ہوا اور اتنی بڑی موجوں میں پڑے تھے۔[۲]

اسباب کی گودام کو روانگی

دسویں اپریل ۱۸۶۹ء کو قریب نو بجے کے مسٹر سہراب جی ہم سے ملنے آئے اور رخصت کر

گئے اس لئے کہ ان کو ایک مقدمے کی جیوری میں جانا تھا۔ ہم نے اسباب مع کچھو کے اسٹیمر کے گودام میں بھیجا اور ہم چاروں آدمی سوار ہو کر ایک سوداگر کی دوکان میں گئے اور وہاں کچھ دوائیں ضروری خریدیں۔ پھر گودام پر جا کے دیکھا کہ سب اسباب گودام میں داخل ہو گیا۔[۱]

ایجنٹ نے ایک ٹکٹ دیا کہ فلاں وقت پر فلاں گھاٹ پر ایک چھوٹا اسٹیمر مسافروں کو بڑے جہاز تک لے جانے کو آئے گا۔ آپ اس پر سوار ہوں کیونکہ بڑا جہاز بمبئی کے کنارے تک نہیں آتا۔[۲]

بمبئی کی گھوڑ بردار اومنی بسیں

نئی بات بمبئی میں یہ دیکھی کہ بڑے بازاروں میں انگلستان کے طریقے پر اومنی بس گاڑیاں دو گھوڑوں کی اور تین گھوڑوں کی کھڑی رہتی ہیں اور پھرتی ہیں اور جس کو کہیں جانا ہوتا ہے خفیف کرایہ دیا اور اس میں بیٹھ گیا۔ اومنی بس ایک بڑی گاڑی ہے جس کے اندر دو طرفہ اور اس کی چھت پر بھی دو طرفہ بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اوپر اور اندر قریب چوبیس آدمیوں کے بیٹھ سکتے ہیں اور جس گلی یا مکان میں جس کو اترنا ہوتا ہے اتر لیتا ہے اور چڑھنے والے ہر جگہ سے سوار ہو جاتے ہیں۔[۳]

جوان پارسی لڑکیوں کی بے مقصد انگریزی تعلیم

بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے۔[۴]

.... ہر ایک پارسی انگریزی پڑھا ہوا ہے اور باایں ہمہ اپنے مذہب کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور نہایت پابند اپنے اصولِ مذہب کے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بعض پارسی اپنی لڑکیوں کو انگریزی بھی پڑھاتے ہیں۔ کوئی سکول ہے' وہاں اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس برس کی عمر کی لڑکیاں انگریزی پڑھنے کو جمع ہوتی ہیں اور بخوبی پڑھ گئی ہیں۔ انگریزی بولتی ہیں اور چٹھی لکھتی ہیں مگر میں نہیں سمجھا کہ اپنی زبان چھوڑ کر پارسیوں کو لڑکیوں کے انگریزی پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟[۵]

میمنوں کا نام آوری کے لئے مسجدیں بنانے کا شوق

اس شہر میں غالباً تمام ملکوں کے لوگ موجود ہوں گے مگر میمن اور پارسی یہاں کے بڑے امیر آدمی ہیں.......... میمنوں نے بجز اس کے کہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور اپنی شیخی کے پیچھے مرتے ہیں اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔ مسجد بنانے کا بڑا شوق ہے۔ بہت سے میمن ہیں جن کے ہاں تھوڑا تھوڑا لنگر خانہ جاری ہے'

ان کی نام آوری کے لئے برائے نام ایک مدرسہ ہے' ایک مُلا اس میں پڑھانے کو نوکر ہے۔ بیر نابالغ برائے نام طالب علم ہیں' لنگر خانہ سے روٹی پاتے ہیں' دن کو ایک آدھ برائے نام سبق پڑھا پھر کسی میمن کے لڑکے کو پڑھانے چلے گئے۔ کوئی شخص کسی اور طرح سے خیرات مانگنے کا پیشہ کرنے چلا گیا۔ مجھ کو یہ حال دریافت ہونے سے نہایت افسوس ہوا اور میں نے کہا دیکھو قوم کا جو ادبار ہے تو باوجودیکہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بری طرح خرچ ہوتا ہے جس سے نہ دین کا فائدہ' نہ دنیا کا۔ البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلاں میمن کا مدرسہ ہے۔ علاوہ اس کے دو کٹ مُلا خوشامدیوں نے تعریف کر دی اور کہا کہ آپ نے تو جنت میں ایک موتی کا محل بنالیا۔ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ وہ لوگ مر گئے جو موتی کا گھر بناتے تھے۔ ایسی باتوں سے تو پھوٹی کھپریل کا بھی گھر نہیں بنتا۔⑴

راستے میں رحمت اللہ سلیمان میمن سوداگر کی دوکان پر ٹھہرے۔ اس نے بڑی خاطر کی اور چار پانچ بوتل لیمنڈ پانی پلایا۔ میں نے اس کو بہت ترغیب دی کہ میمنوں نے جو متفرق چھوٹے چھوٹے نامعقول صرف نام کے لئے مدرسے بنا رکھے ہیں' ان کو موقوف کریں اور سب میمن مل کر ایک بڑا نہایت عمدہ عربی کا کالج بنائیں اور جوان اور لڑکے طالبعلم اس میں بھرتی کریں اور انتظام سے قواعد مدرسہ جاری کریں تو البتہ فائدہ کی بات ہے۔ اور یہ بوڑھے طوطے' جن کا نام طالب علم رکھا ہے اور کوئی بھیک مانگتا ہے اور کوئی کسی کے گھر پڑھاتا ہے' ایسے لوگوں کو روٹی دینا اور مدرسے کا نام کرنا صرف روپے پیسے کا ضائع کرنا اور علم کو برباد کرنا بلکہ سمندر میں ڈبونا ہے جس میں ذرا بھی ثواب نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ آپس میں نہایت نا اتفاقی ہے اور ایک' دوسرے کی حقارت اور اپنی شیخی اور نمود چاہتا ہے۔ اس طرح اتفاق کا ہونا مشکل ہے۔ میں نے کہا" تم سچ کہتے ہو۔ جب کسی قوم پر خدا کی غضبی ہوتی ہے اور ذلت اور ادبار آتا ہے تو ایسی ہی مت ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی تم اس کا چرچا کرنا اور کہنا کہ ایک شخص ہندوستان سے آیا تھا اور وہ ایسی ایسی باتیں کرتا تھا۔"⑵

جہاز میں آمد اور روانگی کی تیاری

تھوڑی دیر بعد ہم وہاں سے اٹھے اور بہت سے سوداگروں کی دکانوں پر گئے۔ کچھ ضروری چیزیں خرید کیں۔ دو بجے کے قریب پھر میرگان بندر پر آئے۔ چجو کو ساتھ لیا۔ اس وقت ایک چھوٹا گن بوٹ مسافروں کو جہاز تک لے جانے کو موجود تھا۔ ہم سب اس پر سوار ہوئے۔ تین بجے اس نے لنگر اٹھایا اور بڑودہ دخانی جہاز میں ہم سب کو جا اتارا۔⑶

جب جہاز میں پہنچے تو اپنا کمرہ آراستہ اور مرتب پایا اور ہمارا اسباب کمرے میں نہایت خوبی

ہے سجاہوا تھا' اور جو غیر ضروری تھا وہ تہ خانہ میں رکھ دیا گیا تھا۔[1]

بہت سے انگریز اپنے دوستوں کو جہاز میں پہنچانے آئے تھے۔ ہمارے جہاز میں سوار ہونے کے دو گھنٹے کے بعد "ہنری الیس کنگ اینڈ کو" کے ایجنٹ جہاز میں ہمارے پاس آئے اور مسٹر والنزامسۃ صاحب کی چٹھی' جس میں اَور کاغذات ضروری ہمارے نام کے ملفوف تھے' پہنچائی اور ہم نے دونوں صاحبوں کا بہت شکر کیا۔[2]

بحری سفر کا آغاز

سمندر اور آسمان کی کیفیت

قریب چھ بجے شام کے دسویں اپریل ۱۸۶۹ء روز شنبہ کو جہاز نے لنگر اٹھایا اور ہم نے نہایت صدقِ دل سے آیت بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا ان ربی لغفور رحیم پڑھی اور روانہ ہوئے۔[3]

ہم بمبئی سے چلے تو تھوڑی دیر میں ہماری آنکھ سے زمین غائب ہو گئی اور بجز پانی کے اَور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا کنارہ آسمان سے ملا ہوا اور آسمان مثل سرپوش کے پانی کے اوپر ڈھکا ہوا ہے۔[4]

ناسازیٔ طبیعت

سمندر کی فضا اور پانی پر کی سیلی سیلی ہوا گرمی کے موسم میں نہایت اچھی اور خوش گوار معلوم ہوتی تھی۔ شام کے وقت جب ہم کھانے پر گئے اور کچھ تھوڑا سا کھایا تھا کہ جہاز کی حرکت سے' جو تھوڑا تھوڑا کروٹ کے بل ہلتا تھا' سر کا بھیجا ہلتا ہوا معلوم ہوا جس کروٹ جہاز جھکتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر میں اس طرف کوئی نہایت بوجھل اور بھاری چیز آ پڑی اور دوسری طرف سر خالی ہو گیا۔ اور جب دوسری طرف جہاز کروٹ لیتا تھا تو اس وقت تمام بوجھ سر کا اس طرف جا پڑتا تھا اور ادھر سے سر خالی ہو جاتا تھا۔ اور چونکہ یہ حرکت جہاز کی بہت جلد جلد ہوتی تھی اس لئے سر میں بھی یہ کیفیت بہت سریع پیدا ہوتی تھی۔ ہم گھبرا گئے اور کھانے پر سے اٹھ کر جہاز کی چھت پر چلے گئے۔ ذرا ٹہلے' کسی قدر یہ کیفیت کم ہوئی۔ پھر سونے کا وقت ہوا' سو رہے۔ صبح کو اٹھے۔ میں نے بخوبی نماز پڑھی اور کچھ تغیرِ مزاج نہیں پایا۔ خداداد بیگ نے بھی کہا کہ مجھے تو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ محمود کچھ گم سم تھا اور لیٹا جاتا تھا۔ حامد کو زیادہ تغیر تھا کہ اس کا سر بھاری تھا اور جی متلاتا تھا اور منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ دوپہر کے قریب میری طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور سر میں ایسی حرکت تھی کہ مطلق اٹھا اور کھڑا ہوا نہیں جاتا تھا۔ محمود کی اگرچہ یہ کیفیت نہ تھی مگر دن رات بچھونے پر پڑا رہتا تھا۔ حامد کا

سب سے زیادہ برا حال ہوا۔ اس سے اندر آیا نہیں جاتا تھا۔ چار دن رات وہ جہاز کی چھت پر پڑا رہا اور مطلق کچھ نہیں کھایا۔ کھانے کے نام سے اور اس کی بو سے نفرت ہوتی تھی اور ابکائی آتی تھی۔ بہرحال ڈیڑھ دن اور ایک رات میری طبیعت پر تغیر رہا' پھر میں اچھا ہو گیا۔[1]

محمود کا اسپرٹ ملی دوا پینے سے انکار

جہاز کے ایک افسر نے محمود کا یہ حال دیکھ کر کہا کہ میں ڈاکٹر کے پاس سے ابھی دوا لاتا ہوں' اور خود جا کر گلاس میں دوا بنوا کر اپنے ہاتھ میں لایا اور یہ بھی کہا کہ اس میں تھوڑی سی اسپرٹ ہے۔ وہ شراب نہیں ہے' اس کو کوئی پیتا نہیں ہے' دواؤں میں کام آتی ہے۔ محمود نے ان کا بہت شکر کیا اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف ہوئی مگر میں اسپرٹ ہونے کے سبب نہیں پی سکتا۔ اول تو اس بے چارے نے بہت سمجھایا' جب محمود نے نہ مانا تو اس نے کہا کہ میں پھر جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسی دوا دو جس میں کسی قسم کی اسپرٹ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بے چارہ مہربان بغیر اسپرٹ کے دوا بنوا کر لایا' محمود کو پلائی اور در حقیقت اس نے بہت فائدہ کیا۔[2]

آرام چوکیاں نہ لانے کی غلطی کا احساس

ایک غلطی بسبب ناتجربہ کاری کے ہم سے یہ ہوئی کہ ہم نے کوئی آرام چوکی اپنے ساتھ نہیں لی۔ اکثر مسافر اپنے ساتھ لائے اور بہت آرام پایا۔ اکثروں کے پاس اس قسم کی آرام چوکی تھی جو بیچوں پر توٹ کر اکٹھی ہو جاتی ہے اور جب بچھاؤ تو پھیل جاتی ہے۔ ہم نے دو تین صاحبوں کو دیکھا کہ اسی قسم کی نئی کرسیاں بمبئی سے خرید کر اور اپنے ساتھ لے جا کر جہاز میں چڑھے۔ اس وقت ہم حیران ہوئے کہ کرسیاں اپنے ساتھ کیوں لئے جاتے ہیں' مگر جب رات ہوئی اور ان کرسیوں کو چھت پر بچھا کر وہ بیٹھے اور سوئے اس وقت ہم کو ان کی قدر ہوئی مگر ہم کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی۔ بہت سے صاحب تھے جن کے پاس کرسیاں نہ تھیں۔ خود جہاز کی چھت پر کرسیاں اور بنچیں بچھی ہوئی ہوتی ہیں اور تمام چھت بیٹھنے اور لیٹنے اور سونے کے قابل ہوتی ہے مگر اس قسم کی کرسی کا لانا زیادہ تر آرام کا باعث ہوتا ہے۔[3]

جہاز میں کھانے پینے کا انتظام

نشستوں کا تعین

یہ دستور ہے کہ جس قدر مسافر جہاز میں ہوتے ہیں ان سب کی گنجائش کے لائق کرسیاں اور نہایت عمدہ بنچیں لگاتے ہیں اور مسافروں کی تعداد کے موافق چھری' کانٹے' چمچے' اور خالی

رکابیاں میز پر چن دیتے ہیں۔ اس وقت مسافر اپنے اپنے نام کا ٹکٹ میز پر، جہاں اس کو کھانا منظور ہو، رکھ دیتا ہے۔ پس وہ جگہ اس کی ہو گئی۔ جب تک اس جہاز میں سفر ہے ہمیشہ وہ جگہ اس کے بیٹھنے کی ہے کوئی دوسرا وہاں نہیں بیٹھتا، یہاں تک کہ اگر کسی دن وہ شخص کھانے پر نہ آئے تو وہ جگہ خالی رہے گی، دوسرا کوئی وہاں پر نہیں بیٹھنے کا جبکہ میز تیار ہوئی فی الفور ہم چاروں آدمی گئے، ایک عمدہ جگہ دیکھ کر ہم چاروں نے چار نشست برابر کی لے کر اپنے اپنے نام کے ٹکٹ رکھ دیئے اور وہیں بیٹھا کئے۔(1)

شراب کی پیشکش

پہلی دفعہ جب ہم کھانے پر گئے تو ہمارے سامنے بھی برانڈی اور شیرے اور لال شراب، پینے کے خالی گلاس بترتیب لگائے ہوئے تھے۔ جب ہم وہاں جا کر بیٹھے ہم نے ان گلاسوں کو، جن کو شراب پینے کا سمجھا، پرے ہٹا کر اور اوندھا کر کے رکھ دیا۔ ایک قسم کی شراب ہے وہ ویسے ہی گلاس میں پی جاتی ہے جیسا کہ پانی پینے کا گلاس ہوتا ہے۔ وہ گلاس پانی پینے کو ہم نے اپنے اپنے پاس رہنے دیا۔ اسٹورڈ یعنی خدمت گار، جو یورپین تھا، یہ سمجھا کہ یہ لوگ اسی قسم کی شراب پیئیں گے جو اس گلاس میں پی جاتی ہے۔ وہ فی الفور بوتل اسی قسم کی شراب کی لایا اور مجھ کو اس نے سب میں بڑا لمبی سفید ڈاڑھی والا دیکھ کر سب سے پہلے میرے گلاس میں ڈالی۔ میں نے کہا "نو نو نو" اس نے اسی وقت ہاتھ روکا اور چند قسم کی شرابوں کے نام لینے لگا اس مطلب سے کہ وہ شراب لے آویں، فلاں قسم کی شراب لاویں۔ میں نے کہا "نو نو اونلی کولڈ واٹر" اس وقت وہ گلاس اٹھا لے گیا اور دوسرا صاف گلاس اور برف کا پانی، جو خدا کی بنائی ہوئی زندگی بخش شراب ہے، ہم سب کے آگے رکھ گیا۔ اس کے بعد کبھی ہمارے سامنے شراب نہیں لایا۔ اور سؤر کا گوشت شاید مانگنے پر دیا جاتا ہے کیونکہ کبھی کوئی ہمارے سامنے نہ لایا۔(2)

عیسائیوں کے مزے دار ذبیحہ کا تناول

تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ جو بڑے جانور ہیں اور جن میں خون زیادہ ہے جیسے بھیڑ، بکری، مینڈھا وغیرہ اس کو وہ ہمیشہ گردن کی شہ رگ میں آر پار چھری مار کر ذبح کرتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں بھی دم مسفوح ناجائز اور حرام ہے یا اس کے اخراج کا رواج ہے۔ اور پرند جانوروں کی نسبت وہ یہ کہتے ہیں کہ ان میں وہ خون جو چوپایوں میں ہے اور جو دم مسفوح کہلاتا ہے، نہیں ہے اور ان کی مثال دریائی جانوروں کی سی ہے۔ پس ان کا ذبیحہ صرف ان کا مار ڈالنا ہے اس لئے پرند

جانوروں کو ذبح نہیں کرتے ' صرف گردن توڑ کر مار ڈالتے ہیں۔ مگر چونکہ میرے نزدیک عیسائیوں کا اس طرح پر پرند جانوروں کو مارا ہوا ' جو ان کے نزدیک ان جانوروں کا اسی طرح پر ذبیحہ ہے جیسے کہ ہمارے نزدیک مچھلی اور ٹڈی کا ہے ' بموجب مسئلہ شریعت حقہ محمدیہ کے مسلمانوں کو کھانا درست ہے اس لئے میں نے اور ہمارے ساتھیوں نے ان دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزے دار گوشت مٹن اور بیف اور مرغ و کبوتر کے کھائے۔[11]

چند قابلِ ذکر ہم سفر

میجر جنرل بنگٹن سے میل ملاقات

میجر جنرل بنگٹن صاحب کمانڈر شمالی حصہ مدراس .... اول اول ہم سے اورینٹل بنک کے دروازے پر ملے اور خود ابتداً ملاقات کی کی اور بہت اخلاق کی باتیں کرتے رہے اور اس بات سے کہ ہم اور وہ ایک ہی جہاز میں سفر کریں گے ' نہایت خوش ہوئے۔ میں نے کہا کہ مارسیلز سے کیلے تک جانے میں کسی قدر تکلیف ہوگی اس لئے کہ ہم میں سے کوئی فرانسیسی زبان نہیں جانتا۔ بولے کہ نہیں ' مجھ سے جو تمہاری مدد ہو سکے گی ' کروں گا اور اگرچہ میں فرانسیسی زبان نہیں جانتا مگر میری میم صاحبہ خوب جانتی ہیں ' وہ بخوبی تم کو مدد دیں گی۔ میں نے ان کا بہت شکر کیا۔ اس وقت سے برابر جہاز میں نہایت خوبی و اخلاق سے ملتے۔[12] ....

مس کارپینٹر سے تعلیمِ نسواں پر بات چیت

مس کارپینٹر صاحبہ .... جنہوں نے کلکتہ و بمبئی میں ہندوستانی عورتوں کی تعلیم کے لئے بہت کوشش کی ہے ' وہ بھی اسی جہاز میں تھیں۔ ان سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ بہت اخلاق و تپاک سے ملیں اور نسبت تعلیمِ عورات اور نیز بہ نسبت عام تعلیم کے بہت سی باتیں ہوئیں۔ وہ اردو مطلق نہیں جانتیں اور میں انگریزی بخوبی نہیں سمجھ سکتا اس لئے مترجم کی حاجت ہوتی تھی۔ کبھی مرزا خداداد بیگ اور کبھی محمد محمود مترجم ہوتے تھے اور آپس میں بات چیت ہوتی تھی .... ان کو غریب لوگوں کی لڑکیوں کی تعلیم کا بہت شوق تھا اور ان پر محنت کرتی تھیں۔ راجہ رام موہن رائے بانی برہم مت سے بھی ان کی ملاقات تھی۔ وہ مس صاحبہ کے باپ سے ملنے برسٹل میں گئے ہوئے تھے اور اسی کے گھر میں رہتے تھے۔ وہیں بیمار ہوئے اور وہیں مرے مس صاحبہ نے ان کی اور اور لوگوں کی زبانی ہندوستان کی عورتوں کی جہالت اور بری حالت کا حال سن

کر ہندوستان میں آنے کا اور یہاں کی عورتوں کی ترقی حالت میں کوشش کرنے کا ارادہ کیا اور ہندوستان میں تشریف لے آئیں۔[۱]

لیفٹیننٹ لارنس سے مذہبی گفتگو

لیفٹیننٹ جے لارنس صاحب.......... بھی اسی جہاز میں تھے۔ ایک رات کو وہ نہایت مہربانی سے میرے پاس آکر بیٹھے اور پوچھا کہ تم لندن جاتے ہو؟ میں نے کہا "ہاں"۔ پھر کہنے لگے کہ میں مدارس سے آتا ہوں۔ میں مشنری نہیں ہوں، میرا کام توپ مارنے کا ہے مگر میں نے مدراس کے علاقے میں جو لوگوں سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تین مذہب سچے ہیں۔ ہندو، عیسائی، مسلمان۔ کیا یہ بات تمہارے نزدیک بھی سچ ہے؟ یہ سوال کرتے ہی خود ہی جواب دیا کہ میرے نزدیک تو صحیح نہیں کیونکہ صحیح مذہب صرف ایک ہی ہو گا۔ میں نے کہا کہ ہاں، متعدد مذہب جو مختلف اصول پر مبنی ہوں، سب صحیح نہیں ہو سکتے بلکہ سب مذہبوں میں صرف ایک ہی مذہب صحیح ہو گا یا مختلف اصولوں میں ایک ہی اصولِ مذہب صحیح ہوں گے۔" اس پر بولے کہ میرے نزدیک عیسائی مذہب بالکل سچا و صحیح ہے۔ میں نے کہا کہ ہر شخص اپنے مذہب کو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ کہنے لگے کہ اوروں کی سمجھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کے خیال کے صحیح ہونے اور اوروں کی سمجھ کے غلط ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کہنے لگے کہ دیکھو عیسائی قوم نے کیا کچھ کیا! انگریزوں نے تمام دنیا کی قوموں سے زیادہ خدا کی مہربانی حاصل کی ہے۔ علم اور ہنر، جیسا کہ ہمارے پاس ہے، دوسری قوم کے پاس نہیں۔ ہم ہی کو خدا نے حکمت عطا کی ہے۔ دیکھو اس دخانی جہاز کو کہ

کیا حکمت سے بنا ہے اور کس حکمت سے چلتا ہے! ریل گاڑی کی حکمت اور طاقت تم نے بخوبی دیکھی ہو گی۔ تاربرقی کی کرامت تم جانتے ہو۔ فوج کی اور جنگ کی بادشاہی قوت تمام دنیا میں ہماری سی کسی میں نہیں۔ اگر اور کوئی مذہب سچا ہوتا تو اس پر بھی خدا اس طرح مہربان ہوتا۔ میں نے کہا کہ یہ سب باتیں دنیا کے کاموں سے متعلق ہیں، ان سے اور مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ دیکھو، خدا تعالیٰ نے اپنے نیک بندے ایوب کو اور اپنے پیارے جیسس کرائسٹ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں ذرا بھی جگہ نہ دی۔ نیک بندوں کے لئے دُنیا نہیں ہے بلکہ دوسری زندگی کی نعمت ہے۔[۲]"

یہ سن کر تھوڑی دیر چپ رہے۔ میں سمجھا کہ اب بات ختم ہوئی اس لئے میں آپس کی صحبت اور ملاقات میں مذہبی گفتگو کو نہایت ناپسند کرتا ہوں بلکہ برخلاف اخلاق کے سمجھتا ہوں، مگر

افسوس کہ ان کا ارادہ اس کے ختم کا نہ تھا۔ وہ بولے کہ میں تم سے ایک بات ' جو نہایت سچ ہے اور دینی کام کی ہے اور جس پر مجھ کو بخوبی یقین ہے اور میرے دل کو بالکل تسلی ہے ' کہتا ہوں کہ بہشت کا ملنا صرف جیسس کرائسٹ پر بھروسہ رکھنے پر منحصر ہے ' اور کوئی راہ نہیں۔ میں نے کہا " صاحب ' میں کہہ چکا ہوں کہ ہر کوئی اپنے مذہب پر ایسا ہی اعتقاد رکھتا ہے " ۔ بولے کہ کیا تم بھی محمدؐ پر ایسا ہی بھروسہ رکھتے ہو جیسا کہ میں دل سے جیسس کرائسٹ پر رکھتا ہوں ؟ چونکہ ان کا یہ سوال ہمارے اعتقادِ مذہبی کے کسی قدر بر خلاف تھا کیونکہ ہم کسی شخص پر بھروسہ نہیں رکھتے بلکہ خدائے واحد پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لئے اس کا جواب دینے میں میں نے تھوڑا سا تامل کیا اور اپنے دل میں یہ خیال کر کے کہ ہرگاہ خدائے واحد پر بھروسہ ہم کو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاصل ہوا ہے تو مجازاً ہم کو کہنا کہ ہم محمدؐ پر بھروسہ رکھتے ہیں ' کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولے کہ نہیں ' تم کو دلی بھروسہ اور کامل بھروسہ نہیں ہے اس لئے کہ خود تمہاری بات اور جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو اس بات پر پورا بھروسہ اور مضبوطی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کے سوال میں کسی قدر غلطی تھی۔ سنئے کہ مجھ کو اس بات پر کہ بہشت اور نجات حاصل ہونے کے لئے بجز اس کے کہ ایک خدا پر دل سے اعتقاد رکھنا اور اسی ایک کو پوجنا جس طرح کہ ہمارے سچے پیغمبر محمدؐ نے بتایا ' اور کوئی رستہ نہیں اور میں اس بات پر ایسا یقین رکھتا ہوں جیسا کہ اس روشن ستارے کو جو ہماری آنکھ کے سامنے ہے ' دیکھ رہا ہوں۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو رہے۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ اگرچہ مذہبی گفتگو ان کی مجھے پسند نہ تھی مگر بایں ہمہ میری رائے ان کی نسبت یہ تھی کہ یہ شخص اپنے مذہب میں نہایت متوجہ معلوم ہوتا ہے ' ضرور نہایت منکسر اور با اخلاق اور بموجب اصول اپنے مذہب کے غیروں سے محبت کرنے والا ہو گا مگر افسوس کہ پھر میری یہ رائے قائم نہیں رہی اس لئے کہ اس کے بعد جب تک کہ وہ جہاز میں رہے نہ کبھی میرے پاس آئے ' نہ کبھی مجھ سے کوئی بات کی ' نہ صاحب سلامت کی۔ اگر کبھی اتفاقیہ پیش قدمی کر کے میں " گڈ مارننگ " کہتا تو ہاتھ سے سلام لیتے۔ کئی دفعہ میرا ارادہ ہوا کہ میں ان سے کہوں کہ اگر آپ میری کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں تو معاف کیجئے ' مگر چونکہ ان سے زیادہ واقفیت نہ تھی اور نہ ان کے مزاج کا حال معلوم تھا اس لئے میں نے تامل کیا۔①

میجر ڈاڈ سے تعلیمی معاملات پر تذکرے

میجر ڈاڈ صاحب ' ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ناگ پور ' بھی ہمارے جہاز میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے صاحب سلامت کی اور بات چیت کی اور بہت اخلاق سے ملے۔ ان سے بہت زیادہ ملاپ ہو

گیا .... ولایت کا اور میرے ولایت جانے کے سبب کا اور ورنیکلر یونیورسٹی کا اور سررشتہ تعلیم میں جو جو نقصان ہیں ان کا اور لڑکیوں کی تعلیم اور ان کے سکولوں کا اور ان کی تعلیم کے لائق کتابوں کا مختلف وقتوں میں ذکر ہوتا رہا۔ انہوں نے کہا کہ میری رائے میں بہت ضرور ہے کہ جب ہندوستانی نوکر ولایت جانا چاہیں ان کو گورنمنٹ پوری تنخواہ پر رخصت دے .... انہوں نے بہت سی باتیں جہاز میں مجھ کو بتلائیں، اور جو نئی چیز ظاہر ہوتی تھی فی الفور میرے پاس آتے تھے اور دکھاتے تھے اور اس کا حال بتاتے تھے۔(1)

اگرچہ بعض وجوہات سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ یا متعصب ہیں، مگر متعصب ہونے کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہوا کیونکہ میں .... ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں مگر تعصب کو نہایت برا ایک بڑا نقص اخلاقِ انسانی میں اور نیچر یعنی حکمتِ الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں تو ایسے اچھے آدمی میں .... میں ایسا نقص کیونکر خیال کر سکتا تھا مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں شخص باوصف بڑی لیاقت کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اس لئے نہیں ہوا کہ شاید وہ لامذہب ہے اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔ کہنے لگے "کیوں؟" میں نے کہا کہ جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہیں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔ یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے، مشرک، بت پرست، خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے اسی طرح گورنمنٹ اور افسرِ تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہئے جب گورنمنٹ ظل اللہ اور افسرِ تعلیم معلم صفت من صفات اللہ ہو سکتا ہے۔(2)

میجر فریزر کی فارسی کلامی

میجر ہیٹنگ فریزر صاحب متعلق حیدر آباد سے بھی ملاقات ہوئی .... یہ صاحب نہایت صفائی اور درستی سے ملے .... شرفائے اہل اسلام سے زیادہ صحبت رہی .... کہتے تھے کہ کئی سال سے فارسی بولنے کا اتفاق نہیں ہوا اس سبب سے اکثر الفاظ محاورہ سہو ہو گئے ہیں .... انہوں نے نظام کی ایک تاریخ لکھی ہے جس کا نام "الخلیفۃ ظل الالٰی نظام" ہے۔ اس کتاب کے نام کا ترجمہ ہے "دوست صادق مانظام"۔ ہمیشہ ہر روز مجھ سے پوچھتے کہ سید صاحب، مزاجِ شما خوش است؟ با آرام ہستی ہیچ تکلیف کہ نداری۔ حقیقت یہ ہے کہ ان صاحب سے مل کر میرا دل بہت خوش ہوا۔(3)

فرام جی مہربان جی پارسی کی شستہ اردو

اسی جہاز میں فرام جی مہربان جی تھالتی وار بی پارسی سے ملاقات ہوئی.......... پونا کا رہنے والا اور پونا ہی کے مدرسے میں انگریزی اور گجراتی پڑھی.......... انہوں نے مجھ سے نہایت صاف اور شستہ اردو میں بات چیت کی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ پونا کے آدمی کی ایسی صاف اردو گفتگو کہاں سے آئی؟ اس نے کہا کہ گجراتی زبان میں بہت سے فارسی لفظ ہیں اور ذرا سے تغیر میں گجراتی اردو ہو جاتی ہے۔ میں اس کا خیال رکھتا تھا اور مجھے شوق تھا۔ میں اردو صاف بولنے لگا۔ یہ سن کر میں اور زیادہ متعجب ہوا اور میں نے کہا کہ اردو نے گجرات کو بھی گھیر لیا ہے! اب مجھے شوق ہوا کہ گجراتی زبان سنوں۔ چنانچہ میرے سامنے انہوں نے آہستہ آہستہ گجراتی بولی اور اردو میں ہر ایک لفظ کو سمجھایا۔ میں نے دیکھا کہ حقیقت میں اردو ہے یا یوں کہو کہ بہت کم فرق ہے یا یوں کہو کہ سوائے چند الفاظ کے صرف لہجے کا تفاوت ہے۔[1]

جہاز پر نماز و جنازہ کا منظر

عیسائیوں کی نماز پر تاثرات

جہاز میں بھی اتوار کے دن اسی طرح نماز ہوتی ہے جیسے خشکی میں۔ دستور ہے کہ اگر کوئی پادری جہاز میں نہ ہو تو جہاز کا کپتان نماز پڑھاتا ہے۔ ہمارے جہاز میں ریورنڈ اے ٹیلر کامتی کے چیپلن ...... نے نماز پڑھائی۔ جہاز کی چھت پر سب انگریز جمع ہو گئے اور کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ گئے اور موافق اپنے دستور اور مذہب کے نماز ادا کی۔ میں بھی اسی مقام کے قریب جہاں نماز ہوتی تھی، خاموش مؤدب کھڑا تھا اور کبھی ٹہلنے لگتا تھا، کیونکہ خدا کا نام ہر طرح ادب کے لائق ہے، اور نماز کے ادا کرنے کو دیکھ رہا تھا اور خدا کی بے نیازی کی شان پر خیال کرتا تھا کہ عجب بے نیاز اور مستغنی ہے کہ اگر کوئی بت کے سامنے ڈنڈوت کرے تو اس کو کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی ٹوپی اتار کر اور کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھے تو کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی جبہ اور عمامہ پہن کر اور تسبیح گلے میں ڈال کر، کھڑا ہو کر، ہاتھ باندھ کر، ناک رگڑے تو بھی کچھ پروا نہیں اور اگر کوئی برا کہے، گالی دے، شرک کرے تو بھی کچھ پروا نہیں۔ بلاشبہ صفت استغنا اسی پر ختم ہے۔

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بہ آب و رنگ، خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

میں اسی خیال میں تھا کہ نماز ختم ہو گئی۔ نمازیوں میں سے ایک ہمارے دانا دل دا دصفت دوست نے پوچھا کہ تم نماز میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ میں نے کہا کہ کیا شریک ہوتا؟ کہا "کیوں، خدا تو ایک ہی ہے۔" میں نے کہا کہ یہی تو وہاں نہ تھا۔ سن کر چپ ہو گئے۔⑴

جنازہ کے موقع پر دل پر عجیب اثر

یہ ایک غمگین واقعہ ہمارے جہاز میں ہوا۔ کپتان دیچ ایک اور جہاز کے کپتان تھے جو بمبئی کے کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ بشدت بیمار ہو گئے تھے۔ ان کے دوستوں نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح ولایت پہنچایا جائے اس لئے انھیں اس جہاز پر لائے۔ وہ بے ہوش تھے اور رات بھر جینے کی بھی کچھ توقع نہ تھی۔ چنانچہ گیارھویں تاریخ رات کے وقت وہ مر گئے۔ ان کو دوپہر کے بعد ان کا جنازہ ایک تختہ پر بنا کر لائے اور ان پر جہاز کا نشان یعنی پھریرا ڈال دیا تھا اور شاید دونوں پاؤں میں لوہے کے دو گولے باندھ دیئے تھے۔ اس تختے کو جہاز کے کنارے پر رکھا اور پادری صاحب نے، جو جہاز میں تھے، نماز پڑھی اور تختے کو کھڑا کیا اور وہ لاش پاؤں کے بل سمندر میں کود پڑی اور سب کی نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ میرے دل پر اس بے کسی کی موت کا اور اس طرح پر جنازہ بنا کر لانے کا اور سمندر میں ڈال دینے کا ایک عجیب اثر پیدا ہوا اور فی الفور یہ شعر میرے دل میں گزرا۔

چہ آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مردن چہ بروئے خاک

جب آدمی مر گیا تو پھر جو چاہو سو کرو۔ آگ میں جلاؤ، پانی میں ڈالو، خاک میں دباؤ، جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور جو ہونا ہے وہ ہو گا۔⑵

عدن کی سیر

مقدس سرزمین عرب میں آمد

تمام راہ نہایت امن سے گزری۔ سمندر نہایت چپ چاپ سیدھا تھا۔ کہیں سمندر میں شورش نہیں ہوئی اور نہ موجیں اٹھیں اور نہ کسی طرح گھبراہٹ نے ہم کو گھبرایا۔ سمندر ایسا رہا کہ گویا ایک بڑی جھیل ہے۔⑶

چھ دن اور چھ رات اسی طرح پانی میں چلے گئے تب ۱۶ اپریل روز جمعہ کو علی الصبح بعد نمازِ فجر زمینِ مقدس عرب دکھائی دی۔ ہم کو اسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور میرے دل میں خیال گزرا کہ سبحان اللہ، اس وادیٔ غیر ذی زرع میں سے خدا تعالیٰ نے ایسا نبی اولوالعزم آخر الزماں ختم

پیغمبران' پیدا کیا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ ہمارے محسن و شفیق میجر (ڈاکٹر) صاحب نے مجھ سے آن کر کہا کہ پیغمبر کی زمین دیکھی؟ میں نے کہا "ہاں' دیکھی۔ یہی ہے جو "عربیا ڈی بلیسڈ" یعنی رحمت کیا گیا عرب کہلاتا ہے۔"

ستونیں اپریل ۱۸۷۹ء روز شنبہ کو ساڑھے سات بجے عدن پہنچے۔ جہاں جہاز لنگر انداز کیا اور ہم نے عدن دیکھنے کی تیاری کی۔

ہم چاروں شخصوں نے ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ کی اور ہم چاروں مع گجو کے اس پر سوار ہو کر کنارے پر پہنچے......... فٹن اور بگھی کرایہ کی اور قلعہ و چھاؤنی کو دیکھنے گئے۔

بازار میں وطن کی یاد

سب سے عمدہ اور عجیب اور نہایت قدیم چیز' جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہیں ہے' عدن کے حوض ہیں جن کو یہاں کے لوگ "ٹانکہ" کہتے ہیں۔ سب سے اول ہم ان ہی کے دیکھنے کو گئے......... یہاں کے عوام الناس کہتے ہیں کہ شداد کے یہ حوض بنائے ہوئے ہیں......... ان سب حوضوں کی سیر کر کے ہم بازار میں آئے اور خوب سیر کی۔ جہاں ترکاری بکتی ہے وہاں دو دکانیں بھٹے والوں کی تھیں جو کوئلوں پر بھٹے بھون کر بیچتے تھے۔ ہم کو اپنا ہندوستان یاد آیا اور چار بھنے ہوئے بھٹے ہم نے خریدے۔ پھر بازار میں آئے اور مختلف نان پزوں کی دکان سے روٹی خریدی اور ایک دکان سے سالن خریدا۔ ایک نانبائی پراٹھے پکاتا تھا' اس سے پراٹھے پکوائے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں قطب صاحب میں پراٹھے پکتے ہیں بعینہٖ اسی قطع کے اس نے پراٹھے پکائے۔ قہوہ والے کی دکان پر جا کر کھڑے ہوئے اور لوگوں کا قہوہ پینا دیکھا۔ غرض کہ خوب سیر کر کے ایک مسجد میں آئے اور جو کچھ خریدا تھا اس میں سے کچھ کھایا' کچھ بانٹا۔

مندروں کی تعمیر

جب ہم اس مسجد میں سے جس میں بیٹھے تھے' باہر آئے تو ہم نے ایک ہندو کو دیکھا۔ اس کے پاس جا بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ وہ مارواڑی ہے' بمبئی سے عدن میں آیا ہے اور عدن میں مہاجنی کی دکان کی ہے۔ مدت سے رہتا ہے اور ہمیشہ جہاز پر آتا جاتا ہے۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ عدن میں تین دیول یعنی مندر ہندوؤں کے ہیں' مہادیو کا اور ہنومان کا ایک اور کسی کا بتایا کہ میں اس کا نام بھول گیا۔ اور یہ مندر ہندوؤں کے چندے سے بنے ہیں جو عدن میں آتے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عدن تک ہندو آتے جاتے ہیں اور جہاز میں بیٹھنے سے ان کی ذات و مذہب میں کچھ فرق نہیں آتا' نہایت خوشی ہوئی۔ خدا ہمارے ملک کے ہندوؤں کو بھی یہ

دن نصیب کرے۔[۹]

اردو کا استعمال

بندہ نے الہ آباد سے بمبئی تک، کیا گاؤں میں اور کیا چوکیات میں اور کیا ریل پر اور کیا گورنمنٹ کے اہل کاروں اور ہر ایک محکمے کے چپراسیوں اور ہر ایک جگہ کے قلیوں سے اردو میں گفتگو کی۔ سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے اور اردو ہی میں جواب دیتے تھے۔ بعض بعض لفظوں کے مکرر سمجھانے کی اور زیادہ تر آسان طور پر بیان کرنے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کچھ شبہ نہیں کہ تمام ہندوستان میں اردو زبان اسی طرح سمجھی اور بولی جاتی ہے جیسے تمام یورپ میں فرنچ، بلکہ اس سے بھی زیادہ مُروّج ہے۔[۹]

واوری ہماری قسمت کہ یہاں کے بازار کے لوگ اور سالی قوم بھی کسی قدر اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کوئی ضروری کام بند نہیں رہ سکتا، سب اردو میں انجام ہو سکتا ہے۔ الحمدللہ کہ عدن تک تو اردو زبان کی شہنشاہی قائم ہے۔[۹]

سمندر سے سکے نکالنے والے غوطہ زن لڑکے

یہ بھی عجیب تماشا ہے، جہاں جہاز عدن میں ٹھہرا اور سالی قوم کے بیسیوں لڑکے سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز کے پاس آپہنچے۔ کالے کالے رنگ اور سرخ بال، بالکل مینڈک کی طرح تیرتے ہیں اور بخشیش مانگتے ہیں۔ جہاں پیسہ، روپیہ، دونی، چونی، اٹھنی، سمندر میں پھینکی اور وہ غوطہ مار کر نکال لائے۔ ہمارے سامنے اکیس لڑکے تھے اور آٹھ بجے صبح سے پانچ بجے شام تک برابر ایک حالت پر تیرتے اور غوطے مارتے اور دونیاں نکالتے رہے۔[۹]

عدن سے سویز

بے حیثیت مصری پائلٹ

سترھویں اپریل ۱۸۶۹ء روز شنبہ کو دوپہر پانچ بجے جہاز نے لنگر اٹھایا اور دخانی کل نے شور مچایا اور جہاز نے سویز کی راہ لی۔ عدن سے ایک مصری پائلٹ، جس کو یہاں کے لوگ "آرکانی" کہتے ہیں، ساتھ ہوا.......... میں نے اس سے سلام علیک کی، بات چیت کی۔ اس نے اپنی قوم کچھ نہیں بتائی۔ کہا کہ میں عامی برِ عرب کا رہنے والا ہوں۔ بالکل ناخواندہ تھا۔ اس کا لہجہ سالی قوم کے لہجے کے بہت قریب تھا اور بے حیثیت اور میلا آدمی تھا۔ کپڑے اچھے نہ تھے مگر انگریزی زبان اور فرنچ زبان اپنا کام چلانے کے لائق جانتا تھا۔[۹]

باب المندب سے گزر

خبر تھی کہ رات کو باب المندب میں سے جہاز گزرے گا۔ چونکہ یہ ایک مشہور خطرے کی جگہ ہے اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کا نہایت شوق تھا۔ جس وقت باب المندب قریب آیا مجھے ایک شخص نے، جس سے میں نے کہہ رکھا تھا، اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں طرف پہاڑ ہیں مگر بہت اونچے نہیں، ان میں سے جہاز جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں میں ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہو گا۔ کچھ بہت تنگ رستہ بھی نہیں ہے شاید پانی کے نیچے دونوں طرف پہاڑ ہوں اور اس سبب سے رستہ جہاز کے چلنے کا تنگ ہو۔ غالباً بادبانی جہاز کو یا انگریزوں کے سوا اور قوموں کے جہاز رانوں کو یہاں اندیشہ ہو گا۔ ہمارے جہاز رانوں کو تو کچھ خیال بھی نہیں ہوا۔ رات کے وقت میں بغیر ذرا سے تردد کے فرفر جہاز کو لئے چلے گئے۔[1]

سمندر میں طغیانی

بائیسویں تاریخ رات کے وقت حامد تو نہیں معلوم کہ جہاز کے کس کونا میں جا کر سو رہا تھا اور میں اور خداداد بیگ اور محمود کمرے میں اپنے اپنے پلنگوں پر اور چھجو پلنگ کے نیچے سوتا تھا اور کمرے کی کھڑکی سمندر کی طرف کی ہوا آنے کو بسبب شدت گرمی کے کھلی ہوئی تھی کہ رات کو دفعتاً تند ہوا چلی اور سمندر میں موجیں اٹھیں اور الا الاکر کے سمندر کا پانی کھڑکی کے اندر اس قدر آ پڑا کہ تمام پلنگ اور بچھونے اور ہم سب اور چھجو شرابور ہو گئے۔ اسی وقت ہم گھبرا کر کمرے میں سے بڑے کمرے میں نکل آئے۔ اس وقت تمام انگریزوں نے بھی اپنے اپنے کمروں کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ ہماری طرف کی لائن میں سب کا یہی حال ہوا۔ سب بڑے کمرے میں نکلے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے کہتا تھا کہ تمہارے کمرے میں بھی پانی آ گیا؟ غرض کہ اسٹورڈ کو اسی وقت پکارا۔ کھڑکی بند کی، بچھونے اٹھائے اور جس طرح ہوا رات کاٹی۔ محمود کو بہتیرا منع کیا پر وہ گیلے بچھونے پر سو رہا۔ صبح کو جب اٹھا تو اس کی بانہہ میں درد تھا، دوسرے دن تک جاتا رہا۔[2]

طبائع مسافران کی ناسازی

جب پانی آیا تو قریب دو ڈھائی گھنٹے کے رات ہو گی۔ کچھ وقت کپڑے اتارنے اور نماز کی تیاری میں گزرا۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی اور دم بدم ہوا تیز ہوتی گئی۔ بالکل سیدھی مخالف ہوا تھی اور نہایت ہی تند تھی اور جہاز اٹھتا تھا اور بیٹھتا تھا۔ اس دن طبیعت نہایت متغیر ہوئی۔ سر کی عجیب کیفیت تھی۔ جی متلاتا تھا اور قے نہیں ہوتی تھی اور ایسی تکلیف وہ مالش تھی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ انگریز جو جہاز میں تھے وہ کہتے تھے کہ ہائیں، ایسے صاف سمندر میں، جو تالاب کی طرح کھڑا

ہے 'تمہارا یہ حال ہے! یہ ہوا اور یہ حرکت' جو اس وقت ہے' کچھ بھی نہیں ہے اور ہم کو تو ذرا بھی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر میں نے دیکھا کہ بعض انگریزوں کو کسی قدر تغیر تھا اور تین چار میموں کو بہت زیادہ تغیر تھا۔ مسز اسمتھ بھی پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اشارہ سے کہا کہ سر پھرتا ہے' طبیعت اچھی نہیں۔ ایک میم صاحبہ کو میں نے دیکھا کہ منہ سے بے اختیار بہت سے کف اور پت ذرا سی ابکائی کے ساتھ نکل پڑے۔ آج تو مرزا خداداد بیگ کا بھی برا حال ہوا اور چھکے چھوٹ گئے اور ہم سب سے زیادہ ان کا پتلا حال تھا' اور حامد آج پھر اپنی اسی پہلی کیفیت کو جا پہنچے۔ (۱)

برانڈی بطورِ دوا پینے سے میرا انکار

بعد اس کے ہوا دھیمی ہونی شروع ہوئی اور جہاز کا ہلنا بھی کم ہوا اور قریب چار بجے کے بہت کم ہو گیا۔ مجھ کو تو بہت تخفیف ہوئی مگر اور سب ہمارے ساتھیوں کا وہی حال رہا۔ ایک میم صاحبہ میرے پاس آئیں اور نہایت مہربانی سے مجھ سے کہا "تم نشے کے لئے شراب مت پیو' بری ہے۔ میں بھی کبھی نہیں چھوتی مگر دوا کے لئے ایک قطرہ بھر برانڈی پی لو۔ میں اسٹورڈ کو بلا کر منگا دیتی ہوں' فی الفور تکلیف جاتی رہے گی۔" میں نے ان کی مہربانی کا بہت سا شکریہ کیا اور کہا کہ نہیں' میں نہیں پی سکتا۔ (۲)

جہازوں کی آپس کی بات چیت

ہم کو بمبئی سے عدن پہنچنے تک کئی ایک بغلے اور بادبانی جہاز اور اسٹیمر بمبئی کو جاتے ہوئے ملے مگر ایک ایک میل دو دو میل کے فاصلے پر تھے۔ صرف دو بادبانی جہاز' جن کا ذکر آگے آتا ہے' بہت قریب ہمارے جہاز کے ملے تھے۔ جب کوئی جہاز دن کو دکھلائی دیتا ہے تو فی الفور پھریرا نشان کا بلند کیا جاتا ہے اور چونکہ ہر ایک قوم کے جہازوں کے پھریرے علیحدہ علیحدہ رنگ کے ہیں اس لئے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا جہاز ہے۔ رات کے وقت ایک دخانی جہاز ملا' کپتان نے فی الفور دو مہتابیاں' جن میں ایک قسم کی آتش بازی تھی' منگائیں۔ غالباً میری یاد اور میرا خیال صحیح ہے کہ اول مہتابی میں سرخی مائل روشنی نکلی۔ تھوڑی دیر بعد چھچھوندر کی طرح اس میں سے کچھ چھوٹا اور پٹاخے کی آواز ہوئی' اور پھر سفید رنگ کی مہتابی چھوٹی' اس کے بعد دوسری مہتابی کو جلایا تو اس میں نیلے رنگ کی مہتابی چند منٹ تک چھوٹتی رہی۔ واقع میں یہ بات نہایت عجیب اور دلکش ہے کہ ایک جہاز دوسرے جہاز سے باوجود میلوں کے فاصلے کے بات چیت کرتا ہے۔ یورپ کے جہاز رانوں نے چار رنگ' نیلا' سفید' زرد اور سرخ' اختیار کئے ہیں اور پھریرے بنائے ہیں۔

باب المندب سے گزر

خبر تھی کہ رات کو باب المندب میں سے جہاز گزرے گا۔ چونکہ یہ ایک مشہور خطرے کی جگہ ہے اس لئے مجھے اس کے دیکھنے کا نہایت شوق تھا۔ جس وقت باب المندب قریب آیا مجھے ایک شخص نے، جس سے میں نے کہہ رکھا تھا، اٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ دونوں طرف پہاڑ ہیں مگر بہت اونچے نہیں، ان میں سے جہاز جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں میں ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہو گا۔ کچھ بہت تنگ رستہ بھی نہیں ہے شاید پانی کے نیچے دونوں طرف پہاڑ ہوں اور اس سبب سے رستہ جہاز کے چلنے کا تنگ ہو۔ غالباً بادبانی جہاز کو یا انگریزوں کے سوا اور قوموں کے جہاز رانوں کو یہاں اندیشہ ہو گا۔ ہمارے جہاز رانوں کو تو کچھ خیال بھی نہیں ہوا۔ رات کے وقت میں بغیر ذرا سے تردد کے فر فر جہاز کو لئے چلے گئے۔[1]

سمندر میں طغیانی

بائیسویں تاریخ رات کے وقت حامد تو نہیں معلوم کہ جہاز کے کس کونا میں جا کر سو رہا تھا اور میں اور خداداد بیگ اور محمود کمرے میں اپنے اپنے پلنگوں پر اور چھجو پلنگ کے نیچے سوتا تھا اور کمرے کی کھڑکی سمندر کی طرف کی ہوا آنے کو بسبب شدت گرمی کے کھلی ہوئی تھی کہ رات کو دفعتاً تند ہوا چلی اور سمندر میں موجیں اٹھیں اور الا الا کر کے سمندر کا پانی کھڑکی کے اندر اس قدر آ پڑا کہ تمام پلنگ اور بچھونے اور ہم سب اور چھجو شرابور ہو گئے۔ اسی وقت ہم گھبرا کر کمرے میں سے بڑے کمرے میں نکل آئے۔ اس وقت تمام انگریزوں نے بھی اپنے اپنے کمروں کی کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ ہماری طرف کی لائن میں سب کا یہی حال ہوا۔ سب بڑے کمرے میں نکلے ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے کہتا تھا کہ تمہارے کمرے میں بھی پانی آ گیا؟ غرض کہ اسٹورڈ کو اسی وقت پکارا۔ کھڑکی بند کی، بچھونے اٹھائے اور جس طرح ہو رات کاٹی۔ محمود کو بہتیرا منع کیا پر وہ گیلے بچھونے پر سو رہا۔ صبح کو جب اٹھا تو اس کی بانہہ میں درد تھا، دوسرے دن تک جاتا رہا۔[2]

طبائع مسافران کی ناسازی

جب پانی آیا تو قریب دو ڈھائی گھنٹے کے رات ہو گی۔ کچھ وقت کپڑے اتارنے اور نماز کی تیاری میں گزرا۔ میں نے صبح کی نماز پڑھی اور دم بدم ہوا تیز ہوتی گئی۔ بالکل سیدھی مخالف ہوا تھی اور نہایت ہی تند تھی اور جہاز اٹھتا تھا اور بیٹھتا تھا۔ اس دن طبیعت نہایت متغیر ہوئی۔ سر کی عجیب کیفیت تھی۔ جی متلاتا تھا اور قے نہیں ہوتی تھی اور ایسی تکلیف دہ مالش تھی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ انگریز جو جہاز میں تھے وہ کہتے تھے کہ ہائیں، ایسے صاف سمندر میں، جو تالاب کی طرح کھڑا

ہے 'تمہارا یہ حال ہے! یہ ہوا اور یہ حرکت 'جو اس وقت ہے' کچھ بھی نہیں ہے اور ہم کو تو ذرا بھی نہیں معلوم ہوتی۔ مگر میں نے دیکھا کہ بعض انگریزوں کو کسی قدر تغیر تھا اور تین چار میموں کو بہت زیادہ تغیر تھا۔ مسز اسمتھ بھی پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اشارہ سے کہا کہ سر پھرتا ہے 'طبیعت اچھی نہیں۔ ایک میم صاحبہ کو میں نے دیکھا کہ منہ سے بے اختیار بہت سے کف اور بہت ذرا سی ابکائی کے ساتھ نکل پڑے۔ آج تو مرزا خداداد بیگ کا بھی برا حال ہوا اور چھکے چھوٹ گئے اور ہم سب سے زیادہ ان کا پتلا حال تھا' اور حامد آج پھر اپنی اسی پہلی کیفیت کو جا پہنچے۔ ⑪

برانڈی بطورِ دوا پینے سے میرا انکار

بعد اس کے ہوا دھیمی ہونی شروع ہوئی اور جہاز کا ہلنا بھی کم ہوا اور قریب چار بجے کے بہت کم ہو گیا۔ مجھ کو تو بہت تخفیف ہوئی مگر اور سب ہمارے ساتھیوں کا وہی حال رہا۔ ایک میم صاحبہ میرے پاس آئیں اور نہایت مہربانی سے مجھ سے کہا "تم نشے کے لئے شراب مت پیو' بری ہے۔ میں بھی کبھی نہیں چھوتی مگر دوا کے لئے ایک قطرہ بھر برانڈی پی لو۔ میں اسٹورڈ کو بلا کر منگا دیتی ہوں' فی الفور تکلیف جاتی رہے گی۔" میں نے ان کی مہربانی کا بہت سا شکریہ کیا اور کہا کہ نہیں' میں نہیں پی سکتا۔ ⑫

جہازوں کی آپس کی بات چیت

ہم کو بمبئی سے عدن پہنچنے تک کئی ایک بگلے اور بادبانی جہاز اور اسٹیمر بمبئی کو جاتے ہوئے ملے مگر ایک ایک میل دو دو میل کے فاصلے پر تھے۔ صرف دو بادبانی جہاز 'جن کا ذکر آگے آتا ہے' بہت قریب ہمارے جہاز کے ملے تھے۔ جب کوئی جہاز دن کو دکھلائی دیتا ہے تو فی الفور پھریرا نشان کا بلند کیا جاتا ہے اور چونکہ ہر ایک قوم کے جہازوں کے پھریرے علیحدہ علیحدہ رنگ کے ہیں اس لئے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کا جہاز ہے۔ رات کے وقت ایک دخانی جہاز ملا' کپتان نے فی الفور دو مہتابیاں 'جن میں ایک قسم کی آتش بازی تھی' منگائیں۔ غالباً میری یاد اور میرا خیال صحیح ہے کہ اول مہتابی میں سرخی مائل روشنی نکلی۔ تھوڑی دیر بعد چھچھوندر کی طرح اس میں سے کچھ چھوٹا اور پٹاخے کی آواز ہوئی' اور پھر سفید رنگ کی مہتابی چھوٹی' اس کے بعد دوسری مہتابی کو جلایا تو اس میں نیلے رنگ کی مہتابی چند منٹ تک چھوٹتی رہی۔ واقع میں یہ بات نہایت عجیب اور دلکش ہے کہ ایک جہاز دوسرے جہاز سے باوجود میلوں کے فاصلے کے بات چیت کرتا ہے۔ یورپ کے جہازرانوں نے چار رنگ' نیلا' سفید' زرد اور سرخ' اختیار کئے ہیں اور پھریرے بنائے ہیں۔

بعضے نرے سفید 'بعضے نرے سرخ 'بعضے نرے زرد 'بعضے نرے نیلے 'اور پھر ان رنگوں کو ترکیب دی ہے۔ بعضوں میں دو رنگ ہیں 'بعضوں میں تین اور بعضوں میں چار اور پھر ان کی شکلوں میں بھی اختلاف کیا ہے۔ بعضوں میں چار رنگ کے چار مربعے لگے ہیں ' بعضوں میں چار معین شکل کے ٹکڑے ' بعضوں میں مستطیل 'بعضوں میں بیچ میں دائرہ۔ ان پھریروں کو مختلف ترتیب سے لٹکانے سے عبارت بن جاتی ہے۔ دوسرا جہاز والا دوربین سے دیکھ کر عبارت سمجھ لیتا ہے اور اس کا جواب اسی طرح دے دیتا ہے۔ بارھویں اپریل کو ہمیں دو جہاز بادبانی ملے 'شاید کوئلہ اور کچھ مال تجارت کا لئے جاتے تھے 'انگریزی جہاز تھے۔ ان سے ایک جہاز والے نے پھریرے لٹکائے۔ ہمارے جہاز کے کپتان نے دیکھا اور سوال سمجھ لیا اور فلاں فلاں نمبر کے پھریرے لٹکانے کا حکم دیا۔ وہ لٹکائے گئے اور اس کو جواب مل گیا۔ بعد اس کے میں نے دریافت کیا کہ کیا جواب سوال ہوئے تھے تو معلوم ہوا کہ بادبانی جہاز نے پوچھا تھا کہ جہاں ہم ہیں اس کا عرض بلد اور طول بلد کیا ہے؟ ہمارے جہاز نے جواب دیا کہ عرض بلد ہے سترہ درجے بیس دقیقے اور طول بلد ہے پینسٹھ درجے پانچ دقیقے۔ سبحانہٗ وتعالیٰ شانہٗ۔①

ہم کو گنگا اسٹیمر ملا جو ہم سے تین دن پہلے بمبئی سے روانہ ہوا تھا۔ پہلے دونوں جہازوں میں جھنڈی سے صاحب سلامت ہوئی 'پھر آپس میں بات چیت ہونی شروع ہوئی۔ پہلی دفعہ جو جہازوں میں بات چیت ہوئی تھی تو مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ چند باتیں جو خاص متعلق جہاز ہوں گی 'ان ہی کے اشارات معین ہوں گے مگر معلوم ہوا کہ نہیں 'ان چند کپڑوں کے ٹکڑوں کے وسیلے سے تمام دنیا کی باتیں کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ان دونوں جہازوں میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی ' خیر و عافیت کی علامت دکھانے کے بعد گنگا اسٹیمر نے کہا کہ رسی ڈال کر مجھے بھی کھینچے لئے چلو۔ ہمارے جہاز نے کہا کہ پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اسی طرح چند اور باتیں ہنسی ہنسی کی آپس میں ہوئیں۔②

شہر سویز کی سیر

نہر سویز کی کھدائی دیکھنے کا ارادہ

۲۳ اپریل ۱۸۶۹ء بروز جمعہ کو ہم سب مع الخیر سات بجے صبح کے سویز میں پہنچے۔ جہاز نے لنگر کیا اور ہم سب جہاز پر سے اتر پڑے۔ بڑودہ جہاز کو ڈنڈوت کر کے رخصت کیا اور سویز ہوٹل میں جا کر ٹھہرے ...... وہاں شہر کی سیر کرنے اور سویز کی نہر دیکھنے جانے کو سواری کے لئے بہت سے گدھے زین کسے ہوئے موجود تھے۔ بہت سے انگریزوں نے سویز کی نہر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ مقام جہاں دیکھنے جاتے تھے 'وہاں سے پانچ میل تھا۔ ہم نے بھی وہاں جانے کا ارادہ کیا مگر جب

لوگوں سے دریافت کیاتو معلوم ہوا کہ جس مقام کولوگ دیکھنے جاتے ہیں وہاں بجز اس کے کہ زمین کھودی جارہی ہے' اور کچھ نہیں ہے۔ تب ہمارا ارادہ سست ہو گیا۔ ہمارے شفیق دوست میجر ڈاڈ صاحب نے اور ان کے چند دوستوں نے مل کر گاڑی تین گھوڑوں کی کہیں سے منگائی اور چند انگریز اور دو میمیں اس پر سوار ہو کر گئیں۔ ہم نے بھی چاہا کہ اگر سہل طور پر گاڑی مل جائے تو ہم بھی جائیں مگر ہم کو نہیں ملی۔ بہت سے انگریز ان ہی گدھوں پر سوار ہو کر گئے اور میں نے دیکھا کہ ایک میم نے بھی ایک گدھا کرایہ کیا اور اس پر نہایت چالاکی اور خوبی سے سوار ہو کر روانہ ہوئی۔[1]

"انگریز اور گدھے"

جس وقت کوئی انگریز گدھا کرایہ کرنا چاہتا تھا اس وقت عجیب سیر ہوتی تھی۔ گدھے والوں نے جہاں دیکھا کہ گدھا کرائے کو چاہتے ہیں اور دس دس بارہ بارہ آدمی اپنے گدھے لے کر دوڑے اور ہر شخص ایک کے گدھے کو دھکا دے کر ہٹاتا ہے' اپنا سامنے کرتا ہے اور چلاتا ہے کہ "ڈنکی سر' ڈنکی سر" یعنی "صاحب گدھا' صاحب گدھا" ، اور کبھی یہ کہہ کر چلاتے تھے "ویری گڈ ڈنکی سر' ویری گڈ ڈنکی سر" یعنی "صاحب بہت اچھا گدھا" ، اور اس قدر غل ہوتی تھی اور اتنے گدھوں میں آدمی کو گھیر لیتے تھے کہ لینے والا گھبرا جاتا تھا۔ جب تک وہ کسی نہ کسی گدھے پر سوار نہ ہولے اس وقت تک وہ اسی آفت میں پڑا رہتا تھا۔[2]

سیر و تفریح اور خرید و فروخت

تھوڑی دیر تک ہم نے سمندر کے کنارے کی اور ہوٹل کی سیر کی اور پھر شہر کی سیر کو گئے۔ ایک بہت چھوٹا تنگ بازار دیکھا۔ ہر قسم کے لوگ مصری اور ترکی اور جرمنی اور یونانی دکان دار وہاں تھے اور بہت سے آدمی عربی بولتے تھے............ ہم نے بازار کے لوگوں سے' جو عربی بولتے تھے' دیر تک باتیں کیں۔ حامد محمود و مرزا خداداد بیگ نے سرخ ترکی ٹوپیاں اور چاقو خریدے۔ بازار سے عربی روٹی خریدی جو در حقیقت نہایت عمدہ اور بہت ہی مزیدار تھی۔ وہاں سے ہم ریل کے اسٹیشن کو دیکھنے گئے۔ وہاں ایک ترکی افسر کو دیکھا جس کے لباس میں اور انگریزوں کے لباس میں بجز سرخ ٹوپی کے اور کچھ فرق نہ تھا' الا ایک تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ان سے سلام علیک کی۔ انہوں نے جواب دیا مگر میری طرف کچھ زیادہ ملتفت نہیں ہوئے۔ وہاں سے پھرتے وقت بازار میں ایک بزرگ عمامہ باندھے کھڑے تھے' میں نے ان سے سلام علیک کی' مصافحہ کیا' عربی زبان میں بات چیت شروع کی۔[1]

اسکندریہ بذریعہ ریل

سویز سے روانگی

عربی زبان میں مصری ریل کی سڑک کو "سکۃ الحدید" اور "وابور البر" کہتے ہیں اور لفظ ثانی کو لفظ اول سے زیادہ ترفصیح جانتے ہیں اور فصیح گفتگو میں یہی نام لیتے ہیں۔ غرض کہ ۲۳ر اپریل ۱۸۶۹ء روز جمعہ کو قریب شام کے ہم سویز سے "وابور البر" پر سوار ہوئے اور اسکندریہ کو چلے۔ ہم نے سنا تھا کہ اس راستے میں بجز ریگستان اور جنگل کے اور کچھ نہیں ہے' پانی بھی راستے میں نہیں ملے گا اور اسی لئے ہم نے تین صراحیاں پانی کی بھری ہوئی خرید کر ریل میں رکھ لی تھیں۔①

ایک عمدہ ہوٹل کی کیفیت

رات کو ہم سب ریل میں سو رہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ رات کو کیا کیا گزرا............ کچھ دن چڑھے ہم ایک اسٹیشن پر اترے جو رود نیل کے قریب ہے۔ وہاں ایک عمدہ ہوٹل بنا ہوا ہے۔ وہاں کافی یعنی قہوہ پیا' نان پاؤ اور مکھن کھایا۔ اس ہوٹل کے طریق میں اور انگریزی ہوٹل کے طریق میں کچھ فرق نہ تھا' الا کھانا کھلانے اور قہوہ پلانے والے بالکل انگریزوں کے سے کپڑے' لال ٹوپی پہنے ہوئے ترک تھے۔ میز کرسی لگی ہوئی تھی' کانٹا چھری دھرے ہوئے تھے اور بلا تمیز انگریز و مسلمان کے سب ملے ہوئے تھے۔ قہوہ جو ترکوں نے بنا کر پلایا جس میں نہایت عمدہ گائے کا دودھ پڑا ہوا تھا' ایسا خوش ذائقہ اور مزے دار تھا کہ میں نے تمام عمر' نہ گھر میں اور نہ کسی ہوٹل میں' ویسا مزے کا پیا تھا۔②

دریائے نیل کی زیارت

اس ہوٹل میں کھا پی کر ریل پر سوار ہوئے۔ تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ دریائے نیل کی زیارت ہوئی۔ اس پر آہنی پل بندھا ہوا تھا۔ ریل اس پر سے گزری۔ اگرچہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پل نہایت مستحکم طور پر بنا ہوا ہے' الا کچھ خوبصورت نہ تھا بلکہ کہنا چاہئے کہ نہایت بدصورت تھا۔ ہمارے ملک کے آہنی پل دیکھنے میں بھی نہایت خوبصورت ہیں۔③

اسکندریہ میں آمد

تھوڑی دور اور چلے تو دمنہور کا اسٹیشن ملا۔ اس سے اگلا اسٹیشن اسکندریہ کا تھا چنانچہ اسکندریہ میں جا پہنچے۔ ہمارے لئے جہاز تیار تھا اس لئے ہم کو شہر کے اسٹیشن پر نہیں اتارا بلکہ جہازوں کے لنگر خانہ تک لئے چلے گئے اور بندر کے اسٹیشن پر اتارا۔ ہم اترتے ہی سیدھے جہاز پر

چلے گئے اور "پونا" نامی جہاز کے کمرے میں 'جو ہمارے لئے موجود تھا' جا بیٹھے۔[1]

وہاں اپنا کمرہ مرتب پایا اور سب اسباب سجا ہوا ملا۔ ہم نہیں جانتے کہ وہاں تک کون اسباب لے گیا۔[2]

.... افسوس ہے کہ ہم کو اسکندریہ دیکھنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملی۔ کوئی چیز اسکندریہ کی ہم نے نہیں دیکھی بجز سمندر کے اور اس کے کنارے کے مکانات کے یعنی جو جہاز میں سے دکھائی دیتے تھے۔[3]

مارسیلز کے لئے بحری سفر

لائق مصری پائلٹ سے میل جول

ہمارا "پونا" جہاز ۲۴ اپریل ۱۸۶۹ء روز شنبہ کو قریب دوپہر کے اسکندریہ سے مارسیلز کو روانہ ہوا اور میڈیٹرینین سی یعنی بحرِ روم کو ہم نے طے کرنا شروع کیا............ جب ہم اسکندریہ سے روانہ ہوئے تو الحاج احمد بکری 'اسکندریہ کا رہنے والا پائلٹ یعنی آر کاٹی' ہمارے ساتھ ہوا.......... مجھ سے اس کی بہت ملاقات ہو گئی۔ جب فرصت ہوتی آپس میں ایک جگہ بیٹھ کر عربی میں کچھ کچھ باتیں کرتے۔ ملک مصر اور دارالحکومت قاہرہ اور شہر اسکندریہ کی بہت تعریف کرتا تھا۔ جب سے اس نے یہ جانا کہ میں بنی ہاشم سادات رضوی سے ہوں میری نہایت خاطر اور تعظیم کرنے لگا۔ اردو کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا۔ جغرافیہ سے بالکل ناواقف تھا' یہاں تک کہ شہر دلی کو بھی نہیں جانتا تھا اور شاید کبھی اُس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ پوچھنے لگا کہ ہندوستان 'جس پر انگریزی عمل داری ہے' کتنا بڑا ملک ہے اور اَور کسی کی بھی عمل داری ہے یا نہیں؟ میں نے سب حال وسعت و آبادی ملک ہندو حکومت انگریزی کا اس سے بیان کیا۔[4]

جہاز میں نئے اور پرانے رفقاءِ سفر

ہمارے ساتھ کے اکثر مسافر ساؤتھمپٹن کی راہ کو گئے اور بعضے ٹریسٹ کی راہ کو' اس لئے چند قدیم مسافر ہمارے ساتھ ہوئے اور کچھ نئے مسافر آن ملے۔ چنانچہ اس جہاز میں سو مسافر جمع ہو گئے اور نئے آدمیوں کے ملنے اور دیکھنے سے اور پرانے رفیقوں کے جدا ہونے سے ایک اَور ہی کیفیت معلوم ہوئی' مگر ہمارے شفقت فرما میجر ڈاڈ صاحب اور میجر بگٹن اور مس کارپینٹر اور صاف طینت ذات میجر فریزر اسی جہاز میں رہے۔[5]

میجر ڈاؤ کے طرز کلام پر رنج

جس دن "پونا" نامی دخانی جہاز روانہ ہوا اسی دن کھانے کے بعد میجر ڈاؤ صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب یورپ میں آ پہنچے۔ میں نے ادب آمیز اخلاق سے اس کو تسلیم کیا اور بشاشت کے ساتھ یہ بات کہی کہ ہاں، آج ہماری پہلی منزل یورپ کے ملک میں ہے۔ ڈاؤ صاحب نے کہا کہ ہاں اب حقیر کالے مجھو جاہد کافروں کا ملک آیا۔ اگرچہ اس میں انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے ہم مجبور اً مانتے اور جو سخت یا نامناسب لفظ انہوں نے کہا وہ اپنی یا اپنی قوم کی نسبت کہا مگر ان کا یہ طرز کلام مجھ کو نہایت ناپسند آیا اور طبیعت کو بہت ناگوار گزرا اور میں نے خیال کیا کہ ایسی لے میں گفتگو کرنا کیسا اخلاق اور تہذیب کے برخلاف ہے اور ایسے عمدہ اور متین اور حلیم ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی زبان سے اس طرز پر کیوں گفتگو ہوئی؟ خیر، میں نے چند دم توقف کر کے کہا کہ یوں نہ کہئے بلکہ یوں کہئے کہ اہل کتاب کا ملک آیا ـــــــ ـــــــ مگر کئی گھنٹے تک مجھ کو بڑا خیال رہا اور میں سوچتا رہا کہ ان کی طینت اور طبیعت کس قسم کی ہے۔ مگر آخر کو میں نے خیال کیا کہ غالباً ان کی یہ گفتگو کسی قسم کے تعصب کی راہ سے نہ تھی، اتفاقیہ سہل طور پر ان کی زبان سے نکل گیا اور جو کبیدگی میرے دل میں آئی تھی اس کو میں نے نکال دیا۔[11]

سابق ڈپٹی کمشنر دہلی سے انتظام پنجاب پر گفتگو

اس جہاز میں بھی کئی نئے صاحبوں سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے ڈی فٹز پیٹرک صاحب سابق ڈپٹی کمشنر دہلی بھی اسی جہاز میں تھے۔ اگرچہ مجھ سے اور ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر نہایت مہربانی سے ملے۔ ایک دن پنجابی انتظام کی بھلائی برائی کا ذکر آیا میں نے کہا کہ ہاں، ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزاروں درجے بہتر ہے۔ شاید پنجاب کے لوگ خوش ہوں اور پسند کرتے ہوں کیونکہ ان کو آگ میں سے نکال کر دھوپ میں بٹھایا ہے مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔[12]

نہر سویز بنانے والے عظیم انجینئر سے ملاقات پر فخر

نہایت خوشی اور بہت ہی مبارکی جو اس جہاز میں ہوئی، وہ مسٹر ڈیلیپس صاحب بہادر کی ملاقات ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ یہ صاحب وہ فرانسیسی انجینئر ہیں جنہوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز کی اور باوجودیکہ تمام یورپ کے بڑے بڑے انجینئر کہتے تھے کہ اس نہر کا بننا غیر ممکن ہے مگر صرف

اس عالم اور دانا اور دلاور انجینئر کی تجویز تھی کہ بے شک بنے گی اور میں بناؤں گا۔ چنانچہ جیسا اس نے کہا تھا ویسا کر دکھایا۔ دو سمندروں کو ملایا اور سویز کی نہر کو بنایا۔ یہ جناب پرنس آف ویلز کے ساتھ تھے جبکہ جناب ممدوح نہر سویز کے ملاحظے کو تشریف لائے تھے اور سویز سے اس جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ ایک دن کے بعد مجھے ان کا حال معلوم ہوا وہ انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔ ہمارے جہاز کے کپتان صاحب نے، جو فرانسیسی جانتے تھے، میری ملاقات کرائی۔ نہایت اخلاق اور تواضع سے ملے اور نہایت خوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ کسی قدر عربی بولتے ہیں۔ میں نہایت خوش ہوا اور چند باتیں عربی میں کیں.......... اس دن سے برابر نہایت مہربانی سے ملتے رہے اور ہر روز گھنٹوں تک میں اور وہ ایک میز پر بیٹھے لکھا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے سب لوگوں کے سامنے نہر سویز کا حال بیان کیا اور بعض پرانی نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت کی، جو اس کے قرب و جوار میں ہیں، بیان کیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ جب تم ولایت سے پھرو گے تو امید ہے کہ نہر کے رستے تمہارا جہاز جائے گا.......... چھ مہینے بعد نہر بالکل جاری ہو جائے گی اور بڑے بڑے جہاز و اسٹیمر اس میں آمد و رفت کریں گے۔ غرضیکہ ایسے شخص کی ملاقات سے، جو دلیری اور جرأت میں بھی ایسا ہی کامل ہے جیسا کہ اپنے فن میں اور حقیقت میں یکتائے دہر و بے مثل و نظیر ہے، مجھے نہایت خوشی ہوئی بلکہ میں نے اپنا فخر سمجھا۔[1]

اٹلی اور سسلی کا نظارہ

اس سفر میں، جو اسکندریہ سے مارسیلز تک ہوا، نہایت دلچسپ چیزیں، دیکھنے میں آئیں۔ تین دن تک تو ہم نے بجز پانی پانی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ ستائیسویں تاریخ کو چار بجے کے بعد ہم کو سرزمین اٹلی اور سسلی، جن کو عربی میں اطالیہ اور صقالیہ کہتے ہیں، دکھائی دی۔ پھر جوں جوں آگے بڑھتے گئے نئے نئے اور عجیب عجیب شہر ہم نے دیکھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ کو اٹلی کا کنارہ تھا تو بائیں ہاتھ کو سسلی کا.......... ان شہروں کی خوبی اور خوبصورتی جو ہم کو اٹلی کے کنارے پر ملے، بیان نہیں ہو سکتی.......... ایک زمانہ تھا کہ سسلی میں مدت تک مسلمانوں کی عمل داری رہی تھی مگر اس وقت کنارے پر سے ہم کو کوئی مکان مسلمانوں کی عمل داری کا دکھائی نہیں دیا مگر کوئی نہ کوئی نشان ضرور وہاں ہو گا۔[2]

سمندر کی تعجب خیز خاموشی

لوگوں نے ہم سے بیان کیا تھا کہ میڈیٹرینین یعنی بحر روم میں تموج بہت زیادہ ہے اور جہاز کو حرکت بہت ہوتی ہے اور اکثر طوفان بھی ملتا ہے۔ چونکہ ہم ابھی جہاز کے ہلنے سے تکلیف اٹھا چکے

تھے اور صفرا کی حرکت اور جی متلاتا اور قے یا ابکائی کی تکلیف بہت ہی ناگوار معلوم ہوتی تھی اس لئے ہم کو تردد تھا کہ دیکھئے کیسی تکلیف ہوگی۔ مگر تعجب ہے کہ سمندر ایسا سید ھا چپ چاپ تھا کہ ذرا بھی اس میں تموج نہ تھا۔ بالکل سمندر کی ایسی مثال تھی کہ گویا پیالہ میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اکثر مسافر، جو جہاز میں تھے، کہتے تھے کہ ایسا چپ چاپ سمندر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ①

وہیل مچھلیوں کی کھیل کود

اس سمندر میں ہم نے وہیل مچھلیاں متعدد دفعہ دیکھیں۔ وہ نہایت خوشی سے پانی کے اوپر نکلتی تھیں اور پھر غوطہ مار جاتی تھیں۔ بعض دفعہ دو دو تین تین ایک ہی جگہ آپس میں کھیلتی ہوئی نکلتیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بلی کے بچے آپس میں اچھلتے اور کھیلتے ہیں۔ جو مچھلیاں ہم نے دیکھیں وہ بلاشبہ گنگا کی کشتیوں کے عرض کے برابر موٹی اور اس کے طول کے برابر لمبی ہوں گی۔ اس سمندر میں ہم کو بڑی کیفیت آئی اور اگر سمندر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو تو شہر کے مکانوں اور باغوں سے بہت زیادہ فرحت بخش ہے۔ ②

جہازوں کے کھانے کے متعلق بے جواز شکایت

جہازوں پر کھانا نہایت عمدہ اور متعدد اقسام کا بافراط تھا اور تر و خشک میوہ، جس قدر کھاسکو، میز پر موجود تھا۔ شراب اس قدر افراط سے پینے والوں کو پینے کو ملتی تھی کہ میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بعض انگریز شکایت کرتے تھے کہ بمبئی سے سویز تک کھانا اچھا نہیں ملتا مگر یہ شکایت میری دانست میں صحیح نہ تھی کیونکہ گرم ملک میں گوشت نہایت اچھا نہیں ہوتا۔ بلاشبہ الیگزنڈریہ سے مارسیلز تک جیسا عمدہ گوشت تھا ہم نے تو آج تک ویسا عمدہ گوشت نہیں دیکھا تھا۔ ③

مارسیلز کے کسٹم ہاؤس میں تلاشی کا مرحلہ

۲۹ اپریل روز پنجشنبہ کو رات کے وقت قریب سات آٹھ بجے کے بخیر و عافیت تمام مارسیلز میں داخل ہوئے۔ ④

.... تھوڑی دیر پہلے جہاز کے پہنچنے سے تمام صندوق اور بکس جس قدر تھے وہ جہاز کے تہ خانوں میں سے نکال کر جہاز کی چھت پر رکھ دیئے تھے اور ہر ایک کے نام کا یا کسی حرف کا ٹکٹ ہر ایک شخص کے صندوقوں پر لگا دیا تھا۔ جب جہاز کنارے پہنچا اسی وقت فرانسیسی افسر جو کسٹم ہاؤس کے محصول لینے والے آئے اور سب صندوق ان کے سپرد ہو گئے۔ انہوں نے نہایت بڑے کمروں میں میزوں پر ہر ایک کے نام یا ہر ایک حرف کے صندوق چن کر علیحدہ علیحدہ لگائے اور تمام مسافر ایک نہایت اچھے کمرے میں، جو اس کے پاس تھا اور جس میں کرسیاں اور

کوچیں نہایت عمدہ لگی ہوئی تھیں، جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پتلا سا دروازہ کھلا جو اس بڑے کمرے یعنی کسٹم ہاؤس میں جانے کی راہ تھی، مسافر ہجوم کر کے جلدی سے اندر جانا چاہتے تھے مگر محافظ دروازہ تعداد مناسب سے زیادہ کو اندر جانے نہیں دیتا تھا۔ وہاں ان صندوقوں کو کھول کر تلاشی لیتے تھے کہ کوئی محصولی مال تو نہیں ہے۔ مگر تلاشی نہایت نرمی اور آسانی سے لیتے تھے۔ بعض دفعہ اشراف صورت کی بات پر کہ کوئی محصولی مال نہیں ہے، اکتفا کرتے تھے۔ اور اگر کوئی اشراف صورت کہتا تھا کہ اس قدر فلاں مال محصولی ہے تو بلاتکرار اسی قدر کا محصول لے لیتے تھے۔[1]

ہمارے پاس دس صندوق تھے اور ان صندوقوں میں ایک جوڑہ شال کا نیا علیحدہ پلندے میں بندھا ہوا تھا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ اگرچہ یہ مال محصول کا نہیں ہے کیونکہ استعمال کے لئے ہے، پھر علیحدہ پلندہ بنانا کچھ ضرور نہیں۔ چنانچہ ہم نے پلندہ کھول کر شال کو اپنے کپڑوں کے ساتھ رکھ دیا۔ جب ہمارے صندوقوں کی نوبت آئی تو مرزا خداداد بیگ اور محمد حامد مع چھجو کے اس کمرے میں گئے، وہاں کے افسر نے پوچھا کہ پہننے کے کپڑے میں کوئی محصولی چیز تو نہیں؟ مرزا صاحب نے کہا کہ کوئی محصولی چیز نہیں ۔ اس نے پوچھا کہ تمباکو تو نہیں؟ انہوں نے کہا "نہیں"۔ اس افسر نے کہا کہ اچھا لے جاؤ۔ اسی وقت قلیوں نے جو وہاں موجود تھے، ہاتھوں ہاتھ اسباب اٹھا کر باہر رکھ دیا اور مہر تلاشی ہو جانے کی کر دی۔ واضح ہو کہ یہ طریقہ اسی اسباب کی تلاشی کا تھا جو مسافروں کے ساتھ تھا۔ غالباً کل مسافروں کی تلاشی میں دو ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہ لگا ہوگا۔[2]

خوبصورت مارسیلز کی سیر

لنگر گاہ سے ہوٹل تک

جب ہم لنگر گاہ مارسیلز میں جہاز سے اترے تو ہم نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیاں اور اومنی بس کھڑی ہوئی ہیں اور وہاں چند اشخاص نہایت معقول اور اشراف صورت کھڑے ہوئے ہیں (یہ لوگ ہوٹلوں کے کمشنر تھے)، انہوں نے پوچھا کہ آپ کس ہوٹل میں تشریف لے جائیں گے؟ ہم نے کہا کہ ہوٹل دلوور میں ہم نے پہلے ٹھہرا لیا تھا کہ اس ہوٹل میں اتریں گے۔ یہ سنتے ہی اس ہوٹل کا کمشنر ہمارے پاس آیا اور اومنی بس، جو اس ہوٹل کا تھا، حاضر کیا اور ہمارے تمام اسباب کی خود سربراہی کر کے سب لدوالیا، ہم کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑا۔ اسی طرح اور مسافروں کو بھی، جو اس ہوٹل میں جانے والے تھے، اس نے لیا اور اومنی بس ہنکوا ہوٹل میں جا اتارا۔[3]

شہر کے آراستہ روشن بازار

راستہ میں ہمارا گزر شہر بیلن میں ہوا۔ رات کا وقت تھا اور یہ پہلا یورپ کا شہر ہے جس کو ہم نے دیکھا۔ جب کہ ہم الومنی بس بازار میں پہنچا ہم دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگے کبھی ایسا آراستہ بازار اور اس قدر روشنی شیشہ آلات میں ہم نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ دیوالی میں جو روشنی ہندوستان میں ہوتی ہے اس کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی............ چونکہ ایسا شہر اور اس قدر آراستہ ہونا ہمارے خیال میں بھی نہ تھا بلکہ ہم نے ہندوستان میں کسی امیر کا دولت خانہ بھی ایسا آراستہ نہیں دیکھا تھا اس واسطے حقیقت میں ہم حیران اور متحیر ہو گئے کہ یہ کیا چیز ہے۔ (۱۱)

عمدہ و خوب صورت شراب خانے

اسی بازار میں دو تین مکان نظر پڑے جو سب سے زیادہ آراستہ تھے............ بہت سے لوگ اس میں بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ کچھ عورتیں بھی دور دور دکھائی دیتی تھیں اور متعدد جھاڑ اور لیمپ اور فرشی جھاڑ گیس کی روشنی سے روشن تھے۔ میں نے ہرگز کوئی مکان ایسی خوبصورتی سے آراستہ ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت مجھ کو یقین ہوا کہ کوئی بڑی شادی ہے اور لوگ جمع ہیں اور مکان آراستہ ہے مگر جب صبح کو دیکھا اور تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ عام لوگوں کے شراب پینے کے لئے شراب خانے ہیں۔ لوگ جمع ہوتے ہیں اور شراب پیتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے شراب خانے ہیں اور ایک ایک سے زیادہ اور عمدہ آراستہ ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے کہ عام لوگوں کو بھی یہاں تک کہ قلی اور مزدوروں کو بھی ایسی آراستگی سے شراب پینی میسر ہے کہ جمشید کو کبھی خیال میں بھی میسر نہ ہوئی ہوگی۔ (۱۲)

ہوٹل میں نوکر کو بلانے کی کل

ہم کو پانچویں درجے میں کمرے ملے تھے کیونکہ اور سب کمرے بھرے ہوئے تھے۔ ایک سو بیس سیڑھیاں چڑھے تب اپنے کمروں میں پہنچے۔ ہر جگہ گیس کی روشنی تھی اور ہر کمرہ نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ ایک نوکر ہوٹل کا ہمارے ساتھ تھا وہ کمروں میں پہنچا کر چلا گیا۔ میرے دل نے اسی وقت پانی پینے کو چاہا۔ میں حیران ہوا کہ نوکر کو کیونکر بلاؤں اور اس قدر نیچے کون جائے۔ اسی فکر میں تھا کہ مجھے خیال آیا کہ ولایت کے بڑے ہوٹلوں میں ایک کل لگی ہے کہ جہاں اس کو ہاتھ لگایا اور برقی قوت سے یا پیسہ کی حرکت سے گھنٹہ بجا اور آدمی آیا۔ اسی خیال میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ یکایک میری نگاہ دیوار پر پڑی۔ وہاں ہاتھی دانت کا نہایت خوبصورت پھول لگا ہوا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ وہی چیز ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور انگوٹھا کا کر ذرا دبایا اور جہاں نوکر بیٹھے رہتے ہیں

وہاں گھنٹہ بجا۔ ایک دومنٹ نہیں گزرنے پائے تھے' نوکر حاضر ہوا۔ اس کو چاء کے لئے کہا۔ اسی وقت بنالایا مگر مجھ کو یہ خلجان رہا کہ اس نے یہ کیونکر جانا کہ فلاں کمرے میں بلایا ہے۔ خیر' رات کو سو رہے۔ صبح اٹھ کر میں اس کمرے میں گیا جہاں خدمت گار ہوٹل کے جمع رہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں ایک گھنٹہ لگ رہا ہے اور گھنٹہ کے نیچے ایک تختہ لگا ہوا ہے اور اس میں بہت سے خانے بنے ہوئے ہیں۔ جس کمرے میں مسافر نے اس پھول کو دبایا اسی وقت وہ گھنٹہ بجا اور فی الفور ایک خانہ میں ایک نمبر دکھائی دیا مثلاً ۴ یا ۶ یا ۹ وغیرہ۔ پس خدمت گار نے جانا کہ فلاں نمبر کے کمرے میں بلایا ہے۔[1]

دن میں شہر کا نظارہ

تیسویں اپریل ۱۸۶۹ء روز جمعہ کو ہم نے وہاں مقام کیا تاکہ ایسا خوبصورت شہر دن میں دیکھا جائے۔ ایک گاڑی دو گھوڑوں کی منگائی اور قریبا تمام شہر میں پھرے۔ ایسی وسیع اور صاف اور خوبصورت اور ایسی ایسی عمدہ آراستہ دکانیں دیکھنے میں آئیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بازاروں میں مٹی یا تنکے یا کوڑے کا نام تک نہ تھا۔ تمام عمارت نہایت صاف اور اجلی' زن و مرد نہایت صاف اور وضع دار ہر طرح کی خوبصورتی میں آراستہ نظر آئے۔[2]

حسین کزینو میں سماعِ سرود و نغمہ

رات کو ہم پھر شہر دیکھنے کو نکلے اور اکثر بازاروں میں وہی کیفیت بلکہ اس سے زیادہ دیکھی۔ ایک مکان بہت بڑا' اور ایسا ہی مکلف جیسے کے شراب خانوں کے مکانات تھے' دکھائی دیا۔ ہوٹل کا کمشنر' جو ہمارے ساتھ تھا' اس نے کہا کہ یہ "کزینو" ہے یعنی ہر روز گانا ہونے کا مکان ہے۔ ہم بھی اس میں گئے۔ دیکھا کہ نہایت آراستہ مکان ہے اور باغ سا لگا ہوا ہے' شیشوں کا اور شیشہ آلات کا کچھ حساب نہیں' سینکڑوں کرسیاں بچھی ہیں اور ہر کرسی کے سامنے چھوٹی سی میز ہے۔ کوئی چائے پیتا ہے' کوئی کافی' کوئی شراب۔ خدمت گار متعین ہیں اور سب چیز حاضر کرتے ہیں اور سامنے نہایت مکلف شہ نشین بنی ہوئی ہے۔ اس میں گانے والے اور گانے والیاں اور باجا بجانے والے ہیں۔ جو شخص چاہے ٹکٹ لے اور اس مکان میں جائے۔ جب تک چاہے گانا بجانا سنے .... ہم تھوڑی دیر وہاں ٹھہرے اور تماشہ دیکھ کر چلے آئے۔ کہانیوں میں بھی ایسی کیفیت نہیں سنی تھی جو آنکھوں نے دیکھی۔[3]

پیرس بذریعہ ریل

مارسیلز سے روانگی

یکم مئی ۱۸۶۹ء روز شنبہ کو ہم مارسیلز سے روانہ ہوئے۔ وہی عمدہ اومنی بس جو ہم کو لنگر گاہ مارسیلز سے ہوٹل میں لایا تھا' حاضر تھا۔ لفرانس ہوٹل نے سب ہمارے بکس اسباب کے لے لئے اور ان پر اپنے دفتر کے ٹکٹ لگوا دیئے اور سب اسباب اومنی بس کی چھت پر رکھ دیا اور ہم سب لوگ اومنی بس میں' جس میں نہایت نفیس دو گھوڑے جتے ہوئے تھے' سوار ہوئے۔ کمشنر ہوٹل ہمارے ساتھ ہوا اور عین وقت پر ریل کے اسٹیشن پر پہنچایا۔ کمشنر ہوٹل نے ریل کے ٹکٹ لا دیئے' اسباب تلوا دیا۔ ریل کی گاڑی میں سوار ہونے کے بعد رخصت ہوا۔ جتنا کہ ہم کو ہندوستان میں ریل کا ٹکٹ لینے اور سوار ہونے میں تردد یا فکر کرنا پڑتا تھا اتنا بھی نہیں ہوا بلکہ کچھ بھی نہیں ہوا۔[1]

قدرت کے حسین مناظر پر انسانی کاریگری

جب ہم مارسیلز سے چلے اور ٹرین نے نہایت نرمی اور سبکی سے قدم اٹھایا اور میدان اور کھیت اور گاؤں ہماری نظر سے گزرے تو ہم کو ایک اور ہی عالم دکھائی دیا۔ مارسیلز میں تو جو کچھ تماشا تھا وہ سب انسان کی کاریگری کا تھا مگر یہاں قدرت کی خوبی اور خوبصورتی اور انسان کی کاریگری اور عقلمندی نے مل کر عجب ہی کیفیت دکھلائی تھی۔ ملک کی خوبی اور سرسبزی و شادابی اور ٹیلے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بلندی اور پستی اور سرو نما اور گھنی دار درختوں کی سرسبزی اور خوبصورتی دل کو لبھائے لیتی تھی۔ اس قدرتی خوبصورتی پر انسان نے یہ کاریگری کی تھی کہ اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ تمام زمین' جہاں تک نگاہ جاتی تھی' نہایت خوبصورت چمن بندی و تختہ بندی سے آراستہ تھی...... غرض کہ اسی طرح کا تماشا اور عجائبات قدرت کو دیکھتے ہوئے لینز اسٹیشن پر پہنچے۔ ہم سب لوگ گاڑی پر سے اترے اور اسٹیشن میں جا کر کچھ کھایا' چاء پی اور کچھ کھانے کی چیزیں اور دو بوتلیں پانی کی اور کچھ میوہ خریدا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ رات ہوئی' اپنی گاڑی میں سوتے' کھاتے اور ہنستے بولتے ساری رات چلا کئے۔[2]

پیرس کے حسین شہر میں

پیرس میں آمد

دوسری مئی ۱۸۶۹ء روز یک شنبہ کو ساڑھے سات بجے صبح کے پیرس میں داخل ہوئے۔ چونکہ ہم نے دو روز تک پیرس میں رہنے کا قصد کیا تھا اس لئے وہاں اترے۔ مارسیلز کی طرح وہاں

بھی ہوٹلوں کے کمشنر موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کس ہوٹل میں جائیں گے؟ ہم نے کہا کہ میورس ہوٹل میں' اس لئے کہ ہم نے تحقیق کر لیا تھا کہ وہاں اکثر انگریز اترتے ہیں اور اس سبب سے وہاں کے اہل کار انگریزی زبان بخوبی جانتے ہیں۔ کمشنر نے ہمارے لئے دو گاڑیاں حاضر کیں اور ہم ریلوے اسٹیشن سے وہاں آئے۔ کوچوان نے کچھ ہم سے فرنچ زبان میں پوچھا۔ ہم کچھ نہیں سمجھے اور نہ وہ کچھ ہماری سمجھا............ ہم نے وہاں کھانا کھایا اور اس خیال سے کہ آج اتوار ہے' کچھ سیر و تماشا کا قصد نہیں کیا۔[1]

وارسیل کی سیر کو روانگی

ہم نے ہوٹل کے کمشنر کو' جو انگریزی جانتا تھا' ساتھ لیا اور پیدل ٹہلنے اور کچھ ادھر اور ادھر پھرنے کا ارادہ کیا............ خوب سیر کی۔ جب سب جگہ دیکھ چکے تب ہماری خوش نصیبی نے زور کیا اور ہم نے کمشنر سے کہا کہ اَور کسی اچھی جگہ لے چلو۔ اس نے کہا وارسیل چلو۔ وہ آج کھلا ہوا ہے اور ہر مہینے پہلے اتوار کو کھلتا ہے۔ نہایت عمدہ جگہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہم پیدل اس کے ساتھ چلے اور چونکہ بہت پھر چکے تھے' میں تھک گیا اور وہ لئے جاتا ہے۔ کبھی دکانات اور مکانات اور بازاروں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور تھکن کا مطلق خیال نہیں رہتا' اور کبھی پھر تھکن کے سبب طبیعت اکتا جاتی ہے اور کمشنر قدم اٹھائے لئے چلا جاتا ہے اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ وارسیل کیا ہے اور کتنی دور ہے۔ غرض کہ خدا خدا کر کے ایک نہایت بڑے مکان کے دروازے میں گھسے۔ وہاں بہت غول آدمیوں کا جمع تھا اور ایک اَور دروازے میں وہ لوگ گھسے چلے جاتے تھے۔ کمشنر نے ہم کو ایک جگہ ٹھہرایا اور کہا کہ میں ٹکٹ لے آؤں اور جھٹ پٹ وہ ٹکٹ لے آیا اور کہا "چلو"۔ ہم نے یقین کیا کہ اب جس دروازے میں گھستے ہیں وہی وارسیل ہے۔ جب اس میں گھسے تو دیکھا کہ نہایت عالی شان ریل کا اسٹیشن ہے اور ٹرین تیار کھڑی ہے۔ اس کو دیکھ کر طبیعت نہایت منغض ہوئی تمام رات ریل کا سفر کئے چلے آتے تھے اور پھر پھرتے پھرتے دق ہو گئے تھے' اب پھر ریل میں بیٹھنا ایسا ناگوار معلوم ہوا اور ایسی طبیعت دق ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کم بخت کمشنر ہماری اجازت کے بغیر دوسرے درجے کا ٹکٹ لے آیا تھا۔ یہاں کی گاڑیاں دوہری ہیں۔ اندر تو فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھتے ہیں اور چھت پر دوسرے درجے کے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چھت پر بیٹھنا پڑے گا تو اَور بھی طبیعت دق ہوئی' اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے تیس میل جانا ہے تب تو ایسا دل ناراض ہوا کہ ٹرین پر سے اترنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی بجائی اور چل دیا اور ہم لاچار' بے بس' نہایت دق و رنجیدہ اس پر چلے جاتے ہیں' جب تھوڑی دور

پیرس بذریعہ ریل

مارسیلز سے روانگی

یکم مئی ۱۸۷۹ء روز شنبہ کو ہم مارسیلز سے روانہ ہوئے۔ وہی عمدہ اومنی بس جو ہم کو لنگر گاہ مارسیلز سے ہوٹل میں لایا تھا' حاضر تھا۔ افسرانِ ہوٹل نے سب ہمارے بکس اسباب کے لے لئے اور ان پر اپنے دفتر کے ٹکٹ لگا دیئے اور سب اسباب اومنی بس کی چھت پر رکھ دیا اور ہم سب لوگ اومنی بس میں' جس میں نہایت نفیس دو گھوڑے جتے ہوئے تھے' سوار ہوئے۔ کمشنر ہوٹل ہمارے ساتھ ہوا اور عین وقت پر ریل کے اسٹیشن پر پہنچایا۔ کمشنر ہوٹل نے ریل کے ٹکٹ لا دیئے' اسباب تلوا دیا۔ ریل کی گاڑی میں سوار ہونے کے بعد رخصت ہوا۔ جتنا کہ ہم کو ہندوستان میں ریل کا ٹکٹ لینے اور سوار ہونے میں تردد یا فکر کرنا پڑتا تھا اتنا بھی نہیں ہوا بلکہ کچھ بھی نہیں ہوا۔[۵]

قدرت کے حسین مناظر پر انسانی کاریگری

جب ہم مارسیلز سے چلے اور ٹرین نے نہایت نرمی اور سبکی سے قدم اٹھایا اور میدان اور کھیت اور گاؤں ہماری نظر سے گزرے تو ہم کو ایک اور ہی عالم دکھائی دیا۔ مارسیلز میں تو جو کچھ تماشا تھا وہ سب انسان کی کاریگری کا تھا مگر یہاں قدرت کی خوبی اور خوبصورتی اور انسان کی کاریگری اور عقل مندی نے مل کر عجب ہی کیفیت دکھلائی تھی۔ ملک کی خوبی اور سرسبزی و شادابی اور ٹیالے چھوٹے ٹیوں کی بلندی اور پستی اور سرونما اور گھنی دار درختوں کی سرسبزی اور خوبصورتی دل کو لبھائے لیتی تھی۔ اس قدرتی خوبصورتی پر انسان نے یہ کاریگری کی تھی کہ اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ تمام زمین' جہاں تک نگاہ جاتی تھی' نہایت خوبصورت چمن بندی و تختہ بندی سے آراستہ تھی...... غرض کہ اسی طرح کا تماشا اور عجائبات قدرت کو دیکھتے ہوئے لینز اسٹیشن پر پہنچے۔ ہم سب لوگ گاڑی پر سے اترے اور اسٹیشن میں جا کر کچھ کھایا' چاء پی اور کچھ کھانے کی چیزیں اور دو بوتلیں پانی کی اور کچھ میوہ خریدا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ رات ہوئی' اپنی گاڑی میں سوتے' کھاتے اور ہنستے بولتے ساری رات چلا کئے۔[۶]

پیرس کے حسین شہر میں

پیرس میں آمد

دوسری مئی ۱۸۷۹ء روز یک شنبہ کو ساڑھے سات بجے صبح کے پیرس میں داخل ہوئے۔ چونکہ ہم نے دو روز تک پیرس میں رہنے کا قصد کیا تھا اس لئے وہاں اترے۔ مارسیلز کی طرح وہاں

بھی ہوٹلوں کے کمشنر موجود تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ کس ہوٹل میں جائیں گے؟ ہم نے کہا کہ میورس ہوٹل میں' اس لئے کہ ہم نے تحقیق کر لیا تھا کہ وہاں اکثر انگریز اترتے ہیں اور اس سبب سے وہاں کے اہل کار انگریزی زبان بخوبی جانتے ہیں۔ کمشنر نے ہمارے لئے دو گاڑیاں حاضر کیں اور ہم ریلوے اسٹیشن سے وہاں آئے۔ کوچوان نے کچھ ہم سے فرنچ زبان میں پوچھا۔ ہم کچھ نہیں سمجھے اور نہ وہ کچھ ہماری سمجھا.......... ہم نے وہاں کھانا کھایا اور اس خیال سے کہ آج اتوار ہے' کچھ سیر و تماشا کا قصد نہیں کیا۔[1]

وارسیل کی سیر کو روانگی

ہم نے ہوٹل کے کمشنر کو' جو انگریزی جانتا تھا' ساتھ لیا اور پیدل ٹہلنے اور کچھ ادھر اور ادھر پھرنے کا ارادہ کیا.......... خوب سیر کی۔ جب سب جگہ دیکھ چکے تب ہماری خوش نصیبی نے زور کیا اور ہم نے کمشنر سے کہا کہ اَور کسی اچھی جگہ لے چلو۔ اس نے کہا وارسیل چلو۔ وہ آج کھلا ہوا ہے اور ہر مہینے پہلے اتوار کو کھلتا ہے۔ نہایت عمدہ جگہ دیکھنے کے قابل ہے۔ ہم پیدل اس کے ساتھ چلے اور چونکہ بہت پھر چکے تھے' میں تھک گیا اور وہ لئے جاتا ہے۔ کبھی دکانات اور مکانات اور بازاروں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں اور تھکن کا مطلق خیال نہیں رہتا' اور کبھی پھر تھکن کے سبب طبیعت اکتا جاتی ہے اور کمشنر قدم اٹھائے لئے چلا جاتا ہے اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ وارسیل کیا ہے اور کتنی دور ہے۔ غرض کہ خدا خدا کر کے ایک نہایت بڑے مکان کے دروازے میں گھسے۔ وہاں بہت غول آدمیوں کا جمع تھا اور ایک اَور دروازے میں وہ لوگ گھسے چلے جاتے تھے۔ کمشنر نے ہم کو ایک جگہ ٹھہرایا اور کہا کہ میں ٹکٹ لے آؤں اور جھٹ پٹ وہ ٹکٹ لے آیا اور کہا "چلو"۔ ہم نے یقین کیا کہ اب جس دروازے میں گھستے ہیں وہی وارسیل ہے۔ جب اس میں گھسے تو دیکھا کہ نہایت عالی شان ریل کا اسٹیشن ہے اور ٹرین تیار کھڑی ہے۔ اس کو دیکھ کر طبیعت نہایت منغض ہوئی تمام رات ریل کا سفر کئے چلے آتے تھے اور پھر پھر تے پھرتے دق ہو گئے تھے' اب پھر ریل میں بیٹھنا ایسا ناگوار معلوم ہوا اور ایسی طبیعت دق ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کم بخت کمشنر ہماری اجازت کے بغیر دوسرے درجے کا ٹکٹ لے آیا تھا۔ یہاں کی گاڑیاں دوہری ہیں۔ اندر تو فرسٹ کلاس کے مسافر بیٹھتے ہیں اور چھت پر دوسرے درجے کے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ چھت پر بیٹھنا پڑے گا تو اَور بھی طبیعت دق ہوئی' اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے تیس میل جانا ہے تب تو ایسا دل ناراض ہوا کہ ٹرین پر سے اترنے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی بجائی اور چل دیا اور ہم لاچار' بے بس' نہایت دق و رنجیدہ اس پر چلے جاتے ہیں' جب تھوڑی دور

چلے اور چھت پر سے دور دور کی فضا اور خوبصورت مکانات اور ہرے ہرے میدان دکھائی دینے لگے تب تو سب کچھ بھول گئے اور کہا کہ کمشنر نے نہایت عقل مندی کی جو چھت پر بیٹھنے کا ٹکٹ لیا۔ اب طبیعت خوش ہو گئی اور یہ کہنے لگے کہ اگر بہت دور تک اسی طرح چلے چلیں تو نہایت خوب بات ہے۔ غرض کہ جس قدر رستہ ریل کا تھا وہ طے کیا اور وارسیل میں پہنچے۔ ①

سابق بادشاہوں کے فردوس محل کا نظارہ

ریل کے اسٹیشن سے تھوڑی دور جا کر ایک دروازہ ملا جو بند تھا مگر اس کے کواڑ آہنی جالی دار تھے جس میں سے اندر کی سب چیزیں دکھائی دیتی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ اندر مکانات ہیں ' باغ و چمن بندی ہے اور نہریں اور حوض فوارے ہیں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ محل ہیں جن میں فرانس کے بادشاہان سابق رہا کرتے تھے اور اب بھی سب مرتب و آراستہ ہیں.......... اس محل کے احاطے کے دروازے کے پاس 'جو اُب تک بند تھا' بہت سے مرد اور عورتیں نہایت عمدہ عمدہ اور نفیس خوش نما لباس پہنے ہوئے کھڑے تھے۔ ہم بھی وہاں جا کر ٹھہرے۔ تھوڑی دیر میں وہاں کے گرجا کے افسر کا حکم دروازہ کھولنے کا آیا اور دروازہ کھولا گیا۔ ہم سب اس میں گھسے۔ جب اندر گئے تو ہم نے جانا کہ ہم دنیا میں نہیں 'بہشت کے کسی محل میں چلے آئے ہیں۔ حوض اور نہروں... اور فواروں کی خوبی و خوش نمائی اور جس جس خوبصورت اور قدرتی بناوٹ کی سی چیزوں اور مورتوں اور جانوروں کے مونہوں کے فوارے چھوٹنے کی ترکیب رکھی تھی.......... ان تمام چیزوں کو دیکھ کر ہماری عقل حیران ہو گئی اور ہم کو اس وقت قلعہ دہلی کی مشہور مار پیچ نہر' جو دیوانِ خاص میں ہو کر رنگ محل میں جاتی تھی اور جس کے پانی سے ہم بھی ایک زمانے میں کھیلا کرتے تھے 'اور مہتاب باغ کا حوض' جس کے کنارے سے تین سو ساٹھ فوارے چھوٹا کرتے تھے اور اسی قلعے کا اور ڈیگ کمھیر بھرت پور کی عمل داری کا ساون بھادوں یاد آیا اور بلا مبالغہ اتنا ہی فرق پایا جتنا کہ نہایت خوبصورت اور نہایت بدصورت آدمی میں ہوتا ہے.......... باہر کی فضا کی سیر کرتے ہوئے ہم اندر محل میں داخل ہوئے.......... سب مکانوں اور کمروں کی سیر کرتے پھرے۔ ②

چھجو کی پریشانی

غرض کہ یہ سیر بخوبی کی۔ شام کے قریب وہاں سے چلے اور ریل میں سوار ہو کر اسٹیشن پیرس میں پہنچے۔ وہاں سے اومنی بس میں بیٹھے اور ہوٹل میں آئے۔ چھجو ہمارا نوکر ہوٹل میں تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ہم سب ہوٹل کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ جب ہم نہ آئے تو اس کو تردد ہوا۔ جب سارا دن گزر گیا اور رات ہو گئی جب بھی نہ آئے تو اس نے رونا شروع کیا۔ ہم نے آن کر

اسے روتا ہوا پایا۔ جب پوچھا کہ ارے تجھے کیا ہوا؟ تو کہا کہ جی، آپ کہاں چلے گئے تھے؟[۱]

رات کا قابلِ دید عالم

ہم نے رات کو کھانا کھا کر سیر کا ارادہ کیا اور کمشنر ہوٹل کو ساتھ لے کر بازاروں کی اور دکانوں کی سیر کی اور مارسیلز کی جتنی خوبی تھی وہ پیرس کے مقابلے میں نہایت کم معلوم ہوتی تھی۔ ادھر مکانات کی خوبصورتی اور دکانوں کی آراستگی اور شیشہ آلات کی روشنی اور نہایت طرح دار خوش لباس زن و مرد کا پھرنا جو عالم دکھارہا تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس قدر روشنی بازاروں اور سڑکوں پر تھی کہ اگر سوئی گر پڑے تو آدمی اٹھا سکتا ہے۔ ہر جگہ ایسی تھی کہ اسی کو دیکھنے کو بے اختیار دل چاہتا تھا اور ٹھیک ٹھیک یہ شعر اس پر صادق آتا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

خیر، تھوڑی دیر سیر کر کے ہم چلے آئے۔[۲]

صفائی کی کیفیت

صبح کو یعنی تیسری مئی روز دوشنبہ ۱۸۶۹ء کو بازاروں کی سیر کو پیدل نکلے.......... بازاروں کی سیر کی۔ پھر آن کر کھانا کھایا اور دو گھوڑوں کی گاڑی منگا کر سوار ہوئے۔ کمشنر ہوٹل کو ساتھ لیا اور کہا کہ ہم کہیں اترنے کے نہیں، صرف عمدہ مقاموں کی باہر سے سیر کرنا اور ایک سرسری نظر سے ہر چیز کو دیکھ لینا منظور ہے۔ اگرچہ کمشنر ہر ایک عمدہ جگہ لے جاتا تھا اور نام بھی ہر جگہ کے بتاتا جاتا تھا مگر فرنچ نام یاد نہیں رہ سکتے تھے۔ علاوہ اس کے ہم کمشنر کی بات سنیں یا مکانات کو اور بازاروں کی خوبصورتی کو دیکھیں.......... جیسی صفائی ہم نے پیرس کے عام بازاروں میں دیکھی اس کو بیان کرنا لوگ مبالغہ سمجھیں گے۔[۳]

نپولین کی فوج کی وردی کی خوبی

پیرس میں جنگی فوج اس قدر دکھائی دی کہ کیا بیان کریں۔ ہم نے تو ہر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد کسی نہ کسی ٹکڑہ فوج کو شہر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وردی فوج کی ہم کو نہایت پسند آئی۔ بہت خوش وضع تھی اور سب سے زیادہ یہ خوبی تھی کہ نہایت اجلی اور صاف براق۔ ہم نے سنا کہ شہنشاہ نپولین فوج کو بہت دوست رکھتا ہے اور فوج بھی اس سے نہایت خوش ہے اور بہت چاہتی ہے۔[۴]

ایک بہشت کے ٹکڑے کی سیر

ہم سے شہر میں جہاں تک پھرا گیا پھر کر شہر کی حد سے باہر چلے۔ "شہر کی حد سے باہر چلنا" میں نے کہا اور "شہر سے باہر چلنا" نہیں کہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس حد کے باہر بھی ویسے ہی مکانات، ویسے ہی بازار تھے ...... ہم اس حد کے باہر ہوئے اور چند میل چلے گئے کہ دفعتاً ہمارے سامنے ایک بہشت کا ٹکڑا آیا یعنی پارک، ایک نہایت وسیع میدان .... اسی پارک میں سیر کرتے کرتے ہم ایک جگہ پہنچے ...... جس وقت ہماری گاڑی اس دکان کے دروازے پر ٹھہری ایک خدمت گار نہایت عمدہ وردی پہنے ہوئے آیا اور سر جھکا کر آداب کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ہم اترے اور چونکہ ہم کو وہاں کچھ کھانا منظور نہ تھا ہم مکان کے اندر نہیں گئے۔ اس خدمت گار کا شکر فرنچ الفاظ میں "سی وپلی" کہہ کر ادا کیا۔ یہ فرنچ لفظ ہم نے مارسیلز کے ہوٹل میں سیکھ لئے تھے اور ہم نے اس سے کہا کہ ہم ابھی پھریں گے اور سیر کریں گے وہاں سے ہم چلے اور اس قدرتی بنائے ہوئے چشمے کی سیر کرنی شروع کی ...... ہم اس کی خوبی اور فضا اور خوبصورتی بیان نہیں کر سکتے ہم بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے اور خدا کی قدرت کو یاد کیا کئے۔ سبحان اللہ، خدا نے اپنی دنیا میں کیا کیا کچھ پیدا کیا ہے۔[1]

ہم نے سنا ہے کہ پیرس کے لوگ پیرس نہیں کہتے بلکہ "پیراڈائز" کہتے ہیں یعنی بہشت، اور کچھ شک نہیں کہ پیرس دنیا میں بہشت ہے:

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است[2]

ہوا سے چلنے والا پمپ

اس مقام کے قریب ایک اور نفیس میدان گھوڑ دوڑ کا تھا اس کو جا کر دیکھا اور چوبی مکانات، جو لوگوں کی سیر کے لئے بنے ہوئے ہیں ان کو دیکھا۔ اس کے پاس ایک پمپ چل رہا تھا جس کے پنکھوں کو صرف ہوا سے حرکت ہوتی تھی اور بہت پانی نکالتا تھا۔ وہاں ایک مرد اور اس کی جورو ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جو اس پمپ پر نوکر تھے۔ ان کے رہنے اور بیٹھنے کے طریق کو دیکھ کر مجھے ہندوستان پر نہایت افسوس ہوا۔ میں نے ان سے اوپر جانے اور دیکھنے کی اشارے سے اجازت چاہی۔ انہوں نے مسافر سمجھ کر بہت اخلاق کیا اور وہ مرد ہمارے ساتھ ہو لیا اور سب چیز بخوبی ہم کو دکھائی۔ ہم نے اس کا شکر کیا اور اخیر وقت یعنی قریب شام کے اپنے ہوٹل میں لوٹ آئے۔[3]

جوان خوش رُو دکاندار عورت کی بلبل زبانی

رات کو ہم پھر بازار میں نکلے اور ہاتھوں کے دستانے مول لینے کا ارادہ کیا۔ ایک دستانے والے کی دکان میں گئے۔ دیکھا کہ ایک جوان خوش رو عورت کرسی پر میز کے اس طرف بیٹھی ہے' نہایت خوش لباس پہنے ہوئے۔ جوں ہی ہم اندر گھسے وہ کھڑی ہو گئی اور قدرے خم ہو کر ایسی حالت بنائی جیسے خواہش مند ہے کہ آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ بات اس نے اس لئے کی تھی کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہم کون سی زبان جانتے ہیں۔ اتنے میں ہم میں سے کسی نے انگریزی میں دستانوں کو کہا۔ پھر تو بلبل کی طرح انگریزی بولنے لگی۔ ہر ایک کا ہاتھ دیکھا اور فی الفور اس کے لائق دستانے لے آئی اور اپنے ہاتھ سے پہنا دیئے' اور اس تمام وقت میں نہایت شائستہ گفتگو کرتی جاتی تھی۔ جب ہم سب پہن چکے تو اس سے دام لینے کو کہا۔ اس نے کہا کہ کیا تم ایک ہی جوڑا لو گے ؟ اور اس نے اس بات پر رغبت دلانے کو کہ ہم لوگ متعدد جوڑے لے لیں' نہایت شیریں گفتگو کی۔ کبھی تو یہ جتایا کہ پیرس سے بہتر کوئی فیشن نہیں ہے اور یہاں کے دستانوں سے بہتر کسی ملک کے دستانے نہیں ہیں۔ ڈنر پر جانے کے لئے 'لیڈیز سے ملنے کو جانے کے لئے' ملکہ پاس 'ایمپرر پاس جانے کے لئے دستانے درکار ہوں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ کسی جگہ تم کو تکلیف نہ ہو' اس لئے متعدد جوڑے رکھ لو تو بہتر ہے۔ میں نے کہا' تمہاری مہربانی کا شکر مگر ہم کو ضرورت نہیں۔ ہم صرف بازار کی سیر کرتے ہیں' کہیں کچھ خرید بھی لیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت چار زبانیں جانتی تھی:۔ فرنچ' انگریزی' اٹالی اور جرمن' اور چاروں میں نہایت عمدہ گفتگو کرتی تھی اور یہ صرف اس لئے سیکھی تھی کہ جس ملک کا خریدار آئے اس سے بآسانی گفتگو کر سکے۔ ہم نے ان کی قیمت اس کو دے دی اور اسی طرح متعدد بازاروں کی سیر کر کے واپس آئے۔[1]

آدھی رات کو کپڑوں کی خرید

آدھی رات کے وقت ہم پھر بازار میں گئے اور مرزا خداداد بیگ کے لئے گرم کوٹ اور پتلون خرید کیا۔ درزی کی دکان میں گئے۔ چند کمرے نہایت آراستہ تھے اور ہر کپڑا نمبر سے رکھا ہوا تھا۔ اس نے یہ بات دریافت کر کے کہ کس قسم کے کپڑے کا خریدنا ہے' مرزا کا بدن ناپا اور اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ فلاں نمبر کا کوٹ پتلون لاؤ۔ اس نے حاضر کیا۔ افسر نے ایک آراستہ کمرہ بتا دیا۔ مرزا اس میں گئے اور کپڑے بدل کر برش' آئینہ' کنگھی کر کے ایک خوبصورت جوان بنے ٹھنے نکل آئے۔ اس وقت بھی تمام بازار کھلے ہوئے تھے' دکانیں آراستہ تھیں' وسی ہی روشنی تھی' اسی طرح لوگ پھر رہے تھے۔[2]

پیرس سے لندن

انگلش چینل کے سفر میں متلی اور قے کی کیفیت

چوتھی مئی ۱۸۷۹ء روز سہ شنبہ کو پونے آٹھ بجے ہم پیرس سے روانہ ہوئے۔ کیلے پر انگلش چینل تک ریل پر آئے۔ وہاں دخانی کشتی ہم مسافروں کے لئے تیار تھی۔ ہم ریل پر سے اتر کر اسٹیمر میں گئے۔ انگلش چینل بہت بڑا چوڑا نہیں ہے۔ صرف ڈھائی تین گھنٹہ کا راستہ ہے مگر اس کے پانی کو عجیب قسم کی حرکت ہے کہ جہاں اسٹیمر چلا اور پانی نے اس کو ہلایا اور آدمی کو قے آئی۔ کپتان جہاز نے ہم سب کو اس بڑے کمرے میں جگہ دی جو فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے تھا۔ جب ہم اس کمرے میں داخل ہوئے تو عجیب تماشا دیکھا کہ ہر مسافر کے لیٹنے کی جگہ بنی ہوئی ہے اور تکیہ رکھا ہوا ہے اور ایک برتن چینی کا قے کرنے کو رکھا ہوا ہے' جو لیڈیاں ہم سے پہلے وہاں چلی آئی تھیں وہ لیٹی ہوئی ہیں اور آنکھیں بند کر کے سونے کا قصد کر رہی ہیں تاکہ سونے کی حالت میں وہ رستہ طے ہو جائے۔(۱)

خداداد بیگ کے قے کرنے کا لطیفہ

ہم کو تعجب تھا کہ ایسی کیا حرکت ہوگی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور مرزا خداداد بیگ نے بیچ میں آکر قے کرنے کا برتن پرے ہٹا کر رکھ دیا تھا۔ اتنے میں جہاز کھلا۔ کوئی سو گز چلا ہو گا کہ ہم سب کا جی متلایا۔ سب لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں اور کچھ غفلت سی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد خداداد بیگ گھبرا کر اٹھے اور ابکائی لی اور قے کرنے کے برتن کو' جسے پرے ہٹا دیا تھا' گھبراہٹ میں ٹٹولنے لگے۔ ان کے قریب ایک میم صاحب لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جانا کہ اس جنٹلمین نے مجھ پر قے کی۔ وہ جلدی اٹھ بیٹھیں اور نہایت مہربانی سے اپنا برتن اٹھا کر دیا۔ خداداد بیگ اسی گھبراہٹ کی حالت میں "تھینک یو" کہتے تھے' آدھا لفظ نکلا اور "او" کر کے قے کی۔ زرد پانی بالکل پت اور پھر بے ہوش ہو کر پڑ گئے اور بہت سے انگریز اور لیڈیاں قے کرتی تھیں اور پڑ پڑ جاتی تھیں۔ محمود نے بھی قے کی۔ حامد کا جی متلایا' پانی منہ میں بھر بھر آیا مگر قے نہیں ہوئی۔ میرا بھی یہی حال ہوا اور غفلت سی ہو گئی۔(۲)

لندن میں آمد

خدا خدا کر کے وہ رستہ طے ہوا۔ کنارہ آیا' ڈوور میں اترے اور ریل پر سوار ہوئے۔ سات بجے کے قریب چیرنگ کراس اسٹیشن واقع لندن میں اترے............ ہمارے ایجنٹ میسرز ہنری

الیس کنگ اینڈ کو نے مسٹر اسٹارر کو ریل کے اسٹیشن پر بھیج رکھا تھا کہ ہم کو آرام سے ہوٹل میں ٹھہرائیں۔ جس وقت ٹرین ٹھہری مسٹر اسٹارر ہم سے ملے اور نہایت آرام سے ہم کو چیرنگ کراس ہوٹل میں اتارا۔ ہمارا سفر لندن تک کا ختم ہوا۔[9]

اس سفرنامہ میں ہر ایک کو یہ حال جو اثنائے راہ میں انکو پیش آیا ہے بیان کیا گیا ہے۔ سفر کی خصوصیات جو ہر مسافر کو پیش آتی ہیں مفصل بیان کی ہیں۔ اور قانونی جو خیالات اپنے خاص مقصد یعنی وطن کی بھلائی کے لئے دل میں گذرے ہیں انکو ہر موقع پر ظاہر کیا ہے جا بجا ہندوستان و یورپ کے شہروں اور سول حالتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپ کے عجائبات ایسے عمدہ بیان کیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو یورپ کے سفر کی ترغیب ہو۔

جس زمانہ میں سرسید نے یہ سفر اختیار کیا تھا اسکا ثبوت اس سفرنامہ میں نہایت وضاحت کے ساتھ ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامہ لکھنے والا وطن اور قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی میں ڈوبا ہوا ہے۔ جیسے عدن میں پہنچکر کہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں کے اخلاق، نام و نمود پر مرنے، جھوٹی شیخی کرنے، مفید تعلیم پر متوجہ نہ ہونے اور گھروں میں بند رہ کر بیٹھے رہنے پر افسوس کرتا ہے؛ اور پارسیوں کی عمدہ حالت سے انکا مقابلہ کرتا ہے۔ کہیں پارسیوں کے صاف اردو بولنے پر حیران ہوتا ہے: اور ان لوگوں پر تعجب کرتا ہے جو اردو کو ہندوستان کی قومی زبان نہیں مانتے۔ کہیں گجراتی زبان کی کچھ عبارت نقل کرتا ہے؛ اور بتاتا ہے کہ اس میں بھی فارسی اور عربی الفاظ ملے ہوئے ہیں: اور پھر سوال کرتا ہے کہ اللہ جانے ہمارے پنڈت کون کون سی زبان سے فارسی و عربی الفاظ نکالکر تہذیب کا تماشا کریںگے! مصر کی ریل کی تعریف کرکے افسوس کرتا ہے کہ ریل کا تمام سامان فرانس اور انگلستان کا بنا ہوا ہے: مصر والوں کی کوئی چیز بنائی ہوئی نہیں۔ مسٹر ڈینس فٹز پیٹرک سے جہاز میں ملتا ہے؛ اور پنجاب کی طرز حکومت کے ذکر میں اسکو ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ بتلاتا ہے: اور ہائی کورٹ کو قانونی ممالک میں سے نکالکر پنجاب میں داخل کرنے کو غدر کی سزاؤں میں سے ایک سزا قرار دیتا ہے۔ فرانس کے نامور انجنیئر ایم۔ ڈی لیسپس سے جسنے نہر سویز نکالی ہے: جہاز میں ملنے پر بے انتہا خوشی اور فخر ظاہر کرتا ہے: اور اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ جب انگریزوں نے اسکو ایڈریس دیتے وقت اسکا اس نہر کا نام نہر لیسپس رکھنا چاہا تو ایم ڈی لیسپس نے جواب دیا کہ میرا فخر اسی میں ہے کہ اسکا نام نہر فرانس رکھا جائے۔ وہاں انکی وطن پرستی پر ہزار ہزار آفرین کرتا ہے اور اپنی قوم کو نفرین۔ کہ انکا کام سوائے حسد، بغض، تشخص اور جھوٹی شیخی کرنے کے کچھ نہیں: اور اسی سبب سے وہ بیہودہ ذلت میں گرفتار ہیں۔ اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ جس آبنائے پر محب وطن گیریبالڈی کا گھر ہے وہاں سے جہاز رات کو گذرا! اور اس پھونس کے جھونپڑے کی جو شہنشاہوں کے محلوں سے زیادہ ادب اور تعظیم کے قابل ہے۔ زیارت میسر نہ آئی۔ پیرس کی عمارتوں کی خوبی کا ذکر کرتے وقت روضہ تاج گنج اور قطب کی لاٹ کو یاد کرتا اور اس پر فخر کرتا ہے۔ وارسیل کے شہنشاہی محل میں حوض اور نہریں اور فوارے اور عمدہ درختوں کی موزونیت دیکھکر قلعہ دہلی کی نہر اور مہتاب باغ کا حوض جسکے کناروں سے کبھی تین سو ساٹھ فوارے چھوٹتے تھے اور ساون بھادوں کی کیفیت یاد کرتا ہے۔ وارسیل میں تصویروں کا ملاحظہ کرتے ہوئے حیران ہوتا ہے: مگر الجزائر کے معرکوں کی تصویروں میں ایک موقع دیکھکر اسکے دل پر سخت چوٹ لگتی ہے؛ جسکی وجہ سے وہ فرانس اور اسکی بہادری و سولیزیشن کو قابل نفرین سمجھتا ہے۔ اسنے ایک تصویر دیکھی ہے کہ سید عبدالقادر جزائری کی عورتیں گرفتار ہیں: فرانسیسی سپاہیوں نے خیمے لوٹ لئے ہیں اور گرفتار کر لیا ہے! اور عورتیں خیموں سے نکل پڑی ہیں؛ اور آگے انکے بہت سا کپڑا اور سامان بکھرا پڑا ہے: سپاہی گھوڑوں پر سوار ہوئے ہوئے اور انکی نگاہیں عورتوں کی طرف کیے ہوئے ہیں۔ گویا اب ہاتھ بڑھائیںگے۔ اور گزر رہے ہیں۔ اس تصویر کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک غیرت مند مسلمان کے لیے ان عورتوں کا ایسی بیکسی کے عالم میں دیکھنا آنکھوں سے خون ٹپکانے کے لیے کافی ہے: اور کہتا ہے کہ اس تصویر کو فرنچ سپاہ کی بہادری کی یادگار سمجھنا اور عورت کا کپڑا تصویر میں بدن پر سے ہٹا ہوا بنانا فرانس کے لیے قابل شرم ہے؛ اور اسکی شائستگی کو دھبا لگاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ اس تصویر سے عبدالقادر کی حقارت نہیں ہوتی؛ بلکہ اسکی ویسی ہی عزت دل میں پیدا ہوتی ہے جیسی کہ اسکی بادشاہت کے زمانہ میں تھی۔ وہ بیس برس تک تن تنہا فرانس جیسی سلطنت سے نہایت بہادری اور سچائی سے لڑا؛ نا فرجام قید ہوا؛ اور شکست کے بعد جن شرطوں پر صلح کی انکو بغیر عذر کے نباہ دیا" پھر ایک دوسرے موقع کی تصویر دیکھتا ہے جس میں نپولین۔ امیر عبدالقادر کو قید سے چھوڑ رہا ہے؛ اور اسکی ماں سے جو باہر پھرنے کا پردہ پہنے ہوئے اور ایک پیش کھڑی ہے۔ مصافحہ کر رہا ہے۔ اس تصویر کو دیکھکر نپولین کی فیاضی، عالی ہمتی اور ہمت کی تعریف کرتا ہے۔

اسکے بعد وہ لندن پہنچتا ہے اور اپنے سفرنامہ کے خاتمہ پر ہندوستان کے تمام سنی شیعہ اور ہندوؤں کو آگاہ کرتا ہے کہ سب ہندوستانی اپنے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ سفر کر سکتے ہیں۔ پھر اپنے جان پہچان انگریزوں کی ملاقات کا ذکر کرنے کے بعد کلفٹن کے لٹکواں پل کی بنانے کی تاریخ بیان کرتا ہے جو دولت سے ناتمام پڑا تھا؛ اور جسکو سول انجینیرس انسٹیٹیوٹ کے ممبروں نے ایک مسٹر کی بدنامی کے خیال سے باہم اتفاق کرکے اپنی فیاضی سے بنا دیا۔ پھر اپنے ہموطنوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے ہموطنو! بتاؤ کہ انسان یہ لوگ ہیں یا ہم جو حیوانوں کی طرح اپنی خودغرضیوں میں مبتلا ہیں؛ اور اپنے ہر ایک کام کا بندوبست گورنمنٹ سے چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکوں کو بھی وہی پڑھائے؛ ہماری مذہبی تعلیم کا بھی وہی انتظام کرے۔

سرسید کے سفرنامہ لندن پر حالی کا جامع تبصرہ (عکس از حیات جاوید)

"ملکۂ معظمہ وکٹوریا دام سلطنتہا ملکۂ ہند و انگلینڈ"
دو ہندوستانی محافظوں مصطفےٰ اور چڈا کے ساتھ

"ملکۂ معظمہ وکٹوریا دام سلطنتہا ملکۂ ہندو انگلینڈ"
دو ہندوستانی محافظوں مصطفےٰ اور چیڈا کے ساتھ

قیامِ لندن

رہائش

(چند خطوط سے اقتباسات)

"لاجنگ" کا طریقہ

"جب میں لندن پہنچا تو تین چار دن چیرنگ کراس ہوٹل میں ٹھہرا۔ میرے پاس نہ اتنا روپیہ تھا، نہ مجھ کو ایسا مقدور تھا کہ میں علیحدہ مکان کرایہ پر لے کر اس میں رہتا اور تمام اسباب خرید کرتا اور نوکر رکھتا، اس لئے لاجنگ میں نے کرایہ پر لیا۔ لاجنگ کے یہ معنی ہیں کہ جس مکان میں صاحب مکان رہتا ہے اسی میں چند کمرے وہ کرایہ پر دے دیتا ہے۔ مکان کو اسباب ضروری سے، یہاں تک کہ سونے کے پلنگ اوڑھنے اور بچھونے سے مرتب کر دیتا ہے۔ مکان والا "لینڈلارڈ" اور اس کی بیوی "لینڈ لیڈی" کہاتی ہے۔ کھانا بھی وہی پکوا کر کھلوا دیتی ہے۔ نوکروں کا بندوبست بھی وہی کرتی ہے۔ ہر ہفتہ ایک بل دے کر جو خرچ ہوتا ہے لے لیتی ہے اور نہایت آرام سے گزرتی ہے"[1]

رہائشی مکان کی کیفیت

"میں ایک نہایت دلچسپ مکان میں رہتا ہوں .... چھ کمرے اس مکان کے ہم سے

متعلق ہیں۔ چار تو بیڈ روم ہیں یعنی ہم چاروں کے لئے سونے کے چار کمرے۔ حامد، محمود، مرزا خداداد بیگ کے سونے کے کمرے میرے سونے کے کمرہ سے کسی قدر زیادہ اچھے ہیں اور ان میں فرنیچر بھی کسی قدر زیادہ ہے اس لئے کہ وہ اسی کمرہ میں دولت کو پڑھتے بھی ہیں اور کتاب بھی دیکھتے ہیں۔ میرے کمرہ میں صرف سونے کا سامان ہے مگر ایسا ہے کہ میں نے ہندوستان میں نہیں دیکھا تھا، شاید کلکتہ بمبئی والوں نے دیکھا ہو۔ ایک کمرہ میرے لکھنے اور کتاب دیکھنے اور کتاب کی تصنیف کرنے کا ہے اور اس کمرہ میں ہم کھانا بھی کھاتے ہیں اور چائے بھی پیتے ہیں۔ اور ایک بڑا کمرہ آراستہ ہے جو "سِٹنگ روم" کہلاتا ہے یعنی ملاقات کا کمرہ۔ اس میں کبھی ہم سب مل بیٹھتے ہیں اور دل خوش کرتے ہیں، اور جب کوئی دوست ہم میں سے کسی سے ملاقات کو آتا ہے تو اس کمرہ میں ملاقات ہوتی ہے۔" (۱)

مالک مکان میاں بیوی کی خوبیاں

"میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ مسٹر جے لڈلم کے قبضہ میں ہے۔ اس کی ایک بی بی مسز لڈلم ہے .... مسٹر جے لڈلم ایسا لائق اور قابل آدمی ہے جیسے کہ نہایت لائق اشراف کو ہونا چاہئے .... بجز اس کے کہ کبھی ملاقات ہوئی اور بات چیت ہوئی یا کمرہ میں جانے نکلنے کے وقت اتفاقیہ صاحب سلامت ہو گئی کبھی میرے کمرہ تک اس کی آواز نہیں آئی۔ ہر وقت اس بات کا خیال رہتا کہ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں ان کو تکلیف نہ ہو کیسی عمدہ اخلاق کی بات ہے۔" (۲)

"مسز لڈلم ایک ایسی قابل اور تعلیم یافتہ، نہایت شائستہ، نہایت پڑھی لکھی، نہایت نیک بی بی ہے کہ اس کی خوبیاں مجھ سے بیان نہیں ہو سکتیں۔ تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت سب چیز کی مجسم ہے۔ تمام کام اور تمام معاملات خانہ داری کے نہایت لیاقت سے خود کرتی ہے اور مسٹر لڈلم کو بجز آفس میں جانے اور اپنے علمی جلسوں میں شریک رہنے کے کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔" (۳)

سلیقہ شعار ملازمہ کے معمولات

"ہماری مہربان لینڈ لیڈی نے ہمارے کاموں کے انجام کے لئے دو نوکریں رکھی ہیں ایک کا نام این اسمتھ اور دوسری کا الزبتھ ماتھیوز۔ پچھلی تو کم عمر غریب لڑکی ہے، متفرق کام کرتی ہے اور پہلی نہایت ہوشیار اور لائق پڑھی لکھی خوش خط باسلیقہ ہے۔ کتابیں پڑھ سکتی ہے، تمام ضروری مضمون لکھ سکتی ہے، اخبار پڑھ سکتی ہے اور اس سے خوشی حاصل کر سکتی ہے۔ اپنا

متعلق کام اس خوبی سے انجام دیتی ہے کہ جیسے کوئی کل یا گھڑی بلاتفاوت باقاعدہ اپنا کام کرتی ہے۔"[1]

"ہم اپنے سونے کے کمرہ میں سے بعد فارغ تمام ذاتی کاموں کے پوری پوشاک پہن کر قریب ساڑھے آٹھ بجے کے اپنے لکھنے پڑھنے کے کمرہ میں آتے ہیں۔ اس عرصہ میں این المحمہ دونوں کمروں کو صاف کر رکھتی ہے اور ہر چیز' کیا چوکی اور کیا میز اور کیا الماری اور کیا تصویریں اور کیا قلم دان اور کیا کتابیں' غرض کہ تمام چیزیں جھاڑ پونچھ کر اور آراستہ کر کے اپنے اپنے موقع پر رکھ دیتی ہے۔ آتش دان میں بہ قدر حالت سردی کے آگ جلا رکھتی ہے۔ اگر کوئی چٹھی کسی کے نام کی آئی تو وہ ہر ایک کا نام پڑھ کر ہر ایک کی نشست کی چوکی کے آگے رکھ دیتی ہے' اگر کوئی اخبار ہوا تو اس کو سب کے بیچ میں رکھ دیا کہ جس کا دل چاہے وہ لے کر پڑھے۔ غرض کہ ہم کمرہ میں آئے' سب چیز کو آراستہ پایا۔ قریب نو بجے کے وہ کمرے کے دروازہ پر آئی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آنے کی اجازت چاہی۔ جب معمولی الفاظ سے اجازت ملی وہ اندر آئی اور کھانے کی میز پر چادر بچھائی اور بریک فاسٹ کا سامان سب تیار کیا۔ تمام گفتگو نہایت شستہ' نہایت مؤدب اور باوجود مؤدب ہونے کے خوش خو اخلاق اور انسانیت سے بھری ہوئی' ہر ایک سے تم کہہ کر بات کہتی' حامد کو مسٹر حامد' محمود کو مسٹر محمود اور مرزا خدا داد بیگ کو مسٹر بیگ نہایت ادب آمیز طریقہ سے کہنا۔ اور چونکہ وہ جان گئی ہے کہ مرزا خداداد بیگ کا یہ پورا نام نہیں ہے' ایک آدھ دفعہ یہ بھی کہہ دیا "سر پلیز پارڈن می' یور فل نیم از ویری ڈفیکلٹ" یعنی "آپ مجھے معاف فرمائیں جو میں نے آپ کا پورا نام نہیں لیا' آپ کا پورا نام بہت مشکل ہے"۔ اب بڑا تماشا ہو گیا ہے کہ ہم سب نے مرزا خداداد بیگ کا نام مسٹر بیگ رکھ دیا ہے۔ غرض کہ اسی طرح تمام چیزیں وقت پر موجود اور تیار رکھتی ہے' اور ڈنر اور سپر سب کا سامان اسی طرح خوبی و درستی سے انجام دیتی ہے۔ آپ یقین جانئے کہ اگر یہ عورت' جو نہایت غریب آدمی اور اصیل گری کی نوکری کی محتاج ہے اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے' اگر ہندوستان میں جائے اور اچھے سے اچھے امیر آدمی کی عورتوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے۔ یہ صرف نتیجہ عام تعلیم و تربیت کا ہے۔[2]

مصروفیات

کتب خانہ انڈیا آفس کا البم اور محمود کی شرمندگی

کتب خانہ انڈیا آفس میں سے نے دیکھا' ہوش جاتے رہے۔ کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کا شہر

ہے۔ مجھ وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب کی اجازت ہو گئی۔[1]

انڈیا آفس میں تمام ہندوستان کی قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کلاس میں بیان ہے اس کی بعینہٖ تصویر بھی ہے اور اکثر تصویریں فوٹو گراف کی اتاری ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عین اسی وقت اور اسی حالت میں لی گئی ہیں۔ پھر ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کیسے کچھ وحشیانہ ہیں اور جانوروں سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔[2]

ایک دن میں حامد اور محمود انڈیا آفس میں گئے۔ محمود نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں ایک جوان انگریز، شاید کوئی سول سروس پاس کئے ہوئے تھا، آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محمود سے پوچھا کہ تم بھی ہندوستانی ہو؟ محمود نے اسی وقت بلا خیال کہا "یس" (ہاں) مگر یہ کہتے ہی اس کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے کہا کہ

"آئی ایم اے فارن نیشن اینڈ ناٹ این انڈین"

یعنی "میں ہندوستان کی قوم کا آدمی نہیں ہوں بلکہ پردیسی قوم کا ہندوستان میں آیا ہوں"۔[3]

کتب خانہ برٹش میوزیم کے متعلق تاثر

کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے۔ کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔[4]

میل ملاقاتیں

میں انڈیا آفس میں صاحب سیکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسبابِ بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی، اسے دیکھ کر بہت دل خوش ہوا۔[5]

وزیر ہند سے ایک دفعہ مع حامد و محمود ملاقات ہوئی تھی اور دو دفعہ صرف میں تنہا ملا، میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا، سب سمجھا اور سب جواب صحیح دیئے مگر نہایت بڑی خراب انگریزی میں۔[6]

جناب لارڈ لارنس بہادر گورنر جنرل و وائسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لائے۔[7]

٭ حالی لکھتے ہیں: "لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے ان کے ساتھ پیش آئے۔ یہ کہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں ہی نے سرسید کو لندن کے اکثر امراء و مشاہیر سے ملوایا تھا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 154)

جس دن کہ جناب ڈچز آر گائل یعنی (اہل خانہ وزیرِ ہند) نے دعوت میں مجھے بلایا ہے اسی رات وہاں مسٹر پالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی' انہوں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا۔ وہ گھر پر نہ تھے' ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے؟ دس روپیہ روز میں نے کہا' مرنے اس لئے دوبارہ نہیں گیا۔①★

وہ ازراہِ عنایت میرے مکان پر مجھ سے ملنے آئے' بہت عنایت سے ملے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔②

...... لندن کے احباب اور علما اور اشخاص نامی جس محبت و اخلاص و عنایت سے مجھ سے ملے اور صرف اپنے اخلاق سے مجھ غریب نالائق کی جس قدر خاطر کی ہے اگر وہ لکھا جاتا تو مبالغہ پر محمول ہوتا اور حاسد شاید آتشِ حسد میں اس قدر برافروختہ ہوتے کہ بغیر آتشِ حسد کے اور کچھ نہ رہتا۔③

جس اخلاق سے یہاں کے امرا اور اراکین ملے ہیں اس کا بیان بیان سے باہر ہے۔ کچھ میرے ہی ساتھ یہ اخلاق نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ لوگ با اخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔④

عزت افزائیاں

سی ایس آئی کے خطاب کا حصول

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو بخطاب "کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا" معزز و ممتاز فرمایا'

★۔ ملاقاتوں کے دستور اور ان پر اٹھنے والے بھاری خرچ کے متعلق سرسید اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"اس وقت میرے پاس تیس چٹھیاں ملاقات کی اور دس پندرہ ٹکٹ رکھے ہیں اور یہ سب امرا اور لارڈ اور سر ہیں۔ صرف خرچ سواری کے ڈر کے مارے کہیں نہیں گیا اور نہ خیال کر سکتا ہوں کہ کیونکر سب سے ملوں گا۔ جو لوگ کہ میرے گھر پر آ جاتے ہیں لاچار ان کے ہاں یا جس کے پاس نہایت ضرور جانا چاہئے وہاں جاتا ہوں۔ سو اب تک سوائے ایک دفعہ کے دوسری دفعہ کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک آدمی ڈیڑھ سو روپیہ مہینے میں یہاں بخوبی بآرام گزر کر سکتا ہے' اِلا جب کہ آنا جانا چاہے اور لوگوں سے ملے اور عزت کے ساتھ جانا آنا چاہے تو صرف سواری کا خرچ چار سو روپیہ ماہواری پڑے گا۔ کبھی ایک گھوڑا اور کبھی دو گھوڑے کی بگھی نصیب ہو گی۔ بعضے ایسے موقعے ہوتے ہیں کہ وہاں ضرور دو گھوڑوں پر جانا چاہئے۔ شب گزشتہ کو صرف محمود کی ایک انگریز نے دعوت کی تھی' دو گھنٹے ان کو وہاں لگے اور ایسے سڑل گاڑی اکہ میں وہاں گئے تھے جیسے بنارس میں دو دو تین تین آنہ کرایہ کے اکے ہوتے ہیں۔ سات شلنگ یعنی سات روپیہ آٹھ آنے خرچ ہوئے۔ اب موافق یہاں کی رسم کے دوسرے یا تیسرے دن صاحب خانہ سے ضرور ملنے جانا چاہئے اس قدر روپیہ پھر خرچ ہو گا" (خطوطِ سرسید' ص 36-37)

ہے۔ مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب کی اجازت ہو گئی۔[1]

انڈیا آفس میں تمام ہندوستان کی قوموں کی تصویریں اور حالات و رسومات کی ایک کتاب ہے اور جس رسم کا اس میں بیان ہے اس کی بعینہ تصویر بھی ہے اور اکثر تصویریں فوٹو گراف کی لی ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عین اسی وقت اور اسی حالت میں لی گئی ہیں۔ پھر ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کیسے کچھ وحشیانہ ہیں اور جانوروں سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔[2]

ایک دن میں حامد اور محمود انڈیا آفس میں گئے۔ محمود نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں ایک جوان انگریز' شاید کوئی سول سروس پاس کئے ہوئے تھا' آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محمود سے پوچھا کہ تم بھی ہندوستانی ہو؟ محمود نے اسی وقت بلا خیال کہا "یس" (ہاں) مگر یہ کہتے ہی اس کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ اس کا رنگ متغیر ہو گیا اور اس نے کہا کہ

" آئی ایم اے فارن نیشن اینڈ ناٹ این انڈین "

یعنی "میں ہندوستان کی قوم کا آدمی نہیں ہوں بلکہ پردیسی قوم کا ہندوستان میں آیا ہوں"۔[3]

کتب خانہ برٹش میوزیم کے متعلق تاثر

کتب خانہ برٹش میوزیم ایک نہایت بڑا جنگل کتابوں کا ہے۔ کئی الماریاں صرف فہرست کی ہیں۔[4]

میل ملاقاتیں

میں انڈیا آفس میں صاحب سیکرٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسبابِ بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی' اسے دیکھ کر بہت دل خوش ہوا۔[5]

وزیر ہند سے ایک دفعہ مع حامد محمود ملاقات ہوئی تھی اور دو دفعہ صرف میں تنہا ملا' میں نے انگریزی میں ان کی سب باتوں کا جواب دیا' سب سمجھا اور سب جواب صحیح دیئے مگر نہایت بڑی خراب انگریزی میں۔[6]

جناب لارڈ لارنس بہادر گورنر جنرل و وائسرائے ہندوستان میرے ملنے کو تشریف لائے۔[7]★

★ حالی لکھتے ہیں: "لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی' مروت اور خلق سے ان کے ساتھ پیش آئے جیسے کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے مسافروں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور ان کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ اکثر ان کو اپنے گھر ڈنر پر بلاتے تھے اور مہینے میں ایک بار ہمیشہ ان سے ملنے کو آتے تھے۔ انہوں ہی نے سرسید کو لندن کے اکثر امراء و مشاہیر سے ملوایا تھا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 154)

جس دن کہ جناب ڈچز آر گائل یعنی (اہلی خانہ وزیر ہند) نے دعوت میں مجھے بلایا ہے اسی رات وہاں مسٹر پالک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، انہوں نے اپنا پتہ لکھ دیا۔ دوسرے دن میں وہاں گیا۔ وہ گھر پر نہ تھے، ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ کرایہ کی بگھی میں کیا خرچ پڑتا ہے؟ دس روپیہ روز میں نے کہا، مرنے اس لئے دوبارہ نہیں گیا۔[1]★

وہ ازراہِ عنایت میرے مکان پر مجھ سے ملنے آئے، بہت عنایت سے ملے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔[2]

...... لندن کے احباب اور علما اور اشخاص نامی جس محبت و اخلاص و عنایت سے مجھ سے ملے اور صرف اپنے اخلاق سے مجھ غریب نالائق کی جس قدر خاطر کی ہے اگر وہ لکھا جاتا تو مبالغہ پر محمول ہوتا اور حاسد شاید آتشِ حسد میں اس قدر برافروختہ ہوتے کہ بغیر آتشِ حسد کے اور کچھ نہ رہتا۔[3]

جس اخلاق سے یہاں کے امرا اور اراکین ملے ہیں اس کا بیان بیان سے باہر ہے۔ کچھ میرے ہی ساتھ یہ اخلاق نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ لوگ با اخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔[4]

عزت افزائیاں

سی ایس آئی کے خطاب کا حصول

حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو بخطاب "کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا" معزز و ممتاز فرمایا،

★۔ ملاقاتوں کے دستور اور ان پر اٹھنے والے بھاری خرچ کے متعلق سرسید اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"اس وقت میرے پاس تیس چٹھیاں ملاقات کی اور دس پندرہ ٹکٹ رکھے ہیں اور یہ سب امرا اور لارڈ اور سر ہیں۔ صرف خرچ سواری کے ڈر کے مارے کہیں نہیں گیا اور نہ خیال کر سکتا ہوں کہ کیونکر سب سے ملوں گا۔ جو لوگ کہ میرے گھر پر آجاتے ہیں لاچار ان کے ہاں یا جس کے پاس نہایت ضرور جانا چاہئے وہاں جاتا ہوں۔ سو اب تک سوائے ایک دفعہ کے دوسری دفعہ کی نوبت نہیں پہنچی۔ ایک آدمی ڈیڑھ سو روپیہ مہینے میں یہاں بخوبی بآرام گزر کر سکتا ہے، اِلا جب کہ آنا جانا چاہے اور لوگوں سے ملے اور عزت کے ساتھ جانا آنا چاہے تو صرف سواری کا خرچ چار سو روپیہ ماہواری پڑے گا۔ کبھی ایک گھوڑا اور کبھی دو گھوڑے کی بگھی نصیب ہوگی۔ بعضے ایسے موقعے ہوتے ہیں کہ وہاں ضرور دو گھوڑوں پر جانا چاہئے۔ شب گزشتہ کو صرف محمود کی ایک انگریز نے دعوت کی تھی، دو گھنٹے ان کو وہاں لگے اور ایسے سڑل گاڑی اکہ میں وہاں گئے تھے جیسے بنارس میں دو دو تین تین آنہ کرایہ کے اکے ہوتے ہیں۔ سات شلنگ یعنی سات روپیہ آٹھ آنے خرچ ہوئے۔ اب موافق یہاں کی رسم کے دوسرے یا تیسرے دن صاحب خانہ سے ضرور ملنے جانا چاہئے اس قدر روپیہ پھر خرچ ہوگا" (خطوطِ سرسید، ص 36-37)

اب میں احباب کی دعا سے "سید احمد خان بہادر سی ایس آئی" ہو گیا۔①★

۶ اگست ۱۸۶۹ء بروز جمعہ میں کمپینین آف دی سٹار آف انڈیا" کے خطاب کا تمغہ حاصل کرنے کے لئے انڈیا آفس گیا۔ تمغہ وصول کرنے والے اَور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ وزیر ہند عزت مآب ڈیوک آف آرگائل کے سیکرٹری مسٹر (بعدازاں سر) جان ڈبلیو کے نے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے ہم سب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ہر ایک سے مہربانی اور مبارکبادی کے الفاظ استعمال کئے۔ کچھ وقفے کے بعد عزت مآب کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر بنتھال اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں ہم سب جمع تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنے ہمراہ ملحقہ کمرے میں آنے کے لئے کہا۔ وہاں جناب عالی ڈیوک صاحب بہادر میری آمد کے منتظر تھے۔ وہ وہاں تقریب کے ماحول سے بے نیاز تشریف فرما تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر میرا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا' مصافحہ کیا اور اپنے فرزند مارکوئس آف لارن سے' جو اس موقع پر موجود تھے' تعارف کروایا۔ انہوں نے چند منٹ میرے ساتھ نہایت مہربانی کے ساتھ گفتگو فرمائی اور میرے بیٹوں بخصوص ان کی تعلیم اور مطالعہ کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے میرے ساتھ انگریزی میں باتیں کیں اور' جہاں تک ہو سکا' میں نے بھی اسی زبان میں جواب دیئے۔ مجھے صرف اس قدر افسوس ہے کہ میں اتنی صحیح اور فراوانی کے ساتھ' جس قدر کہ میری خواہش تھی' نہ بول سکتا تھا۔ تب عزت مآب نے مجھے سٹار کے ساتھ ملکہ کا دستخط شدہ شاہی فرمان بھی عطا کیا جس میں مجھے "کمپینین آف دی موسٹ ایگزالٹڈ آرڈر آف دی سٹار آف انڈیا" مقرر کیا گیا تھا' اور اس عظیم امتیاز کے حصول پر مبارکباد دینے کے بعد واپس جانے کی اجازت دی۔ تمغہ وصول کرنے والے دیگر اصحاب کو بھی اسی طرح بلا کر سٹار عطا کیا گیا۔ پھر ہم سب کو جناب عالی ڈیوک صاحب بہادر کے ساتھ ظہرانے میں شریک ہونے کے لئے کہا گیا' اور ہم ایک واقعی شاندار ضیافت میں شامل ہوئے جہاں جناب عالی ڈیوک صاحب بہادر میز کے سرے پر تشریف فرما تھے۔ میں ان کے ارشاد کے بموجب ان کی بائیں جانب بیٹھا۔ بہت سے ذی اثر حضرات' پارلیمنٹ کے ممبر اور دیگر اصحاب بھی وہاں موجود تھے۔ ان میں سر بارٹل فریئر بھی شامل تھے جن سے میری پہلے ہی ملاقات اور طویل بات چیت ہو چکی تھی۔ ضیافت کے بعد جناب عالی ڈیوک

★ حالی لکھتے ہیں: "اس کی تحریک لارڈ لارنس نے کی تھی۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 157) اس سلسلہ میں سر سید نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا "لارڈ لارنس گورنر جنرل بہادر نے میرے لئے ایک جلسہ منعقد کیا ہے اور ۶ سے ۷ سے روز سالار جنگ ان کو ملاقات کے لئے بلوایا ہے۔" (خطوط سر سید' ص 33)

صاحب بہادر وہاں سب افراد سے معانقہ کر کے واپس ہوئے مگر باقی ہم تمام میز پر پھل وغیرہ کھانے کے لئے بیٹھے رہے اور کچھ دیر تک باتوں میں مصروف رہے۔[1]

دربار ملکہ معظمہ میں حاضری

دربار ملکہ معظمہ کی حاضری کے لئے مجھ سے کہا گیا۔[2]

لوی کے محل میں مجھ کو اور درباریوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ جب ملکہ معظمہ تشریف لائیں تو میں نے بھی مثل تمام درباریوں کے اپنے نمبر پر سامنے جاکر سلام کیا۔ سلام کرنے کا دستور یہ ہے کہ ملکہ معظمہ سے ہاتھ ملا کر اور بایاں گھٹنا ٹیک کر حضور ممدوحہ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ جب تک تمام درباریوں کا اس طرح سلام نہیں ہولیتا اس وقت تک ملکہ کھڑی رہتی ہیں۔[3]

ایتھی نیم کلب کی رکنیت

رکنیت کی شرائط

لندن میں یہ ایک نہایت نامی اور معزز کلب ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ معزز کوئی کلب نہیں ہے۔ اس کلب میں جو کوئی ممبر ہوتا ہے اس کے دوست اس کو مبارک باد کی چٹھیاں لکھتے ہیں اور اس کو ایسا فخر ہوتا ہے کہ ویسا فخر کسی خطاب کے ملنے سے بھی نہیں ہوتا۔ اگر ہماری یاد میں غلطی نہ ہو تو اس کلب میں یہ قاعدہ ہے کہ کوئی شخص جو صاحبِ تصنیف نہ ہو یا اور کسی کمال میں مشہور نہ ہو وہ اس کلب کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی قاعدہ ٹھہرایا ہے کہ اس کلب میں بارہ سو ممبر سے زیادہ نہ ہوں گے۔[4]

سینکڑوں آدمیوں کی درخواستیں ممبر ہونے کے لئے آتی ہیں کہ بروقت خالی ہونے کسی ممبری کے ان کا تقرر ہو اور ان کا نام بطور امیدواران ایک رجسٹر میں مندرج ہوتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں جب ہم لندن میں تھے، تین ہزار سے زیادہ امیدواروں کا نام رجسٹر میں مندرج تھا اور دس دس بارہ بارہ برس امیدواری پر گزر گئے تھے۔ دوامی ممبروں کے سوا، جن کی تعداد بارہ سو سے زیادہ نہیں ہو سکتی، کوئی نامی اور مشہور شخص کسی میعاد معین کے لئے آنریری ممبر ہو سکتا ہے۔ ہم کو دو دفعہ اس کلب کے آنریری ممبر مقرر ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ پہلے تقرر کی میعاد گزر جانے کے بعد دوسری دفعہ پھر تقرر ہوا اور جب تک ہم لندن میں رہے اس معزز کلب کے آنریری ممبر تھے۔[5]

ڈائننگ ہال میں پُرلطف دعوت

کھانے کے کمرے میں نہایت عمدہ انتظام ہوتا ہے۔ اس میں ممبروں کو اختیار ہے کہ تنہا کھائیں یا چند ممبر، جو آپس میں نہایت دوست ہیں 'ایک میز پر کھائیں.......... ہم بھی اس کمرے میں چند دفعہ گئے ہیں مگر ایک رات، جب کہ ہمارے دوست ایڈورڈ ٹامسن صاحب نے بلایا تھا، نہایت لطف تھا۔ قریب پندرہ سولہ آدمیوں کے ایک میز پر تھے اور اس میز پر تین شخص ایشیا کے رہنے والے تھے۔ ایک میں 'ایک حاجی محمد حسین خان سفیر شاہ ایران اور ایک منشی صاحب جن کا نام اس وقت یاد نہیں ہے اور مدرسۃ العالیہ روس کے مدرس اول زبان فارسی کے تھے اور اس زمانے میں سینٹ پیٹرزبرگ (پیٹروگراڈ) سے لندن کی سیر کو آئے تھے۔ نہایت لطف سے وہ کھانا ہوا جس میں سوائے میرے اور سب لوگ نہایت عالم و فاضل و نامی و گرامی اور ایک نہ ایک فن میں مشہور و کامل تھے۔[11]

لائبریری کے کمرے میں ڈین اسٹینلے سے ملاقات

یہ کمرہ در حقیقت تصویر کا عالم ہے بات کرنی یا آواز دینی تو در کنار، کھانسنا بھی نامناسب خیال کیا جاتا ہے.......... بڑے بڑے عالم، دانش مند اپنی فکر اور اپنے علم اور اپنی تحقیقات کا نتیجہ قلم کی زبان سے اس مقام پر دنیا کی اطلاع کے لئے ظاہر کرتے ہیں۔ اسی کمرے میں ہم نے ڈین اسٹینلے کو دیکھا.......... وہ کسی امر کی تحریر میں مشغول و مستغرق تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے بے انتہا مہربانی ہم پر یہ کی کہ کرسی پر سے اٹھ کر ہم سے ہاتھ ملایا اور پھر چپکے بیٹھ گئے۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ ہم خاموش ایک کونے میں کھڑے ہو گئے اور چپکے ان عالموں کو دیکھا کئے جو اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آتی تھی اور عقل متحیر ہوتی تھی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔[12]

کلفٹن اور برسٹل کی سیر

سابق کمشنر آگرہ سے ملاقات کے لئے برسٹل میں آمد

بسبب ایک خاص ضرورت کے ہم کو کلفٹن اور برسٹل جانے کا اتفاق ہوا جس کا حال اب ہم بیان کرتے ہیں۔ ہمارے نہایت شفیق اور عزیز دوست جان ہالیٹ ٹن صاحب بہادر، سابق کمشنر آگرہ.......... چند ہفتے کے لئے کلفٹن میں، جو برسٹل کے پاس ہے تشریف لائے تھے۔ ہم مارچ ۱۸۷۰ء کو ساڑھے دس بجے دن کے ان سے ملنے کے لئے یہاں سے روانہ ہوئے۔ پیڈنگٹن

ریلوے اسٹیشن پر جاکر ٹکٹ لئے اور روانہ ہوئے .... ہم ساڑھے تین بجے برسٹل کے اسٹیشن پر پہنچے اور وہاں سے کیب کرایہ کر کے کلفٹن کے ہوٹل میں اترے۔ اگرچہ جناب بٹن صاحب نے ہم کو لکھا تھا کہ تمہارے لئے اسی مکان میں' جس میں مَیں رہتا ہوں' میں نے تین بیڈ روم درست کر لئے ہیں مگر ہم نے ان کو لکھا تھا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں کیونکہ آپ بھی وہاں مسافر ہیں اور ہوٹل میں بہت زیادہ آرام سے رہنا مقصود ہے۔[1]

کلفٹن ہوٹل کی خصوصیت

جب کہ ہم کلفٹن ہوٹل پر اترے تو ہم کو معلوم ہوا کہ جناب مسٹر بٹن صاحب ہم سے چند گھنٹے پہلے ہوٹل میں تشریف لائے تھے اور ہمارے لئے کمرے پسند کر گئے ہیں' چنانچہ ہم ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہاں کے منیجر نے تین بیڈ روم' جو نہایت آراستہ تھے' اور ایک ڈرائنگ روم یعنی بیٹھنے کا کمرہ' جو نہایت صفائی اور خوبی سے آراستہ تھا' نفیس نفیس کرسیاں اور میزیں اور قد آور آئینے اور جھاڑ گیس کی روشنی کے لگے ہوئے تھے' اترنے کو بتا دیا۔ جس خوبی اور خوش سلیقگی اور انتظام اور صفائی سے وہ مسافروں کی سرائے آراستہ تھی ہندوستان کے کسی نواب صاحب یا راجہ صاحب کے ابا اس و دربار کا بھی مکان آراستہ نہیں دیکھا........... ہوٹل کے منیجر نے ایک خاص نوکر ہمارے کھانا کھلانے وغیرہ کاروبار کو متعین کیا۔ اگرچہ وہ خدمت گار تھا مگر میں سچے دل سے کہتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ سویلائزڈ (مہذب و شائستہ) تھا اس کا ادب اور لیاقت نہایت عمدہ تھی۔[2]

بٹن صاحب کے ساتھ ڈنر

چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ بٹن صاحب ہوٹل میں تشریف لائے' ان کو ہمارے ملنے اور ہم کو ان کے ملنے سے ایسی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ بٹن صاحب حامد محمود کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی بات چیت کر کے اٹھے اور کہا کہ رات کو ڈنر ہمارے ساتھ ہو گا اور مسز بٹن تم سے ملنے میں نہایت خوش ہوں گی۔ رات کو ہم تینوں آدمی بٹن صاحب کے ہاں گئے اور حقیقت میں میم صاحبہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے کہا کہ آپ بتائیے' ان میں سے حامد کون ہے اور محمود کون؟ مگر انہوں نے دونوں کو بخوبی پہچان لیا اگرچہ انہوں نے ان کو چھوٹی عمر میں دیکھا تھا۔ ہم سب نے وہاں نہایت خوشی سے کھانا کھایا اور گیارہ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ سائنٹیفک سوسائٹی کا اور اس کے آنریری سیکرٹری راجہ جے کشن داس بہادر کا بہت حال پوچھتے رہے۔ میں نے سب حال کہا اور یہ بھی کہا کہ راجہ صاحب کو

سیکریٹری کستان کی حق تلفی ہے بلکہ ان کو سونٹر آف دی سوسائٹی کہنا چاہئے۔ ان سب باتوں کے بعد ہم ہوٹل میں چلے آئے اور سو رہے۔[1]

سر ایڈورڈ اسٹریچی کے ساتھ چائے نوشی

برسٹل میں سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ دوسری مارچ کو ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب ان کی ملاقات کے لئے ڈاکٹر اسمنڈ صاحب کے گھر، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، گئے۔ لیڈی اسٹریچی اور سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب نہایت مہربانی سے پیش آئے اور جناب مسز بٹن صاحب اور جناب آنریبل جان اسٹریچی صاحب کے سبب سے انہوں نے ہم پر ایسی مہربانی فرمائی جیسی کوئی قدیم ملاقاتی سے کرتا ہے.......... لیڈی صاحبہ نے ہم سب کو چائے پلائی اور بہت دیر تک ہر طرح کی خوشی و فرحت آمیز باتیں ہوتی رہیں۔[2]

جنرل سر ابراہیم رابرٹس کے ساتھ ملاقات

اس کے بعد ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب اور ان کی میم صاحبہ رخصت ہو کر کنارہ پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے جنرل سر ابراہیم رابرٹس صاحب کے سی بی کے گھر ان سے اور لیڈی رابرٹس سے یعنی ان کی میم صاحبہ سے ملنے کو آئے............ وہ دونوں ایسی مہربانی سے پیش آئے جس کا بیان نہیں ہو سکتا، اور جنرل صاحب تو ہم لوگوں کو دیکھ کر ایسے خوش ہوئے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان جنرل صاحب کو تمام ہندوستان بسبب ان محاربات کے جو اُن سے کابل اور غزنین کی لڑائیوں میں ہوئے ہیں، بخوبی جانتا ہو گا........... اردو زبان مطلق نہیں بھولے، نہایت صاف اردو میں بلکہ بعض بعض دفعہ فارسی لفظوں میں بات چیت کرتے تھے۔ رخصت ہوتے وقت لیڈی صاحبہ نے ہم سے فرمایا کہ کل بعد دوپہر کی چائے ہمارے ساتھ پینا۔ ہم سب نے نہایت شکر کیا اور رخصت ہوئے۔ رات کو پھر بدستور ڈنر مسٹر بٹن کے ہاں کھایا اور ہندوستان کے، انگلستان کے اور اَور بہت سے ذکر اذکار نہایت خوشی سے رہے۔[3]

مزید میل ملاقات اور سیر و تفریح

تیسری مارچ کو جناب سر ایڈورڈ اسٹریچی اور جناب بٹن صاحب گیارہ بجے ہوٹل میں ہم سے ملنے کو تشریف لائے اور ایسی عنایت و اشفاق سے سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب ملے کہ مجھ کو بے اختیار ان کی صورت سے اور ان کے اشفاق و عنایت سے آنریبل جان اسٹریچی صاحب یاد آتے تھے...... ایک بجے ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب اور ان کی میم صاحبہ ایک گاڑی میں

سوار ہو کر سر ولیم میلز کے مکان ورمنہ کی سیر کو گئے .... وہاں سے مراجعت کر کے جنرل صاحب کے ہاں آئے اور چائے پی اور پٹھانوں کی تصویریں دیکھیں اور خوب باتیں ادھر ادھر کی کیں اور ان سے اور لیڈی صاحبہ سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ رات کو پھر بدستور جناب مسٹر بٹن صاحب کے ساتھ ڈنر کھایا اور گیارہ بجے تک جلسہ رہا۔[7]

لندن میں واپسی

چوتھی مارچ کو گیارہ بجے ہم تینوں شخص جناب بٹن صاحب کے گھر گئے اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھے رہے' اور ان سے اور جناب میم صاحبہ سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن پر آئے اور قریب پانچ بجے کے لندن میں آپہنچے۔[8]

کلفٹن کی ایک حیران کن رصد گاہ

وہاں ایک رصد گاہ مسٹر وسٹ کی ملکیت ہے۔ چند دوربینیں پرانی' سڑیل' خراب اور چند اور آلے رکھے ہوئے ہیں اور سب چیز نہایت خراب اور بے مرمت ہے۔ اس کی چھت پر ایک کمرہ بنا ہوا ہے اور اس کی چھت کے بیچوں بیچ میں ایک شیشہ لگا ہوا ہے جو چاروں طرف پھرتا ہے۔ جس طرف اس کو پھیر دیتے ہیں اس طرف کے تمام مکانات اور دریا اور جنگل اور درخت اور آدمیوں کی تصویر کمرے میں آکر بن جاتی ہے اور تمام آدمی چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں' یہاں تک کہ پہچانے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اتفاقاً اس شیشے کو جو ایک طرف پھیرا اس طرف ایک سڑک پر ایک شخص اسکاچ چلا جاتا تھا جس کو ہم جانتے تھے۔ بمجرد اس کی تصویر کمرے میں آنے کے ہم نے پہچان لیا کہ فلاں شخص چلا جاتا ہے۔ اسی کے پاس ایک اور چھوٹا کمرہ ہے اس میں جو شیشہ ہے وہ حرکت نہیں کرتا مگر بڑی تصویر اور مفصل دکھاتا ہے۔ آدمی کی تصویر تخمیناً دو فٹ کی دکھائی دیتی ہے۔ کمرے کے باہر جو شخص اس شیشے کے مقابل میں جا کھڑا ہو یا لوگ' جو راستہ چلتے ہیں' اس شیشے کے مقابلے میں آجاتے ہیں ان کی تصویر کمرے میں بن جاتی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ بدن کا اور کپڑوں کا رنگ بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اصلی کا۔[9]

برسٹل کی کھوہ کا حال

برسٹل ...... جو ایک خوبصورت شہر ہے' اس کے قریب سمندر کی کھاری کے کنارے پر ایک چھوٹا سا پہاڑ کا ٹیبہ ہے۔ اس میں ایک کھوہ ہے جس میں کسی اگلے زمانہ میں کوئی ہرمٹ یعنی عیسائی درویش رہتا تھا۔ میں اس کھوہ کو دیکھنے گیا۔ غالباً وہ کچھ بہت بڑی نہ تھی۔ کئی سوفٹ کی لمبی ہوگی مگر ایسی تنگ و تاریک تھی کہ کوئی چیز یہاں تک کہ پاس کا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو

سیکرٹری کمشان کی حق تلفی ہے بلکہ ان کو سیونٹز آف دی سوسائٹی کہنا چاہئے۔ ان سب باتوں کے بعد ہم ہوٹل میں چلے آئے اور سو رہے۔[۱]

سر ایڈورڈ اسٹریچی کے ساتھ چائے نوشی

برسٹل میں سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ دوسری مارچ کو ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب ان کی ملاقات کے لئے ڈاکٹر اسمنڈ صاحب کے گھر، جہاں وہ ٹھہرے ہوئے تھے، گئے۔ لیڈی اسٹریچی اور سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب نہایت مہربانی سے پیش آئے اور جناب مسٹر بٹن صاحب اور جناب آنریبل جان اسٹریچی صاحب کے سبب سے انہوں نے ہم پر ایسی مہربانی فرمائی جیسی کوئی قدیم ملاقاتی سے کرتا ہے.......... لیڈی صاحبہ نے ہم سب کو چائے پلائی اور بہت دیر تک ہر طرح کی خوشی و فرحت آمیز باتیں ہوتی رہیں۔[۲]

جنرل سر ابراہیم رابرٹس کے ساتھ ملاقات

اس کے بعد ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب اور ان کی میم صاحبہ رخصت ہو کر کنارہ پہاڑ کی سیر کرتے ہوئے جنرل سر ابراہیم رابرٹس صاحب کے سی بی کے گھر ان سے اور لیڈی رابرٹس سے یعنی ان کی میم صاحبہ سے ملنے کو آئے.......... وہ دونوں ایسی مہربانی سے پیش آئے جس کا بیان نہیں ہو سکتا، اور جنرل صاحب تو ہم لوگوں کو دیکھ کر ایسے خوش ہوئے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان جنرل صاحب کو تمام ہندوستان بسبب ان محاربات کے جو اُن سے کابل اور غزنین کی لڑائیوں میں ہوئے ہیں، بخوبی جانتا ہو گا.......... اردو زبان مطلق نہیں بھولے، نہایت صاف اردو میں بلکہ بعض بعض دفعہ فارسی لفظوں میں بات چیت کرتے تھے۔ رخصت ہوتے وقت لیڈی صاحبہ نے ہم سے فرمایا کہ کل بعد دوپہر کی چائے ہمارے ساتھ پینا۔ ہم سب نے نہایت شکر کیا اور رخصت ہوئے۔ رات کو پھر بدستور ڈنر مسٹر بٹن کے ہاں کھایا اور ہندوستان کے، انگلستان کے اور اُور بہت سے ذکر اذکار نہایت خوشی سے رہے۔[۳]

مزید میل ملاقات اور سیر و تفریح

تیسری مارچ کو جناب سر ایڈورڈ اسٹریچی اور جناب بٹن صاحب گیارہ بجے ہوٹل میں ہم سے ملنے کو تشریف لائے اور ایسی عنایت و اشفاق سے سر ایڈورڈ اسٹریچی صاحب ملے کہ مجھ کو بے اختیار ان کی صورت سے اور ان کے اشفاق و عنایت سے آنریبل جان اسٹریچی صاحب یاد آتے تھے.......... ایک بجے ہم تینوں شخص اور جناب بٹن صاحب اور ان کی میم صاحبہ ایک گاڑی میں

سوار ہو کر سر ولیم میلز کے مکان ورمنہ کی سیر کو گئے ...... وہاں سے مراجعت کر کے جنرل صاحب کے ہاں آئے اور چائے پی اور پٹھانوں کی تصویریں دیکھیں اور خوب باتیں ادھر ادھر کی کیں اور ان سے اور لیڈی صاحبہ سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ رات کو پھر بدستور جناب مسٹر بٹن صاحب کے ساتھ ڈنر کھایا اور گیارہ بجے تک جلسہ رہا۔[1]

لندن میں واپسی

چوتھی مارچ کو گیارہ بجے ہم تینوں شخص جناب بٹن صاحب کے گھر گئے اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھے رہے' اور ان سے اور جناب میم صاحبہ سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن پر آئے اور قریب پانچ بجے کے لندن میں آ پہنچے۔[2]

کلفٹن کی ایک حیران کن رصد گاہ

وہاں ایک رصد گاہ مسٹر وسٹ کی ملکیت ہے۔ چند دوربینیں پرانی' سڑیل' خراب اور چند اور آلے رکھے ہوئے ہیں اور سب چیز نہایت خراب اور بے مرمت ہے۔ اس کی چھت پر ایک کمرہ بنا ہوا ہے اور اس کی چھت کے بیچوں بیچ میں ایک شیشہ لگا ہوا ہے جو چاروں طرف پھرتا ہے۔ جس طرف اس کو پھیر دیتے ہیں اس طرف کے تمام مکانات اور دریا اور جنگل اور درخت اور آدمیوں کی تصویر کمرے میں آ کر بن جاتی ہے اور تمام آدمی چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں' یہاں تک کہ پہچانے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اتفاقاً اس شیشے کو جو ایک طرف پھیرا اس طرف ایک سڑک پر ایک شخص اسکاچ چلا جاتا تھا جس کو ہم جانتے تھے۔ بمجرد اس کی تصویر کمرے میں آنے کے ہم نے پہچان لیا کہ فلاں شخص چلا جاتا ہے۔ اسی کے پاس ایک اور چھوٹا کمرہ ہے اس میں جو شیشہ ہے وہ حرکت نہیں کرتا مگر بڑی تصویر اور مفصل دکھاتا ہے۔ آدمی کی تصویر تخمیناً دو فٹ کی دکھائی دیتی ہے۔ کمرے کے باہر جو شخص اس شیشے کے مقابل میں جا کھڑا ہو یا لوگ' جو راستہ چلتے ہیں' اس شیشے کے مقابلے میں آ جاتے ہیں ان کی تصویر کمرے میں بن جاتی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ بدن کا اور کپڑوں کا رنگ بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسا اصلی کا۔[1]

برسٹل کی کھوہ کا حال

برسٹل ...... جو ایک خوبصورت شہر ہے' اس کے قریب سمندر کی کھاری کے کنارے پر ایک چھوٹا سا پہاڑ کا ٹیلہ ہے۔ اس میں ایک کھوہ ہے جس میں کسی اگلے زمانہ میں کوئی ہرمٹ یعنی عیسائی درویش رہتا تھا۔ میں اس کھوہ کو دیکھنے گیا۔ غالباً وہ کچھ بہت بڑی نہ تھی۔ کئی سو فٹ کی لمبی ہو گی مگر ایسی تنگ و تاریک تھی کہ کوئی چیز یہاں تک کہ پاس کا آدمی بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو

شخص اس کے دکھلانے کو ہمارے ساتھ تھا' مہربانی سے روشنی لایا کہ ہم روشنی کے ذریعہ سے اس میں جائیں۔ قریباً نصف راستہ ہم نے طے کیا ہوگا کہ اس زور سے اور عجیب نفرت انگریز آواز سے ہوا آنی شروع ہوئی جس نے ہم کو پریشان کر دیا اور جو روشنی ہمارے ساتھ تھی وہ گل ہو گئی۔ ہم آگے نہ گئے اور واپس چلے آئے۔ معلوم ہوا کہ اس کھوہ میں سمندر کی جانب کوئی سوراخ یا موکھا ہے' اس میں سے یہ شدید ہوا آتی ہے۔ جو شخص ہمارے ساتھ تھا اس نے بیان کیا کہ تھوڑی دور آگے قریباً دو ڈھائی گز چوڑی ایک جگہ ہے' اس میں ہر مست رہتا تھا۔(۱)

کیمبرج کی سیر

دل پر رُعب اور حیرت کی کیفیت

ایک روز میں اپنے لڑکے سید محمد محمود اور اپنے دوست سید عبداللہ پروفیسر کے ساتھ ریل پر سوار ہو کر کیمبرج کو گیا۔ جب کبھی میں اپنے وطن یعنی ہندوستان کے کسی علمی جلسہ کی سیر کے واسطے جاتا تھا تو ہمیشہ میرا نہایت جی لگتا تھا۔ پس جب میں اس موقع پر کیمبرج کے قریب پہنچا جو علوم و فنون کا مصدر ہے تو اس کی قدامت اور اس عالم گیر شہرت کے لحاظ سے' جو اس شہر کو بہت سے ایسے مشہور و معروف آدمیوں کی بدولت حاصل ہوئی تھی جن کی عقل و دانش اور کوششوں کے سبب سے تمام دنیا میں علم کی روشنی پھیلی ہے اور اس کی شعاعوں سے جہالت اور غلطی اور تعصب کی تاریکی رفع ہوئی ہے' میرے دل پر ایک رعب اور حیرت کی سی حالت طاری ہوئی۔(۲)

پروفیسر علم ہیئت کی علم نوازی

اگر میں اس موقع پر نہایت سرگرمی کے ساتھ ان عنایتوں اور مہربانیوں کا شکریہ ادا نہ کروں جو صاحب پروفیسر علم ہیئت نے ہم لوگوں کے حال پر فرمائیں تو یہ بڑی ناشکری اور احسان فراموشی ہے۔ صاحب موصوف نے صرف علم ہیئت کی نسبت' جو حقیقت میں ایک نہایت عالی اور دقیق علم ہے' نہایت خوشی سے دلچسپ اور مفید باتوں ہی سے ہم کو مطلع نہیں کیا بلکہ ستاروں اور سیاروں کی بھی سیر کرائی۔(۳)

وطن کے لئے دعا

کیمبرج کی یونیورسٹی کی سیر سے جو اس قدر دانش مندی اور فیاضی اور جاں فشانی اور محنت کے ثبوت میری نظر سے گزرے ان کے دیکھنے سے مجھ کو نہایت حیرت ہوئی اور میں نے اپنے دل میں بہ آرزوئے تمام یہ دعا مانگی کہ میرے وطن ہندوستان میں جو ہندوستانیوں کی طبیعتوں میں ہنوز

ہم سری اور ترقی کا جوش نہیں ہے وہ بہت جلد برانگیختہ ہو تا کہ اس کو بھی آئندہ کسی زمانہ میں 'جو نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہنوز بہت دور ہے 'علوم و فنون میں مشرقی ملکوں میں ایسی ہی شہرت اور عظمت حاصل ہو جیسے کہ انگلستان کو مغربی ملکوں میں حاصل ہے۔[۱]

تاثرات سفر انگلستان

مصروفیات اور مشاہدات

سیر کا تو مختصر یہ حال ہے کہ یہاں وہ چیزیں اور وہ کارخانے اور وہ صنائع اور وہ عمارات اور ایسی عجائبات ہیں کہ "لا عین رأت و اذن سمعت"۔ امکان نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کو نہیں دیکھا ان کے سامنے بیان ہو سکیں اور وہ سمجھ سکیں۔[۲]

.... اگرچہ بسبب تنگی روپیہ کے بہت سی چیزوں کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا مگر بہ ایں ہمہ کچھ نہ کچھ دیکھا۔ لارڈ اور ڈیوک کی مجلسوں میں بھی گیا' ان کے ہاں بڑے بڑے کھانوں اور مجلسوں میں بھی شریک ہوا' ان سے کم درجے کے بعض آدمیوں سے بھی اسی طرح ملا۔ متوسط درجہ کے بھی رئیسوں اور اشراف سے 'جو گویا ہمارے ہمجولی یعنی ہمارے سے درجہ اور رتبہ کے سے تھے' دوستانہ ملا اور کھانوں اور مجلسوں میں بھی شریک ہوا۔ ہر موقع پر لیڈیوں اور اشراف اور قابل تربیت یافتہ عورتوں کو بھی دیکھا۔ یہاں کے امیروں اور متوسط درجہ کے بھلے مانسوں اور غریب اشرافوں بلکہ بعض نہایت کم درجہ کے لوگوں کے گھروں کو اور ان کے رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طریق کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے سوداگروں کے کارخانے اور متوسط درجہ کے سوداگروں کی دکانیں اور ان کے اسباب رکھنے اور سودا بیچنے اور خریدار کے ساتھ پیش آنے اور گفتگو کرنے کے طریق کو بھی دیکھا۔ یہاں کے کاریگروں اور قلیوں کو بھی دیکھا' بڑے بڑے عالی شان مکانات اور میوزیم بھی دیکھے۔ انجینئروں کے کارخانے اور جہاز بننے کا کارخانہ 'توپوں کے بننے کا کارخانہ 'تار برقی کا کارخانہ جو سمندر میں ڈالا جاتا ہے اور ایک دنیا کو دوسری دنیا سے ملا دیتا ہے' جنگی جہاز (جن میں سے ایک جہاز پر کئی میل سفر بھی کیا) اور گریٹ ایسٹرن کو دیکھا۔ بعض سوسائٹیوں کی میٹنگ میں بھی شریک ہوا' بعض کلبوں کے جلسوں اور کھانوں میں بھی شریک ہوا۔[۳]

انگریز لائق خوبصورت 'ہندوستانی میلے کچیلے وحشی جانور

ان سب باتوں کا جو نتیجہ حاصل ہوا وہ یہ ہوا کہ ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو ایک نہایت

بداخلاقی کا ملزم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی میں اس الزام سے ان کو بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں' یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں بلکہ در حقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔ میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک' امیر سے لے کر غریب تک' سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک' عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے' جیسی نہایت لائق خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔(۱)

یقین جانئے کہ ہندوستان میں جس طرح انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ پیش آتے ہیں صرف وہ پولیٹیکل پالیسی گورنمنٹ سے مجبور ہیں جو ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ ملنا اور ان کی خاطرداری کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو' اور فرض کرو کہ ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں اکٹھے بسائے جائیں اور بالفعل جو عادتیں اور طرزِ زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے وہ ویسی ہی رہے اور جو انگریزوں کی ہے وہ ویسی ہی رہے' تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی نہ کھڑے ہوں اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں(۱) ★

دینی و دُنیوی خوبیوں کا حامل ملک

تمام خوبیاں دینی و دُنیوی' جو انسان میں ہونی چاہئیں' وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ حق سمجھتے ہیں ایسی خوبصورتی اور عمدگی سے اس کے تمام متعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے

★ حالی لکھتے ہیں: "یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھنا شروع ہوا تھا مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صداؤں سے زیادہ آشنا نہ تھے اس لئے انہوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 154)

اس بارے میں سرسید سیکرٹری سائنٹیفک سوسائٹی کے نام اپنے ایک مراسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

"میں نے سنا تھا کہ آپ کی سوسائٹی کے بعض ممبر میری آزادانہ تحریر کو ناپسند کرتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کیفیت اس سفر کی میرے دل پر گزرتی ہے اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں اور جس گناہ کا الزام میں اپنے ہم وطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں خود بھی اسی گناہ کا مرتکب ہوں' اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا ہی موقوف کر دیا جائے۔" (مکاتیب سرسید احمد خاں' ص 15)

ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتے۔①

کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں ہے کہ مسلمان اس کو اپنے خاطر خواہ نہ کر سکے یہاں تک کہ ایک شیعہ جو مشرک کو نجس حقیقی جانتا ہے' وہ بھی اپنے مذہب کے موافق رہ سکتا ہے مگر کسی قدر اہتمام و تردد سے۔ ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ بعضے امور بلا تکلف اور بعض امور بہ تکلف انجام پاتے ہیں۔②

میں سمجھتا ہوں کہ لندن کی شائستگی مسٹر ہمنز کے زمانہ سے اب ترقی پر ہے۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص مسمی ڈاکٹر پریکیٹ نے عین لندن میں ایک مکان لیا تھا اور ہر اتوار کو اس مکان میں بر خلاف مذہب عیسائی کے لیکچر دیا کرتا تھا' اور جو لوگ چاہتے تھے وہاں جا کر اس کا لیکچر سنتے تھے۔ میں بھی کئی دفعہ اس کا لیکچر سننے گیا تھا اور ایک دفعہ اس نے قرآن اور اسلام پر بھی لیکچر دیا تھا۔ اچھا لیکچر تھا مگر جو عام غلطیاں قرآن اور اسلام کی نسبت انگریزوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس کے لیکچر میں بھی تھیں۔ میں نے سنا کہ پادریوں نے اس کا لیکچر بند کرنے میں بڑی کوشش کی مگر پارلیمنٹ سے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔①

عاقل و عیاش لوگوں کی جنت

عاقل و عیاش آدمی کے لئے جو خوشی اور نعمت یہاں متصور ہے خدا معلوم بہشت میں بھی ہو گی یا نہیں! میرے ایک بڑے معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں' جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے ہوئے کئی سو مرد و میم اور لیڈی نہایت خوبصورت و خوش کلام اور قابل جمع تھیں' پوچھا کہ کہو' لندن بہشت ہے اور حوروں کو ہونا سچ ہے یا نہیں؟②

بداخلاقی کا ملزم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی میں اس الزام سے ان کو بری نہیں کرتا) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں' یہ ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں بلکہ در حقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔ میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک' امیر سے لے کر غریب تک' سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک' عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں در حقیقت ایسی ہی نسبت ہے' جیسی نہایت لائق خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔①

یقین جانئے کہ ہندوستان میں جس طرح انگریز ہندوستانیوں کے ساتھ پیش آتے ہیں صرف وہ پولیٹیکل پالیسی گورنمنٹ سے مجبور ہیں جو ان کو ہندوستانیوں کے ساتھ ملنا اور ان کی خاطرداری کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو' اور فرض کرو کہ ہندوستانی اور انگریز ایک آزاد ملک میں اکٹھے بسائے جائیں اور بالفعل جو عادتیں اور طرزِ زندگی اور پرائیویٹ لائف ہندوستانیوں کی ہے وہ ویسی ہی رہے اور جو انگریزوں کی ہے وہ ویسی ہی رہے' تو ہرگز انگریز ہندوستانیوں کے پاس بھی نہ کھڑے ہوں اور جانور سے زیادہ نہ سمجھیں۔② ★

دینی و دُنیوی خوبیوں کا حامل ملک

تمام خوبیاں دینی و دُنیوی' جو انسان میں ہونی چاہئیں' وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ دینی خوبیوں سے میرا مطلب یہ ہے کہ جس دین کو وہ لوگ حق سمجھتے ہیں ایسی خوبصورتی اور عمدگی سے اس کے تمام متعلقات کو پورا کرتے ہیں اور انجام دیتے

★ حالی لکھتے ہیں: "یہ سفرنامہ نہایت دلچسپ طریقہ سے لکھنا شروع ہوا تھا مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی اور سرسید کو بھی لندن ہی میں لوگوں کی مخالفت کا حال معلوم ہوا۔ ابھی حضرت کے کان ایسی مخالف صداؤں سے زیادہ آشنا نہ تھے اس لئے انہوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول ص 154)

اس بارے میں سرسید سیکرٹری سائنٹیفک سوسائٹی کے نام اپنے ایک مراسلہ میں تحریر کرتے ہیں:

"میں نے سنا تھا کہ آپ کی سوسائٹی کے بعض ممبر میری آزادانہ تحریر کو ناپسند کرتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کیفیت اس سفر کی میرے دل پر گزرتی ہے اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں اور جس گناہ کا الزام میں اپنے ہم وطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں خود بھی اسی گناہ کا مرتکب ہوں' اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا ہی موقوف کر دیا جائے۔" (مکاتیبِ سرسید احمد خاں' ص 15)

ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتے۔[1]

کوئی چیز مذہبی ایسی نہیں ہے کہ مسلمان اس کو اپنے خاطر خواہ نہ کر سکے یہاں تک کہ ایک شیعہ جو مشرک کو نجس حقیقی جانتا ہے' وہ بھی اپنے مذہب کے موافق رہ سکتا ہے مگر کسی قدر اہتمام و تردد سے۔ ذبیحہ مسلمان کا دستیاب ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ کوئی بات مشکل نہیں ہے۔ بعضے امور بلا تکلف اور بعض امور بہ تکلف انجام پاتے ہیں۔[2]

میں کہتا ہوں کہ لندن کی شائستگی مسٹر جمنز کے زمانہ سے اب ترقی پر ہے۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص مسمی ڈاکٹر پریکیٹ نے عین لندن میں ایک مکان لیا تھا اور ہر اتوار کو اس مکان میں برخلاف مذہب عیسائی کے لیکچر دیا کرتا تھا' اور جو لوگ چاہتے تھے وہاں جا کر اس کا لیکچر سنتے تھے۔ میں بھی کئی دفعہ اس کا لیکچر سننے گیا تھا اور ایک دفعہ اس نے قرآن اور اسلام پر بھی لیکچر دیا تھا۔ اچھا لیکچر تھا مگر جو عام غلطیاں قرآن اور اسلام کی نسبت انگریزوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس کے لیکچر میں بھی تھیں۔ میں نے سنا کہ پادریوں نے اس کا لیکچر بند کرنے میں بڑی کوشش کی مگر پارلیمنٹ سے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔[3]

عاقل و عیاش لوگوں کی جنت

عاقل و عیاش آدمی کے لئے جو خوشی اور نعمت یہاں متصور ہے خدا معلوم بہشت میں بھی ہو گی یا نہیں! میرے ایک بڑے معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں' جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے ہوئے کئی سو مرد و میم اور لیڈی نہایت خوبصورت و خوش کلام اور قابل جمع تھیں' پوچھا کہ کہو' لندن بہشت ہے اور حوروں کو ہونا یہ ہے یا نہیں؟[4]

سر سید اپنے چند رفقاء کے ساتھ

سرسید اپنے چند رفقاء کے ساتھ

تحریکِ علی گڑھ

لندن کی تجویزیں

پس منظر

میں نے اس زمانہ میں اپنی قوم کو نہایت خراب حالت میں دیکھا جن پر ٹھیک یہ مثل صادق آتی ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم — نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
گئے دونوں جہاں کے کام سے ہم — نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے (1)

قوم 'کیا دنیا کی باتوں میں اور کیا دین کے کاموں میں 'ایسے تاریک گڑھے میں پڑی تھی کہ ادھر ادھر کی چیزیں تو در کنار وہ اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا' پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا اور اپنی قوم کی حالت پر غم نہ کرتا۔ ایک مدت تک اسی غم میں پڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ کیا کیجئے۔ جو خیالی تدبیریں کرتا کوئی بن پڑتی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ جتنی امیدیں کرتا تھا سب ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کر سکو' ہو یا نہ ہو۔ اسی بات پر دل ٹھہرا' ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا (2)

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد دوم] یکم ربیع الثانی سنہ ۱۳۱۳ ہجری سنہ ۱۳۲۵ نبوی [نمبر ۷

مضمون نمبر ۲۶

مکاتبات دلچسپ

متعلق تفسیر

پانچواں خط نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب کا

بنام

عالی جناب سر سید احمد خاں بہادر دام ظلہم

بمبئی — ۳ اگست سنہ ۱۸۹۵ ع

جناب عالی - دعا کے متعلق جو عریضہ میں نے آپکی خدمت میں روانہ کیا ہی وہ صرف ایک تمہیدی مضمون ہی — جس میں میں نے اپنے خیالات بالاجمال اس مسئلہ کے متعلق ظاہر کئے ہیں - مگر جیسا کہ میں آپ کی خدمت میں عرض کرچکا ہوں اس ضروری اور مشکل مسئلہ کے ہر پہلو کو دیکھنا اور اسکے ہر مالہ و ماعلیہ سے بحث کرنا ضرور ہی - اور جو اعتراضات مذہبی یا دنیوی امور پر کئے گئے ہیں اُن پر بھی نہایت سچائی اور ایمانداری سے نظر کرنی لازم ہی - چنانچہ میں اب اسے شروع کرتا ہوں •

سب سے اول ہمکو یہہ دیکھنا ہی کہ خدا اور اُسکے رسول نے دعا کی نسبت کیا فرمایا ہی اور اُن کے پاک کلام سے اُسکی کیا حقیقت معلوم ہوتی ہی - اور اجابت دعا کے کیا معنی نکلتے ہیں — اور چونکہ تفسیر پر بحث کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا مقدم ہی کہ قرآن کی سچائی ایک تسلیم شدہ امر ہی - اس لئے آپکے بیان کئے ہوئے معیاروں کی صحت و غلطی کا معیار خود قرآن مجید سمجھا جاے — چنانچہ آپ نے بھی تفسیر پر بحث کرتے وقت اسی امر کی خواہش کی ہی — اور بلاشبہہ یہی ٹھیک اور درست ہی - چنانچہ میں اس خط میں صرف اسی بات کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید سے دعا اور اجابت دعا کے معنی کیا معلوم ہوتے ہیں اور اُسکے

"تہذیب الاخلاق" کے ایک شمارہ کا صفحہ اول

میں نے اس کی حالت موجودہ پر غور کیا اور جو آئندہ اس کی حالت ہونے والی ہے' اور جو اسباب کہ اس کے تنزل کے ہوئے ان کو تحقیق کیا' اور جہاں تک ممکن ہوا اوروں کو سمجھایا اور اس درماندہ قوم کی مدد پر یا فلاح پر کمر باندھی۔[1]

میں نے یقین کیا کہ تعلیم اور صرف تعلیم ہی ان کی خراب حالت کے درست کرنے کا علاج ہے[2] سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جائے۔[3]

...... جبکہ میں نے علی گڑھ میں کالج کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا اور اس کا ایک ایسا وسیع تعلیم گاہ بنانا تجویز کیا جس میں کافی تعداد ہماری قوم یعنی ملک کے باشندوں ہندو اور مسلمان دونوں کی گنجائش ہو اور دونوں گروہ عمدہ طور سے وہاں تعلیم اور تربیت پائیں۔ جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو میں لندن گیا۔ وہاں کے کالجوں' بورڈنگ ہاؤسوں' کیمبرج کے طلبہ کے رہنے کا حال دیکھا اور سمجھا کہ حقیقت میں جب تک اپنے ملک کے بچوں کے لئے ایسی جگہ نہ بنائیں تو تعلیم اور تربیت ناممکن ہے۔[4]

لندن ہی میں میں نے اس مدرسہ کے قائم کرنے کی اور تعلیم کی تمام تجویزوں کو پورا کیا' یہاں تک کہ جس نقشہ پر آپ اس کالج کی عمارتوں کو بنتا ہوا دیکھتے ہیں یہ بھی لندن ہی میں قرار پا چکا تھا...... ان تجویزوں کو مکمل کر کے میں نے لندن سے واپس آنے کا ارادہ کیا اور لندن ہی میں اس کام کے' جو نہایت اہم تھا' شروع کرنے کے تین طریقے قرار دئے۔

اول...... ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے عموماً خیالاتِ تعصب' جو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سائنس ولٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہبِ اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں' دور ہوں۔

دوم...... خود مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ وہ یورپین سائنسز اور لٹریچر کو کیوں نہیں پڑھتے اور اس میں ان کو کیا اندیشہ ہے۔

سوم...... کالج کے لئے چندہ شروع کیا جائے اور جس وقت موقع ہو علی گڑھ میں کالج قائم کیا جائے۔ لندن ہی میں علی گڑھ اکالج اکا مقام قرار پا چکا تھا۔[5]

تہذیب الاخلاق کا اجرا

ہندوستان میں پہنچ کر تجویز اول کے مطابق میں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا...... اس کے سرے پر جو اس کا نام اور اس کی گرد جو خوب صورت بیل چھپتی تھی وہ ٹائپ لندن

نئی شکل ہو گیا تھا اور اپنے ساتھ لایا تھا۔(۳)

قومی بھلائی کے ولولوں میں سے تہذیب الاخلاق کا نکالنا بھی ایک ولولہ تھا جس کا اصلی مقصود قوم کو اس کی دینی اور دنیاوی ابتر حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا بلکہ مردوں کو اٹھانا اور بند سڑے ہوئے پانی میں تحریک پیدا کرنا تھا۔(۴)

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۳۰۱ نبوی* اور ۱۲۸۷ ہجری 'جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا' امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جائے گا۔(۵)

جب پہلا تہذیب الاخلاق نکلا تھا اس وقت ضرورت تھی کہ قوم کو یورپین سائنس ولٹریچر کی تعلیم پر 'جس کو وہ کفر یا شرعاً حرام سمجھتے تھے' متوجہ کیا جائے اس لئے اس کے مضامین اس بات پر ہوتے تھے کہ شرعاً تعلیم یورپین سائنس و لٹریچر ممنوع نہیں ہے اور قوم کو اس کی تعلیم پر متعدد طرز سے متوجہ کیا جاتا تھا۔ پھر جو خیالات قوم میں ایسے جیٹھے ہوئے تھے جو ترقی اور تہذیب کے مانع تھے ان کو دور کیا جاتا تھا اور شرعاً اور عقلاً ان پر بحث ہوتی تھی۔(۶)

گو تہذیب الاخلاق کی بہت مخالفت ہوئی 'خاص اخبار اور پرچے اس کی مخالفت پر جاری ہوئے لیکن اس کو بڑی کامیابی ہوئی۔(۷)

بعض لوگوں نے ہمارے پرچہ کا نام "تخریب الاخلاق" اور "تخریب الافلاق" رکھا۔(۸)

کان پور و گورکھپور و مراد آباد سے ان مضامین کی تردید میں رسالے نکلے۔(۹)

ہم نے بذریعہ اپنے اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی 'مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں وہ چلی جاتی تھی اس سے خبردار کیا' دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں وہ جتلا تھی ان کو روشنی دکھلائی 'مذہب اسلام پر نادانی کی جس قدر گھٹائیں چھا رہی تھیں ان کو ہٹایا اور اس کے اصلی نور کو 'جہاں تک ہم سے ہو سکا' چمکایا...... ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سنا۔ قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا' اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا' یہی ہماری مرادیں تھیں جن کو ہم نے بھر پایا۔(۱۰)

کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان کا قیام

دوسری تجویز کے مطابق ایک کمیٹی قائم ہوئی اور "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" اس کا نام رکھا اور بذریعہ جواب مضمونوں کے عموماً مسلمانوں سے اس کی نسبت استفسار کیا۔ آپ اس

---

* سرسید نے ایک نئے اسلامی قمری سنہ کے اجرا کی کوشش کی جو حضور اکرمؐ کے اعلان نبوت سے شروع ہوا تھا اور اس کا پہلا مہینہ شوال قرار دیا۔ یہ سلسلہ انہوں نے تہذیب الاخلاق کی ساتویں جلد سے شروع کیا مگر ان کا جاری کردہ سنہ نبوی مروج نہ ہو سکا۔

بات کو سننے سے کچھ تعجب نہ ہوں گے کہ اس کا اشتہار لندن ہی میں چھپوالیا تھا اور وہ مضمون جس کا جواب پوچھا گیا تھا سب سید محمود کے لکھے ہوئے اور تجویز کئے ہوئے تھے۔ اس کمیٹی کو نہایت کامیابی ہوئی اور بہت بڑی کامیابی کے ساتھ اس کا کام ختم ہوا اور کام ختم ہونے پر اس کالج کا قائم ہونا قرار پایا۔[1]

جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان قائم ہوئی' میں اس کا سیکرٹری تھا۔[2]

ایم اے او کالج فنڈ کمیٹی (خزنتہ البضاعتہ) کا قیام

کالج کا قائم ہونا ہی مقصود تھا جو تجویز سوم میں قرار پایا تھا۔ ۱۸۷۲ء میں چندہ جمع کرنے کے لئے بمقام بنارس ایک کمیٹی قائم ہوئی جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی رکھا گیا اور کامیابی سے اس کا کام چلنا شروع ہوا۔ اس کمیٹی نے ...... مختلف مقامات میں سب کمیٹیاں واسطے وصولی چندہ کے مقرر کیں۔ من جملہ اُن سب کمیٹیوں کے ایک سب کمیٹی علی گڑھ میں مقرر کی۔[3]

مدرسہ کا اجرا

مقام علی گڑھ کا انتخاب

اسی سال بنارس کی کمیٹی میں تجویز پیش ہوئی کہ مدرسہ کہاں بنایا جائے۔[4]

ویران دلی میں (جہاں بجز چند دیوار ہائے شکستہ و بزرگانِ گور خوابیدہ کے کچھ اَور نہیں ہے) مدرستہ العلوم قائم کرنے پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا۔[5]

میں نے علی گڑھ کو اس کے لئے پسند کیا۔ علی گڑھ میرا وطن نہیں تھا اور نہ وہاں سے مجھ کو کچھ تعلق تھا مگر صرف اس خیال سے کہ وہ ایسا مقام ہے جو چاروں طرف سے مسلمان رئیسوں سے گھرا ہوا ہے۔ میرٹھ' بلند شہر' مظفر نگر' سہارن پور' آگرہ' ایٹہ' اور ایک بہت بڑا مخزن مسلمان رئیسوں کا یعنی روہیل کھنڈ' جس میں معزز خاندانوں کے لوگ بستے ہیں' اس سے ملے ہوئے ہیں اور اس لئے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ نہایت مناسب مقام ہے۔[6]

بعد تحقیقات اور طلب آرا کے ۸ نومبر ۱۸۷۲ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ ہوا کہ مدرسہ بمقام علی گڑھ بنایا جائے۔[7]

افتتاح

جب کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان نے مدرستہ العلوم کے قائم کرنے کی رائے قرار دی تو چند روز بعد مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی یہ رائے ہوئی کہ ایک مدرسہ ابتدائی تعلیم کا فی

الفور جاری کر دیا جائے مگر ممبرانِ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ اس رائے سے مختلف تھے۔ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کو اپنی اس رائے اس قدر بھروسا تھا کہ انھوں نے اس مدرسہ کے جاری کرنے کو خاص چندہ شروع کیا باوجودیکہ وہ ایک دفعہ نقد ہزار روپیہ دے چکے تھے دوبارہ انھوں نے ایک ہزار روپیہ اور اس خاص کام کے لئے عنایت کیا۔ ان کی اس فیاضی کے سبب سے اَور لوگ بھی شریک ہو گئے اور ممبرانِ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کو بہ مجبوری اس رائے کا تسلیم کرنا اور مدرسہ کا جاری کرنا پڑا۔[1]

علی گڑھ کے مدرسہ کے لئے مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی ایم جی سے التماس کیا گیا کہ ابتدائی مدرسہ کھولنے کی تدبیر کریں۔[2]

کمیٹی بنارس نے .... مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کو لکھا کہ یکم جون ۱۸۷۵ء سے مدرسہ جاری کریں اور اس کا اشتہار اخباروں میں دے دیں۔ بعد اس کے..... تاریخ افتتاح مدرسہ تبدیل کی اور بعوض اس کے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ تاریخ افتتاحِ مدرسہ قرار دی اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کو لکھا کہ رسمیاتِ افتتاح تاریخ مذکور کو عمل میں آئیں' چنانچہ میں خود اور بعض ممبر اس تاریخ پر علی گڑھ میں آئے اور مدرسہ کھولا گیا۔

میر لیے کہنا کچھ بے جا نہیں کہ اگر صرف کمیٹی خزنۃ البضاعۃ ہی قائم رہتی اور مدرسۃ العلوم کا عملی کاروبار مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کی تدبیر کے مطابق جاری نہ ہوجاتا تو آج تک کمیٹی خزنۃ البضاعۃ برباد ہو جاتی اور کسی کو مدرسۃ العلوم کا قائم کرنا یاد بھی نہ رہتا۔ پس اس مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے کا جہاں تک احسان ہے وہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کا ہے۔[1]

درخواست پنشن و منتقلی علی گڑھ

جس وقت علی گڑھ میں مدرسہ کھولنے کا ارادہ ہوا اس وقت میں نے پنشن لینے کا قصد کیا اور بذریعہ صاحب جج ہائی کورٹ کو اطلاع دی کہ میرا ارادہ پنشن لینے کا ہے اور اکاؤنٹنٹ جنرل سے نقشہ طلب کیا اور درخواست کی کہ میری مدتِ ملازمت اور استحقاقِ پنشن کی تصدیق فرمائیں۔ جس قدر زمانہ اس کی تکمیل میں لگا وہ لگا اور وسط ۱۸۷۶ء میں علی گڑھ میں آ گیا..... سید محمود..... نے مجھ کو صلاح دی کہ آپ اپنی کوٹھی کو' جو علی گڑھ میں ہے اور بسبب اخراجاتِ سفرِ لندن رہن ہو گئی ہے وہ چھوٹی ہے' اس کو فروخت کر کے زرِ رہن ادا کر دیجئے اور ایک دوسری کوٹھی' جس میں میرے اور آپ دونوں کے رہنے کی گنجائش ہو' میں خرید لیتا ہوں۔" چنانچہ سید محمود نے یہ کوٹھی جس میں میں اب رہتا ہوں' خرید لی۔ میں نے اپنی کوٹھی مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے ہاتھ

فروخت کر دی۔[1]

رسمِ سنگِ بنیاد

اس وقت طالب علموں کی تعداد قلیل تھی اور کوئی بورڈنگ ہاؤس نہ تھا۔ طالب علم جس قدر تھے چھوٹے چھوٹے کمروں میں بھر دیے جاتے تھے مگر رفتہ رفتہ ہر ایک چیز میں ترقی ہوتی گئی تعمیر کا کام 'جو میں نے شروع کر دیا تھا' اس میں بھی ترقی ہوتی گئی اور ارادہ ہوا کہ وائسرائے ارل نارتھ بروک کے ہاتھ سے رسم فاؤنڈیشن ادا ہو مگر ان کے دفعتاً تشریف لے جانے سے وہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ لارڈ لٹن کے زمانہ میں بعد دربارِ قیصری فاؤنڈیشن کی رسم کا ان کے ہاتھ سے عمل میں آنا قرار پایا۔ آٹھویں جنوری ۱۸۷۷ء کو حضور ممدوح علی گڑھ میں تشریف لائے اور ایک نہایت پر تکلف جلسے میں رسم فاؤنڈیشن ادا ہوئی۔[2]

ہمارے ملک کے رئیسِ اعظم والئ ملک حاجی حرمین الشریفین نواب محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں والئ رام پور نے 'جو مربی مدرسہ تھے' فرمایا کہ اخراجات رسم فاؤنڈیشن اور دعوت لارڈ لٹن سب ان کی طرف سے کی جائے مگر ہمارے ضلع کے فیاض رئیس کنور محمد لطف علی خاں صاحب نے 'جو پریذیڈنٹ کمیٹی تھے' چاہا کہ ان کی طرف سے اور ان کے نام سے وہ دعوتِ رسم ادا ہو۔ اور ہمارے عالی ہمت راجہ سید باقر علی خاں صاحب وائس پریذیڈنٹ نے چاہا کہ ان کی طرف سے ان کے نام سے ہو مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے یہ مصلحت سمجھی کہ دونوں رئیسوں کی طرف سے ہو' چنانچہ میں نے ہز ایکسی لینسی لارڈ لٹن سے بذریعہ پرائیویٹ سیکرٹری خط و کتابت کی اور سرجان اسٹریچی کی سعی و سفارش سے ہز ایکسی لینسی ارل لٹن نے اس کو منظور کیا۔ میں نے ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور کا اس فیاضی کے لئے شکریہ ادا کیا اور ان دونوں فیاض رئیسوں کی طرف سے رسم فاؤنڈیشن ادا ہوئی...... جب ہز ایکسی لینسی لارڈ لٹن بعد ادائے رسم فاؤنڈیشن کلکتہ ہو کر شملہ میں پہنچے تو حضور ممدوح نے پریذیڈنٹ کمیٹی کنور محمد لطف علی خاں کو تمغۂ قیصری عطا فرمایا۔ ہم نے بھی ان کے اس احسان کو نقشِ کالحجر کیا اور کالج کے دو کمروں میں ان کے آنر میں نہایت خوش خط حرفوں اور خوب صورت پتھروں میں دو کتبے کھود کر لگا دیئے اور ایک کمرے میں جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں کے آنر میں ایک کتبہ لگایا۔[3]

تعلیمی درجوں میں ترقی

یہ مدرسہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو کھولا گیا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے اسکول کلاس اور یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاس قائم ہو گئے۔ یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے یہ مدرسہ یونیورسٹی کلکتہ میں فرسٹ آرٹس کے امتحان تک اور یکم جنوری ۱۸۸۱ء سے بی اے کلاس کے امتحان تک اور یکم جنوری
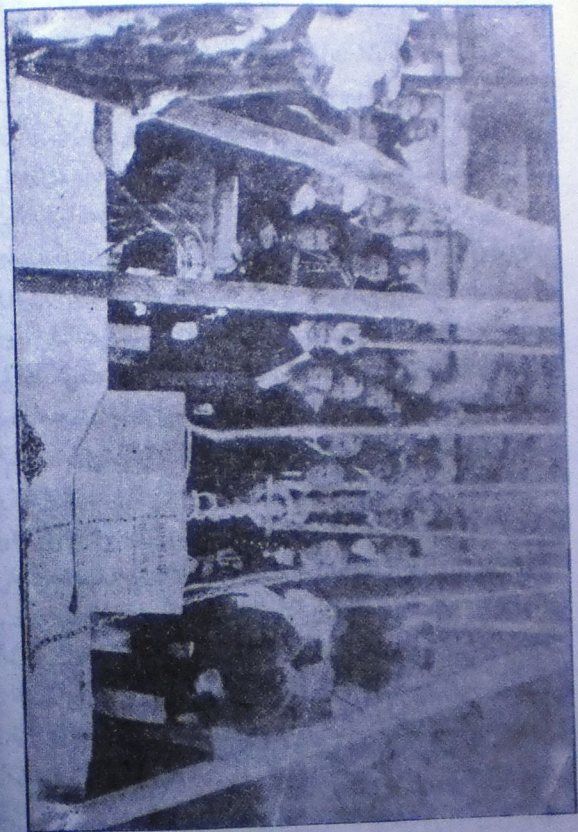
مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تقریب سنگ بنیاد کا ایک منظر
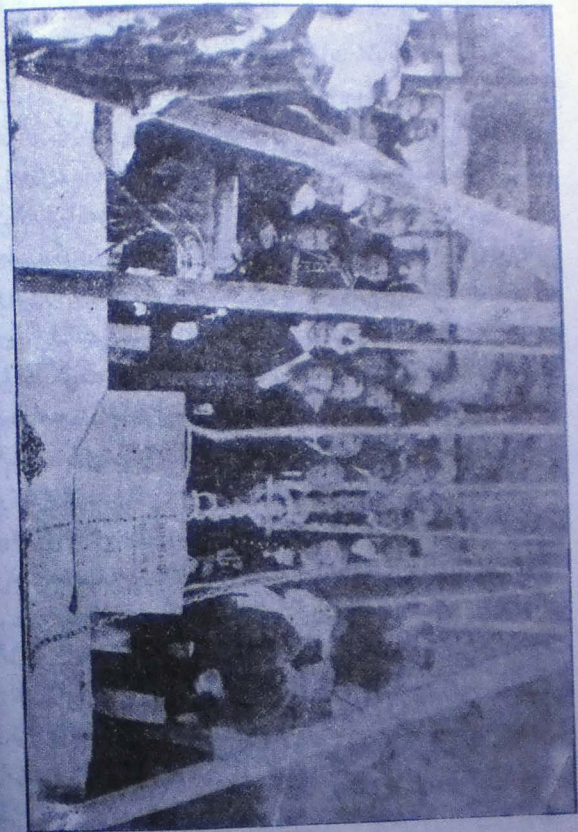
مدرستہ العلوم علی گڑھ کی تقریب سنگ بنیاد کا ایک منظر

۱۸۸۳ء سے قانونی امتحان میں افلیئیٹ ہو گیا۔ ۱۸۸۴ء سے مدرسۃ العلوم کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان ایف اے اور انٹرنس کے لئے سنٹر ہو گیا۔[۱]

میں نے کالج ہی میں ایک سول سروس کلاس قائم کیا تاکہ لڑکوں کو ہندوستان میں عمدہ تعلیم دے کر لندن بھیجا جائے مگر ہماری قوم کی کم توجہی اور کوتاہ اندیشی سے وہ کلاس نہ چلا اور ٹوٹ گیا۔[۲]

رقم کی فراہمی

چندہ کے حصول میں جدوجہد

اتنے بڑے عظیم الشان کام کا' جیسا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہے اور قومی ترقی کے جس خیال سے قائم ہوا ہے اور جس کا پورا ہونا صرف قومی امداد پر منحصر تھا' اس کی تکمیل کے لئے روپیہ فراہم کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کیونکہ روپیہ کی امداد کے بغیر اس کا پورا ہونا محالات سے تھا۔[۳] ★

جب میں نے اپنے دوستوں سے ایسا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے روپیہ کی تعداد پوچھی جو اس کے واسطے ضروری تھی۔ میں نے ایک معتدل تعداد پندرہ لاکھ روپیہ کی بیان کی جو حقیقت میں اتنے بڑے کام کے واسطے کافی نہ تھی۔ اس تعداد کو سن کر میرے وہ دوست بھی جو میری رائے کو پسند بھی کرتے تھے' متعجب ہوئے اور ان کے منہ سے یہ آواز نکلی کہ پندرہ لاکھ روپیہ اور ہندوستان...... ! کیا کچھ جنوں ہو گیا ہے؟ مگر مجھے تعجب اس آواز سے نہیں ہوا' گو میں سمجھتا تھا کہ قوم کو اس کام میں پندرہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کی بھی توفیق نہیں تھی۔[۴]

مجھے وہ دن یاد ہے کہ...... اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کو ناممکن تصور نہ کرتا ہو اور جب کہ چندہ جمع کرنے کا ذکر ہوا تو جو نہایت خاص احباب تھے وہ بھی زیرِ لب مسکراتے تھے اور اس خیال کو جنوں اور دیوانہ پن تصور کرتے تھے۔ مجھے وہ دن بھی خوب یاد ہے کہ جب میں نے اپنے ایک دوست کے بازو پر حضرت امام ضامن کی نیاز کا روپیہ باندھا ہوا دیکھا تو میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا مسلمانوں کی قوم سے زیادہ اور کوئی محتاج ہے؟ کیا کیش خزینۃ البضاعۃ سے زیادہ

★ حالی لکھتے ہیں: "مدرسۃ العلوم کے متعلق سب سے زیادہ مشکل کام چندہ کا وصول کرنا تھا۔ جن کی اولاد کی تعلیم کے لئے مدرسہ قائم کرنا منظور تھا' اول تو وہ پہلے ہی انگریزی تعلیم سے نفور تھے' دوسرے جس وقت مدرسہ کے لئے تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہو گیا جس کے مضامین سے مسلمان عموماً نفرت کرتے تھے اور جس کی وجہ سے مدرسۃ العلوم میں چندہ دینے کو معصیت جاننے لگے تھے...... اس کے سوا ہندوستانی اور خاص کر مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے محض ناواقف تھے۔ جب تک کسی حاکم کا دباؤ یا اشارہ نہ ہوتا تھا' چندہ جمع ہونا نہایت مشکل کام تھا۔" (حیات جاوید' حصہ اول' ص 198- 199)

اور کوئی اس روپیہ کا مستحق ہے؟ ان الفاظ نے میرے دوست کے دل پر اثر کیا اور وہ سبز کپڑا، جس میں وہ نذر بندھی ہوئی تھی، انہوں نے مجھ کو دے دیا۔ جب اس کو کھولا تو ایک روپیہ اور دو منصوری پیسے اس میں سے نکلے، اور یہ پہلا سرمایہ تھا جو ہماری کمیٹی کے خزانہ کی تھیلی میں ڈالا گیا۔

ہم نے دستِ گداگری ہر امیر و غریب کے سامنے دراز کیا اور اس عار کو اپنے پر گوارا کیا جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ۔

بدست آہک تفتہ کردن خمیر
بہ از دست دریوزہ پیش امیر

.... ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قیامت کا عذاب اپنی گردن پر لیا۔ کالج کی تکمیل کے لئے؟ نہیں نہیں، قومی ترقی کا سامان مہیا کرنے کے لئے۔ لاٹری ڈالی، جوا کھیلا، اس پر بھی بس نہیں کیا اور اس شعر پر عمل کیا۔

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا گنج زر از کہتر و مہتر بستانی

سوانگ بھرا، اسٹیج پر کھڑے ہوئے، دوستوں نے فقیروں کا بھیس بدلا، بدو بن کر اور مینڈھا بغل میں داب کر خدا کے لئے مانگا ★

★۔ حالی لکھتے ہیں: "ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی مگر سرسید نے کچھ پروا نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب کالج کو بچ رہا .... جن دنوں میں لاٹری کی تجویز در پیش تھی، ایک رئیس سرسید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سرسید نے کہا "جہاں ہم اپنی ذات کے لئے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں، وہاں قوم کی بھلائی کے لئے بھی ایک ناجائز کام سہی۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 201)

یہاں جس اسٹیج کا ذکر کیا گیا ہے وہ پینی ریڈنگ کی اسٹیج ہے جس کے متعلق حالی لکھتے ہیں: "جب اس جلسہ کی تجویز ٹھہری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہر گز نہ کیجئے گا۔ لوگ مطعون کریں گے اور تماشے والا کہیں گے۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسید نے کہا: "اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 202)

مولوی سید اقبال علی، جو 1884ء کے سفر پنجاب میں سرسید کی پارٹی میں شامل تھے، لکھتے ہیں: "سرسید ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ ہم نے مدرسۃ العلوم کے لئے روپیہ جمع کرنے کی ہر طرح کوشش کی۔ امیروں سے التجا کی، اہلِ ملک سے درخواست کی، قوم سے بھیک مانگی، غیرت کو طاق پر رکھا اور غیر قوموں کے سامنے گداگری کے لئے ہاتھ پھیلایا، لاٹری کا جوا کھیلا مگر پوری طرح کامیابی نہیں ہوئی۔ قوم کی اور ملک کی حالت یہ ہے کہ تکمیل

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

قوم کی عدم فیاضی کا گلہ

جب کہ مدرستہ العلوم کا مسلمانوں کے لئے قائم کرنا تجویز ہوا تو مجھ کو اس کام کے انجام دینے میں، بہ نسبت اور لوگوں کے، زیادہ تر مشکلیں اور دقتیں نظر آتی تھیں، کیا مسلمانوں کی مفلسی کے لحاظ سے، اور کیا دولت مند مسلمانوں کی عیاشی کی نظر سے، اور کیا مسلمانوں کے اس خیال سے جو گناہ کے کاموں میں روپیہ صرف کرنا تو کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے مگر مسلمانوں

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)
تماشے، ناچ رنگ، مسخراپن سے روپیہ وہ دیتے ہیں۔ پس اگر کالج کمیٹی کے ممبر بھی مل کر ایک تھیٹر بنائیں اور خود مقدس ممبر اسمیں گانے والے اور تماشا کرنے والے ہوں تو صرف تین چار شہروں میں تماشا کرنے سے کافی روپیہ ہاتھ آجائے۔ انہوں نے فرمایا کہ خیال کرو کہ جب ہماری یہ قومی تھیٹر پارٹی کسی شہر میں پہنچے اور اشتہار دیا جائے کہ مولوی سمیع اللہ خاں بہادر سب جج علی گڑھ اس طرح کا سوانگ بھریں گے اور مولوی سید فرید الدین احمد خان بہادر سب جج کان پوریوں یوں روپ بدلیں گے، مولوی سید زین العابدین خان بہادر سب جج آگرہ اس طرح مضحول کریں گے، مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ بہادر ریونیو سیکرٹری گورنمنٹ نظام حیدر آباد یہ غزل گائیں گے، مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر صدر بورڈ ریونیو حیدر آباد کے ہاتھ میں درہ ہو گا اور محتسب کا سوانگ دکھائیں گے اور لوگ تکرار کریں گے کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار" منشی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر میور سنٹرل کالج الہ آباد "چہ غم" کا تماشا دکھائیں گے، مولوی سید اقبال علی اس طرح سے ہنس مکھ جوان رعنا کا سوانگ بھریں گے، مولوی سید مہدی حسن صاحب "یاد فراموش" کی نقل کریں گے اور سید میر تراب علی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ایٹہ پھواز یوحیل کے روٹھ بیٹھنے کا تماشا کریں گے، مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ کفایت شعاری کے ساتھ سوداگروں کی دکانوں اور نیلاموں کے مجمع میں اسباب خریدنے کی نقل کریں گے، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر پرستان کے بادشاہ بن کر آئیں گے، وزیر الدولہ مدار الملک خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر پرنس بسمارک کی نقل اتاریں گے، مولوی الطاف حسین صاحب حالی اپنا مسدس گائیں گے اور فلاں صاحب یہ نقل کریں گے اور فلاں صاحب وہ نقل کریں گے، ان صاحب کے گلے میں ڈھولک ہو گی اور وہ صاحب سارنگی بجائیں گے، ان کے ہاتھ میں مجیرے ہوں گے اور ان کے پاس دو تمبرا، اور آنریبل سر سید احمد خان بہادر سی ایس آئی بمصداق اس شعر کسی شاعر تجربہ کار کے۔

رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز
تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی :

ہر ایک مجلس کے مسخرے ہوں گے تو کس قدر لوگ تماشا دیکھنے کو آئیں گے اور کس قدر روپیہ ہاتھ آجائے گا اگر ہم لوگ ایسا کریں اور اس طرح پر اپنی قوم کی بھلائی کے لئے روپیہ جمع کریں تو دنیا میں کوئی قومی عزت ایسی نہیں جو ہماری اس پارٹی کو نصیب نہ ہو اور عقبیٰ میں کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ ثواب کا ایسا باقی نہ رہے جو یہ پارٹی حاصل نہ کرے"
اس کے بعد مولوی سید اقبال علی لکھتے ہیں "اگرچہ میں نے اس تحریر میں بہت گستاخی کی ہے مگر معاف کیا جائے گا کیونکہ سید صاحب ہی کے یہ الفاظ ہیں جو میں نے لکھے ہیں۔" (سفرنامہ پنجاب ص 69-70)

کہ مدرسۃ العلوم میں روپیہ دینے میں سو طرح کے حیلے اور شرعی حجتوں کو پیش کرنا کمال دین داری سمجھتے ہیں۔[1]

ہماری قوم کا جو حال ہے وہ غیر قوموں کی نظروں میں نہایت حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ میں ایک واقعہ بیان کروں گا' اگر مسلمانوں میں کچھ غیرت ہے تو اس کو سن کر بجز مر جانے کے اور کوئی علاج نہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی لندن کے ایک کالج میں بہت سا روپیہ توفیر میں جمع ہو گیا تھا اور اس کے خرچ کرنے کو جگہ نہ تھی۔ وہاں کے منتظموں نے تجویز کی کہ اس کالج میں جو گرجا ہے بہت عمدہ نہیں ہے' اس کو توڑ کر عمدہ گرجا بنایا جائے اور دس لاکھ روپیہ اس میں خرچ کرنا تجویز ہوا۔ اتفاقاً ایک مسلمان بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا کہ اگر یہ روپیہ ہم کو مل جاتا تو ہماری قوم کے لئے ایک عمدہ کالج' جس کی ضرورت ہے' بن جاتا اور گرجے کی تعمیر سے بھی زیادہ مفید ضروری کام میں کام آتا۔" یہ سن کر ایک شخص نے' جو اس کالج سے تعلق رکھتا تھا' جواب دیا کہ اگر تمہاری قوم ایسی ہے کہ وہ اپنی تعلیم کا انتظام بھی نہیں کر سکتی تو اس کا جیتے رہنے سے مر جانا بہتر ہے' وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کی کچھ بھی مدد کی جائے"[2]

ایک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خود میرے ساتھ گزرا ہے' یعنی جس زمانہ میں کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں قائم ہوا تو میں نے ایک نہایت معزز یورپین افسر سے اس کی امداد کی درخواست کی۔ اس نے جواب دیا کہ ہم پر اس کی امداد کرنا کچھ فرض نہیں ہے۔ وہ تمہارا بچہ ہے' ہمیں اس کو دھکا دے دینا چاہئے۔ اگر ہمارا بچہ ہوتا تو ہم البتہ اس کو والدینی شفقت کے ساتھ چھاتی سے لگا لیتے"[3]★

بلاشبہ اس مدرسہ کا اس قدر تعمیر ہو جانا عجائب روزگار میں گنا جاتا ہے اور یہ جو کچھ ظہور ہوا ہے ہماری قوم کے فیاض بزرگوں کی فیاضی کا نتیجہ ہے۔[4]

ہر نواح کے بزرگوں اور قومی بھلائی چاہنے والوں' بلکہ انسان کے ساتھ نیکی کرنے والوں

★۔ حالی لکھتے ہیں: "ایک بار سرسید نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے' جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا' چندہ طلب کیا۔ اس نے بہت روکھے پن سے یہ جواب دیا کہ آپ کو اس کام کے لئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔" سرسید نے کہا "بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اگر یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لئے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ باوجودیکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔" وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسید کی نذر کیا۔" (حیات جاوید' حصہ اول' ص 212)

اور علی الخصوص پنجاب کے زندہ دل بزرگوں اور والیانِ ریاست اور وہاں کے دیگر امراء اور رئیسان نے اور بالتخصیص اسلامی سلطنت حیدر آباد نے نہایت فیاضی سے امداد کی۔ ان بزرگوں کا خاص کر مجھ کو اپنی ذات سے بے انتہا شکر ادا کرنا لازم ہے کہ انہوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسا کیا کہ لاکھوں روپیہ کا چندہ مجھ کو دے دیا' نہ کسی کمیٹی کو پوچھا نہ کسی ممبر کو اور نہ یہ جانا کہ روپیہ جو وہ دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ میں اپنی تمام زندگی میں اس امر پر اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔(1)

مگر میں قوم کی شکایت اس وجہ سے کرتا ہوں کہ ان فیاض لوگوں کی تعداد کو' جنہوں نے کالج کی مدد کی ہے' قوم کی اس تعداد سے مقابلہ کیا جائے جو اب تک اس کی امداد میں شریک نہیں ہوئے اور جن کو بقدر اپنی حیثیت کے کالج کی مدد کرنا ضرور تھی تو ایسی نسبت نکلے گی کہ کسورِ اعشاریہ سے بھی اس کا بیان کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پس یہ جو کچھ ہوا فیاض لوگوں کی فیاضی کا نتیجہ ہے مگر قوم کو من حیث القوم جو کچھ کرنا ضروری تھا وہ قوم نے نہیں کیا۔(2)

ہندوؤں کا احسان

لاچار مدرستہ العلوم کے بانیوں کو مسلمانوں کے اس قومی مدرستہ العلوم کے لئے دوسری قوم کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔(3)

اگر ہماری قوم کی ایسی حالت نہ ہوتی تو ہم کو ایسی کوشش کرنے کی کیا ضرورت ہوتی؟ مجھ کو عیسائی' ہندو' جولاہا' چمار' سب کے سامنے اپنی ذلیل قوم کی بھلائی کے واسطے کیوں ہاتھ پھیلانا پڑتا؟(4)

جناب سردار دیال سنگھ بہادر...... نے مدرستہ العلوم پر بہت احسان کئے ہیں۔(5)

میں خاص کر اپنے ہندو بھائیوں کا احسان نہیں بھولتا جنہوں نے قوم اور اپنے بھائیوں کو تباہ حالت میں دیکھ کر ان کی بہتری کے لئے ہزاروں روپیہ چندہ میں دیا۔(6)

ہندوؤں نے نہایت فیاضی سے روپیہ و جاگیر و انعام دیا اور تمام قوم کو اپنا ممنون اور زیر بارِ احسان کیا۔(7)

اس مدد میں مَیں مسلمانوں کا اس قدر مشکور نہیں ہوں جس قدر ہندوؤں کا ہوں جنہوں نے بطور خیرات کے اپنے بھائیوں کی مدد کی' مدرسے کی عمارت کی دیواروں اور محرابوں پر بہت سے ہندوؤں کے نام کندہ ہیں جس سے ہمیشہ یہ یادگار قائم رہے گی کہ ہندوؤں نے اپنے درماندہ بھائیوں کی کس فیاضی سے مدد کی تھی۔(8)

ان کا شکریہ سب سے زیادہ لازم و مقدم ہے' انہی نے اصل میں انسانیت اور خیرات کا کام کیا ہے۔ ان کے احسانات مدرسہ کے در و دیوار سے ہمیشہ ظاہر رہیں گے۔[1]

انگریزوں اور حکومت کی امداد

چونکہ انگریز ہمارے حاکم ہیں اور رعایا کا حق ہے کہ اپنے حاکموں سے مدد چاہئے اس لئے ہم انگریزوں سے بھی اپنے کام میں مدد کی درخواست کرتے ہیں۔[2]

مسلمانانِ ہندوستان نہایت احسان مندی سے حضورِ عالی جناب ہز ایکسی لینسی لارڈ نارتھ بروک وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان کو ہمیشہ نسل در نسل یاد رکھیں گے جنہوں نے نہایت فیاضی سے دس ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے اس مدرسہ کے دُنیوی علوم کے کاروبار کو مرحمت فرمایا۔[3]

حضورِ عالی سرجان اسٹریچی صاحب کے۔سی ایس آئی لفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی............ نے نہایت مشکل وقتوں پر اس مدرستہ العلوم کی مدد فرمائی ہے۔ حضورِ ممدوح کو ہندوستان میں تشریف لائے ہوئے دو تین ہفتہ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ اپنی جیب خاص سے نقد چندہ مرحمت فرمایا۔[4]

سر ولیم میور ایل ایل ڈی کے سی ایس آئی نے بھی اس کام میں چندہ دینے سے مدد کی۔[5]

انگلستان میں بھی مدرستہ العلوم مسلمانان کے لئے چندہ جمع کرنے کو ایک سرکلر روانہ کیا۔[6]

ایک شریف عالی خاندان میرے دوست جی ایم کینیڈی صاحب بہادر نے' جو ایڈنبرا واقع سکاٹ لینڈ کے شریف و رئیس ہیں اور جن کو کچھ تعلق ہندوستان سے نہیں ہے' ہزار روپیہ اس کام کے لئے مرحمت فرمایا۔[7]

اگرچہ اس میں ہندوؤں اور اَور قوموں کی پڑھائی کے لئے بھی موقع رکھا گیا ہے مگر بنیاد مدرسہ خاص مسلمانوں کے واسطے ہے' اور اس لئے اس میں زیادہ تر یہ تھا کہ گورنمنٹ مدد دے گی یا نہیں۔ اگر کل قوموں کے لئے ہوتا جیسے مشنری سکول' جس میں دُنیوی تعلیم بلا لحاظ قوم و مذہب کے دی جاتی ہے' تو گورنمنٹ کی امداد کا قاعدہ صاف تھا لیکن ہمارے کالج کا نام ایسا تھا جس سے معلوم ہو کہ وہ صرف مسلمانوں کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ بایں ہمہ گورنمنٹ نے نہایت نیک دلی سے وعدہ کیا... کہ جس قدر روپیہ اور آمدنی تم جمع کر لو گے اسی قدر گورنمنٹ سے ملے گا۔[8]

گورنمنٹ اضلاع شمال و مغرب نے ایک نہایت عمدہ اور وسیع قطعہ زمین تعدادی پونے دو سو بیگھہ پختہ کا واسطے تعمیر مکان مدرسہ اور باغ متعلق مدرسہ کے مرحمت فرمایا۔[9]

ذاتی دوستوں کی فیاضی

ہمارے دوستوں کی فیاضی ہم کو شرمندہ نہیں ہونے دیتی۔ ہم نے بھی اس مقولہ پر عمل کرنا اختیار کر لیا ہے کہ "خانہ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب" جس امر کی ضرورت ہوتی ہے دوستوں ہی سے سوال کرتے ہیں اور کچھ شرم نہیں کرتے..... اور حق یہ ہے کہ اگر دوستوں ہی سے نہ مانگیں تو کس سے مانگیں؟ لیکن ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے۔ ایک دوست پر کالج کے کسی فنڈ کا چندہ کسی قدر باقی تھا۔ ہم نے ان سے کہا کہ تھوڑا سا روپیہ رہ گیا ہے اس کو بے باق کر دو۔ انہوں نے کہا کہ بے باقی کا تو آپ نام نہ لیجئے' جب تک زندگی ہے بے باقی تو نہ ہوگی۔ آج اس چندہ کی باقی کل دوسرے چندہ کی' اس طرح باقی دار مر جاؤں گا۔ پس بے باقی تو نہ ہوئی ہے نہ ہوگی مگر جس قدر روپیہ چاہو لے لو ...... درحقیقت یہی حال ہے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے ہوں۔⑪

وصولیٔ چندہ کے منفرد انداز★

چندہ اور سفر کے اخراجات

مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لئے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔⑫

ڈیپوٹیشن' جو چندہ کرنے کے لئے دورہ کرتا ہے' یا مجھے خود چندہ کرنے کے لئے کسی جگہ جاتا ہو..... تو کُل اخراجاتِ سفر ہم اپنے پاس سے ادا کرتے ہیں اور

★۔ رقم کی فراہمی کے سلسلے میں سرسید نے مختلف مواقع پر جو منفرد انداز اختیار کئے ان میں سے چند اور قابلِ ذکر ہیں:۔

حالی لکھتے ہیں: "چندہ کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اچک لینے کا موقع ملا انہوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "خانہ دوستاں بروب و درِ دشمناں مکوب" ایک روز مسٹر تھیوڈور بیک کے والد' جو سیاحت کے لئے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے' ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین خاں کو دینی چاہتے تھے اور وہ اس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سرسید کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سرسید نے بہت بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔" انہوں نے وہ اشرفی لے لی۔ سرسید نے کہا "دیکھوں' کس سکہ کی اشرفی ہے؟" اور ان سے لے کر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کر دی۔"

"اسی طرح ایک دن سید محمود نے قاضی رضا حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط بدی اور یہ ٹھہرا کہ جو ہارے' پچاس روپیہ مدرسہ میں دے۔ اتفاق سے سید محمود ہار گئے۔ وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آئے

(باقی اگلے صفحے کے حاشیہ میں)

جو کچھ چندہ وصول ہوتا ہے، بے کم و کاست مدرسہ میں جمع کر دیتے ہیں۔(1)

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

اور قاضی صاحب سے کہا کہ پچاس روپیہ دیجئے اور نوٹ لیجئے" انہوں نے کہا "وہ تو ہنسی کی بات تھی، کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے شرط بد نا جائز بھی نہیں ہے" سرسید بھی وہیں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے، فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو وہ جائز ہے" اور فوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سید محمود کو دے دئے اور نوٹ لے لیا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول ص 210-211)

سرسید اپنے مخالفوں سے بھی چندہ وصول کرنے کا ایسا ہی عزم رکھتے تھے۔ ایک جگہ اپنے بہت بڑے مخالف سید امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کان پور کے بارے میں دلچسپ انداز میں یوں تحریر کرتے ہیں "لوگ یہ خیال کرتے ہوں گے کہ جناب مولوی حاجی سید امداد العلی صاحب خان بہادر سی ایس آئی ہمارے بڑے مخالف ہیں مگر ان کو جاننا چاہئے کہ باوصف اس قدر اختلافِ خیالات کے وہ ہمارے ویسے ہی دوست ہیں جیسے کہ ایک مدت دراز سے تھے۔ ہمارے خیالات کے وہ کیسے ہی مخالف ہوں مگر مدرسۃ العلوم کے قیام کو نہایت عمدہ سمجھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ کئی دفعہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ادھر ادھر بہت دیکھا، کہیں روپیہ کی تھیلی نظر نہیں پڑی۔ اب کی دفعہ ایسے وقت پر جائیں گے جب کہ چپڑاسی تنخواہ خزانہ سے لاتا ہو گا، اور لوگوں کو دکھا دیں گے کہ کس طرح ان کی پوری تنخواہ مدرسۃ العلوم کے چندہ میں داخل ہوئی۔" (برگِ گل کراچی، سرسید نمبر، نقشِ ثانی، ص 348)

حالی لکھتے ہیں: "مارچ 97ء میں جب کہ سر شیر محمد خاں بہادر رئیس پالن پور کالج کے ملاحظہ کو علی گڑھ میں آئے اور ٹرسٹیوں کی طرف سے سرسید نے ان کو ایڈریس دیا اس وقت کالج کی خیر خواہی کے جوش میں سرسید نے ایک ایسا کام کیا جس کو سن کر ہر شخص تعجب کرے گا۔ رئیس ممدوح نے چلتے وقت پچاس روپیہ سرسید کے پوتے سید مسعود کو اور پچاس محمد بشیر کو، جو نواب محسن الملک کا عزیز ہے، اور پچاس پچاس روپے دونوں صاحبوں کے ملازموں کو علاوہ پانچ سو روپیہ چندہ کالج کے دیئے تھے۔ دونوں بچوں نے تو خوشی سے کہہ دیا کہ ہم دونوں کے سو روپے کالج کی مسجد کی تعمیر میں صرف کئے جائیں مگر سرسید نے نوکروں کا روپیہ بھی لینا چاہا۔ نواب محسن الملک نے تو اپنے نوکروں کے انعام کو ان سے لینا ہرگز پسند نہ کیا اور پچاس روپے انہی کو دے دیئے مگر سرسید نے حجت شرعی تمام کرنے کو نوکروں سے کہا کہ اگر تم کو ہماری نوکری منظور ہے تو جو انعام نواب صاحب نے تم کو دیا ہے وہ کالج میں دے دو ورنہ ابھی اپنا حساب کر لو۔" وہ بے چارے نوکری کیونکر چھوڑ سکتے تھے؟ انہوں نے مجبوراً پچاس روپے سرسید کو دے دیئے اور سرسید نے بے تکلف ان سے روپیہ لے کر کالج فنڈ میں جمع کر لیا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، حاشیہ ص 17)

علی گڑھ کے ایک انگریز پروفیسر اپنی بیوی کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں: "بوڑھے سید کالج کی نمازوں میں شریک ہونے لگے ہیں جس سے بہت ہلچل ہوئی ہے کیونکہ انہیں ہمیشہ کافر کہا جاتا تھا۔ کمیٹی کے ایک رکن نے انہیں ہر حاضری کے بدلے ایک روپیہ کی پیشکش کی ہے۔ ان (سرسید) کا بیان ہے کہ وہ اس سے ایک لڑکے کے وظیفہ جتنی رقم کما سکتے ہیں۔ وہ اپنی تمام گذشتہ نمازوں کے علاوہ مستقبل کی نمازیں بھی فروخت کرنے کو بے تاب ہیں۔ گذشتہ کے لئے وہ قیمت طلب کرتے ہیں وہ چار آنے یا ساڑھے چار پنس ہے۔" (دی لیٹرز آف سیواشر ریلے ص 53)

مہمان داری کی رقوم چندہ میں

میں نے ایک نیا طریقہ دوستوں سے اختیار کیا ہے...... کسی دوست کے پاس نہیں ٹھہرتا، ڈاک بنگلہ میں ٹھہرتا ہوں اور سب دوستوں سے کہتا ہوں کہ جو کچھ آپ میری مہمان داری یا دعوت میں خرچ کرتے تو وہ ازراہِ عنایت نقد مرحمت فرما دیں...... اس میں ایک اور خوبی یہ ہے کہ امیر و غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دوست نے ایک دفعہ ایک روپیہ بابِ دعوت مجھے عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہو کہ مدرستہ العلوم کے آٹھ دس مزدوروں کی مزدوری ملی۔ وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت نیک لگی۔(۱)

خوشی کی تقریبات میں چندہ بطورِ رسم

سردار محمد حیات خاں بہادر سی ایس۔ آئی میرے پرانے اور نہایت عزیز دوست ہیں یہاں تک کہ ان کو میں تحریرات میں کوئی القاب بھی نہیں لکھتا، صرف "مائی ڈیر حیات" لکھتا ہوں۔ انہوں نے مدرستہ العلوم میں بھی ہزاروں روپیہ سے مدد کی ہے...... میرے عزیز محمد اسلم حیات کی، جو ہمارے کالج کے ایک طالب علم ہیں اور خدا کی عنایت سے اب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں اور جناب سردار صاحب کے فرزند ہیں، شادی تا کتخدائی تھی۔ سردار محمد حیات خاں نے بہ تقریبِ تہنیت اس شادی کے دو سو روپیہ مدرستہ العلوم میں بھیجے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے موقع پر ڈوم ڈھاڑی میراثی ہٹ کیا کرتے ہیں کہ اتنا نہیں لیتے، اور زیادہ دو ــــــ میں نے بھی ہٹ کی اور کہا کہ پانچ سو روپیہ دو اور مدرستہ العلوم کے سنٹرل ہال میں اس مبارک شادی کی یادگار کندہ کرا دو۔(۲)

کالج کی مخالفت

مذہبی اتہامات

جس زمانہ میں اس کالج کی تدبیریں شروع ہوئیں تو ہر جگہ کے لوگوں نے اس کو پسند کیا اور حصہ ملک سے اس کی تائید ہوئی...... مگر بعض مذہبی مسائل جو مختلف بیان کیے ان کے لحاظ سے البتہ لوگوں کو کچھ کچھ شبہ ہوا اور فتور پڑا۔(۳)

مولوی سید امداد العلی خاں بہادر جو فضل الٰہی سے ہماری قوم میں ایک بہت بڑے اہل افسر رئیس ہیں اور ہمارے بہت بڑے شفیق دوست ہیں، مدرستہ العلوم میں ان کے شریک نہ ہونے سے ہم کو نہایت رنج ہے اور نیز قوم کی بھلائی میں نقصان ہے اور ہم جب ان سے ملتے ہیں مدرستہ العلوم میں

شریک ہونے کی التجا کرتے ہیں۔ دربارِ دہلی میں بھی ہم نے ان سے التجا کی۔ انہوں نے فرمایا کہ دو شرط سے ہم شریک ہوں گے'اول یہ کہ تہذیب الاخلاق کا چھاپنا بند کر دیا اس میں کوئی مضمون متعلق مذہب مت لکھو' دوسرے یہ کہ اپنے عقائد و اقوال سے 'جو بر خلاف علمائے متقدمین ہیں' توبہ کرو۔[1] ★

خود ہماری ہی قوم میں بعض لوگوں نے اس قومی فائدہ کے کام میں مخالفت اختیار کی اور مذہبی مخالفت کا جھوٹا حیلہ بنا کر اس قومی بھلائی کے کام کو برباد کرنا چاہا۔[2]

ان کو اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بجز اس کے کہ مذہبی تعلیم کی نسبت جھوٹے اتہام مشہور کیا کریں اور کوئی بہتر طریقہ نہ تھا اور ان اتہامات کو بعض لوگوں نے سچ سمجھا ہو گا اور بعض شبہ میں پڑے ہوں گے لیکن ہماری کمیٹی کی اس سچی اور نیک نیت کارروائی نے' جو مذہبی تعلیم کے باب میں ہوئی' تمام دنیا پر ظاہر کر دیا کہ ان قومی بھلائی کے مخالفوں کے اتہامات کیسے اعلانیہ جھوٹے اور بے اصل تھے۔ کمیٹی خزنۃ البضاعۃ نے مذہبی تعلیم کا رشتہ بالکل اپنے سے علیحدہ کر دیا اور ایسے دین دار اور خدا پرستوں کے ہاتھ میں سپرد کیا جن کی نیکی اور دین داری پر ہمارے مخالفوں کو بھی اقرار ہے۔[1]

★ حالی لکھتے ہیں: "مدرستہ العلوم کے سب سے بڑے مخالف دو بزرگ تھے جو باوجود ذی وجاہت اور ذی رعب ہونے کے علوم دینیہ سے بھی آشنا تھے' ایک مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر کانپور اور دوسرے مولوی علی بخش خاں سب جج گورکھپور۔ اگرچہ دونوں صاحب مذہبی عقائد و خیال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضدِ حقیقی تھے یعنی پہلے سخت وہابی اور دوسرے سخت بدعتی' اور یہ ایسا اختلاف تھا کہ کسی بات پر دونوں کا اتفاق محالِ عادی معلوم ہوتا تھا' باوجود اس کے مدرستہ العلوم کی مخالفت پر دونوں ہم زبان اور متفق الکلمہ تھے' یہاں تک کہ ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف و جوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں۔" (حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 277)

پہلے مخالف کے خیالات تو آپ نے سرسید ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائے' اب دوسرے بڑے مخالف مولوی علی بخش خاں کی مخالفت کا جواز نواب وقار الملک کے حوالے سے تحریر ہے۔ مولوی علی بخش خاں نے کہا: "میں صرف اس وجہ سے اب تک مدرستہ العلوم میں شریک نہیں ہوا کہ مجھ کو اس کے طالبعلموں کی مذہبی تعلیم کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں ہوا اور ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جس قسم کے عقائد سید احمد خاں صاحب کے ہیں ویسے عقائد کی تعلیم اس مدرسے میں طالبعلموں کو بھی ہو گی۔" (تہذیب الاخلاق' جلد چہارم' ص 67)

اسی طرح مولوی علی بخش خاں نے نواب محسن الملک کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا: "ہماری قوم میں سید احمد خاں صاحب ایک شخص لائق اور نامور اور معزز اور ذی عقل پیدا ہوئے اور ترقی قومی پر آمادہ ہونا ان کا ارادہ ظاہر کیا گیا مگر اپنی خود رائی سے مذہبی دست اندازی و انقلابِ دین ایمان کی طبیعت میں جم گیا کہ اصلی غرض فوت ہو گئی اور تمام قوم کو ان سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو بھی جس قدر مخالفت ہے ان کے خیالاتِ مذہبی سے ہے' نہ ان کی ذاتِ خاص یا تعلیم علوم جدیدہ سے۔" (مقالاتِ سرسید' حصہ دہم' ص 240)

لعنتیوں کا طوق

ہمارے دوستوں کا یہ خیال کہ ان کے اتہامات اور فحش سے مدرسۃ العلوم کو نقصان پہنچے گا میرے رائے میں درست نہیں ہے۔ مدرسۃ العلوم چل نکلا اور چلے گا۔ تمام اتقیا اور رؤسا نے دیکھا اور تجربہ کیا' اب وہ کسی بدگوئی اور فحش اتہامات سے رک نہیں سکتا۔ ہاں' جس کسی کو لعنتی کا طوق پہننا خوش آتا ہو وہ جو چاہے کہہ لے اور کر لے۔ (۱)

جہاں تک مجھ سے ہو سکے میں اپنی قوم کی بھلائی میں کوشش کروں گا اور ضرور کروں گا اور لوگوں کو جو وہ بکنا چاہیں بکنے دوں گا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کی اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ ان کو کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ (۲)

خبیث النفس' بدباطن' حُسّاد' بے تمیز' یہود ہٰذہِ الاُمّت

ہم نے سات قسم کے لوگوں کو دارالعلوم مسلمانان کے مخالف پایا:۔

اوّل' خبیث النفس اور بدباطن (۱)

دوم' حساد (۵)

سوم' بعض متعصب وہابی جن کو میں "یہود ہٰذہ الامت" سمجھتا ہوں (۶)

چہارم' خود غرض یا خود پرست (۸)

پنجم' ٹٹ پونجیے اخبار نویس (۷)

ششم' بے تمیز (۹)

ساتویں' نادان مسلمان جن کے دل میں پہلی پانچ قسم کے بزرگوں نے وسوسہ ڈالا ہے۔ (۱۰)

غدار ایڈیٹر

ہمارے ملک کے بعض اخباروں نے بھی (خصوصاً جن کے ایڈیٹر مسلمان تھے اور جن کا فرض اپنی قومی ترقی میں کوشش کرنا تھا) اس مدرسۃ العلوم کی کافی مخالفت کی ہے۔ گو اس کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر انہوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ایک غدار ہونے میں بلاشبہ شہرت حاصل کی ہے۔ (۱۱)

سید محمود کی جانشینی کا مسئلہ

موزوں یورپین ہیڈ ماسٹر کے تقرر میں واسطہ

جب اسکول جاری ہوا ہم کو یورپین مگر ایک جنٹلمین ہیڈ ماسٹر کا ملنا مشکل تھا حالانکہ یورپ سے بلانا نہ تھا بلکہ ہندوستان ہی میں سے تلاش کرنا تھا...... اس کے بعد کالج کو ایسی ترقی ہو گئی تھی کہ اس کے لئے پرنسپل یا پروفیسر کا ہندوستان میں تلاش کرنا فعل عبث تھا او بغیر اس کے کہ ولایت سے اور ولایت کی یونیورسٹیوں کے گریجویٹ کو بلائیں، کام ہی نہیں چل سکتا تھا۔ ہمارا مقصد پورا ہونے کو صرف گریجویٹ ہی ہونا کافی نہ تھا بلکہ ایک معزز خاندان کا اور ایک ایسے جنٹلمین مزاج کا ہونا بھی ضرور تھا جو ہم سے دوستانہ یا برادرانہ برتاؤ اور ہماری قوم کے بچوں پر پدرانہ شفقت رکھنے کے لائق ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر سید محمود اس کام کو اپنے ذمہ نہ لیتے اور اس کا انجام نہ کرتے تو ایک شخص بھی ہم کو ولایت سے میسر نہ آتا۔ جو لوگ ولایت سے آئے صرف سید محمود کی دوستی پر طمانیت کر کے اور سید محمود کے سبب سے مجھ پر طمانیت کر کے اور اس یقین پر کہ ان کو صرف ان ہی دو شخصوں سے سروکار رہے گا بلا کسی شرط اور بلا کسی اگریمنٹ کے ہمارے کالج میں آئے۔ ایک یورپین جنٹلمین نے، جس نے ہمارے کالج میں آنے کا ارادہ کیا تھا، ولایت میں سر جان اسٹریچی سے پوچھا کہ مجھ کو کن شرطوں پر جانا مناسب ہو گا۔ سر جان نے جواب دیا کہ کالج سید احمد کے ہاتھ میں ہے، اس پر پوری طمانیت رکھنا سب سے عمدہ شرط ہے...... میرا یہ دلی یقین ہے کہ اگر آئندہ ہم کو کسی یورپین پروفیسر کا ولایت سے بلانا ہو اور سید محمود واسطہ نہ ہوں اور نیز موجودہ یورپین افسر اس شخص کو ہمارے برتاؤ سے، جو ہم کالج کے یورپین افسروں کے ساتھ رکھتے ہیں، مطمئن نہ کریں تو محالات سے ہے کہ کوئی شخص بھی ولایت سے آئے۔[1]

یورپین دوستوں کا مشورہ

یورپین افسر جب ہمارے کالج میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک کمیٹی کالج پر حکومت کرتی ہے جس میں مختلف مزاج، مختلف طبیعت اور مختلف سوسائیٹیوں کے لوگ شامل ہیں اور پانچ آدمی، جو نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ انگریزوں کی ضروریات و حالات سے واقف ہیں، ہر ایک امر کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ ان کو تردد ہوا کہ موجودہ سیکرٹری کے بعد کون سیکرٹری ہو گا اور اس کے ساتھ ہم مل کر کالج کا کام بہ طمانیت کر سکیں گے یا نہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا یہ خیال کچھ ناواجب نہ تھا۔ اسی کے ساتھ بدبختی سے ایسے امور پیش آئے جس سے ان کو عدم طمانیت کا خیال زیادہ پختہ ہو گیا بلکہ درجہ یقین کو پہنچ گیا۔ کسی کے یہ کہہ دینے سے کہ ان

کے یہ خیالات صرف توہمات ہیں ان کے دل کو طمانیت نہیں ہو سکتی۔ ان کی یہ خواہش نہ تھی، نہ وہ اس میں مداخلت کرنا چاہتے تھے کہ موجودہ سیکرٹری کے بعد کون سیکرٹری ہو مگر بلاشبہ ان کی خواہش یہ تھی کہ یہ بات معلوم ہو جائے اور ابھی اس کا تصفیہ ہو جائے کہ موجودہ سیکرٹری کے بعد کون سیکرٹری ہو گا، اس کے بعد وہ اپنے حال کا خود تصفیہ کریں گے۔ اگر وہ سمجھیں گے کہ اس کے ساتھ وہ مل کر کالج کا کام بہ طمانیت کر سکتے ہیں، کریں گے ورنہ خدا حافظ کہہ کر اپنے لئے کوئی اور راستہ اختیار کریں گے۔ بے شک ان کا یہ خیال.. کہ اگر سید محمود آئندہ سیکرٹری ہوں تو وہ بہ طمانیت، جب تک خدا چاہے، کالج کا کام کر سکیں گے انہوں نے اپنے اس خیال کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس ضلع کے یورپین دوستوں اور ان یورپین دوستوں سے جو ہمارے کالج کے بے انتہا دوست اور ہمارے کالج کے ہر گونہ ترقی کے خواہاں ہیں، سب پر ظاہر کیا میرے کُل یورپین دوستوں نے صلاح دی کہ کالج کی بہتری کے لئے نہایت ضرور ہے کہ یورپین شاف کو کافی طمانیت سے رکھا جائے اور تم کو بہ نظر بہتری کالج کے ضرور ہے کہ بہت جلد اس بات کا تصفیہ کر دو کہ تمہارے بعد سید محمود کالج کے لائف سیکرٹری ہوں گے۔[1]

اہلیت بطور سیکرٹری

اس خاص معاملہ میں یورپین دوستوں کی رائے و مصلحت کو بہ نسبت کسی ہندوستانی دوست کے زیادہ وقعت کی سمجھتا ہوں اور بے شک ان کی مصلحت کو کالج کی آئندہ حالت کے لئے زیادہ مفید سمجھتا تھا لیکن اس سبب سے کہ سید محمود میرے فرزند ہیں اس میں مجھ کو تامل ہو جاتا تھا۔ علاوہ اس کے میرا یہ بھی فرض تھا کہ میں اس بات کی بھی فکر کر دوں کہ میرے بعد کالج کا کیا حال ہو گا؟ یہ کہہ دینا کہ خدا پر چھوڑ دو بڑے بڑے دین داروں کا کام ہے، میں تو دنیا کا ایک آدمی ہوں اور دنیا کے انتظام کی پابندی سے آئندہ کے انتظام کا خیال ایک قدرتی امر ہے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کالج اب ایک اسکول نہیں رہا ہے جس کا کام ہما شما چلا لیں۔ اب خدا کے فضل سے وہ اعلیٰ درجے تک ترقی کر گیا ہے۔ ایم اے کی کلاس تک اس میں پڑھائی ہوتی ہے...... ایسے کالج کا کام چلانے کے لئے ایسے شخص کا سیکرٹری ہونا لازم ہے جو خود انگریزی علوم اور یورپین سائنس و لٹریچر سے کماحقہ، واقف ہو اور انگریزی تعلیم کو سمجھتا ہو، تعلیم کے معاملہ میں پرنسپل کے ساتھ صلاح و مشورہ میں شریک ہو سکتا ہو، خود اس بات کو جان سکے کہ کالج میں تعلیم کی کیا حالت ہے، اگر کچھ نقص ہوں تو اس کو سمجھنے اور اصلاح کرنے پر قدرت رکھتا ہو...... کالج کے معاملات

میں تمام خط و کتابت جو ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے ' گورنمنٹ سے ' گورنمنٹ آف انڈیا سے تعلیم کی نسبت اور بالتخصیص مسلمانوں کی تعلیم کی نسبت ہوتی ہیں ' ان کو انجام دے سکے۔ میں خود اقرار کرتا ہوں کہ مجھ میں ان تمام کاموں کے انجام دینے کی لیاقت نہیں ہے ' صرف سید محمود کی امداد سے وہ انجام پاتے ہیں۔ امداد کا لفظ بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ان سب کو سید محمود انجام دیتے ہیں۔ پرنسپل صاحب کالج کے تعلیمی معاملات میں سید محمود سے مشورہ کرتے ہیں ' یونیورسٹی کے معاملات میں سید محمود سے مشورہ کرتے ہیں ' ہمارے دفتر کو دیکھو تو معلوم ہو گا کہ تمام امپارٹنٹ چٹھیاں متعلق کالج ان کی لکھی یا لکھوائی ہوئی موجود ہیں۔⁽¹⁾

مدرسہ کے بورڈنگ ہاؤس کی اور تعلیم کے طریقے کی ' جس پر اس وقت مدرسہ چل رہا ہے اور جس پر آئندہ چلے گا ' ان کی نسبت یہ کہنا کہ میں ان کا تجویز کرنے والا اور قرار دینے والا تھا ایک نا انصافی ہوگی ' بلکہ صاف صاف کہنا چاہئے کہ اس کا بہت بڑا حصہ سید محمود کا تجویز کیا ہوا تھا جو انہوں نے اپنی واقفیت اور اپنے نہایت لائق دوستوں سے صلاح و گفتگو کے بعد قرار دیا تھا۔⁽²⁾

ایک اَور امر ہے جس کو میں بہت بڑا عظیم الشان سمجھتا ہوں ' گو اَور لوگ اس کو حقیر سمجھیں کہ یہ کالج جس مقصد اور جس پالیسی سے میں نے قائم کیا ہے اور جس نتیجہ قومی ترقی پر میں نے اس پر محنت کی ہے میرے بعد بھی اسی طرح اور اسی نتیجہ پر یہ کالج چلے۔ سید محمود ابتدا سے آج تک ان تمام صلاحوں میں شریکِ غالب رہے ہیں اور مجھ کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ سوائے سید محمود کے اَور کوئی شخص کالج کو اس طریقہ پر نہیں چلا سکتا۔⁽³⁾

جو ضرورت کالج میں انگریزی تعلیم اور ولایت سے پروفیسر اور لائق آدمیوں کے بہم پہنچانے کی ہے ' اور ہمیشہ ہوتی رہے گی ' سوائے سید محمود کے کون انجام دے سکتا ہے؟ اگر سید محمود میری مدد نہ کرتے اور نہایت کوشش سے پروفیسروں کے انتخاب میں اپنا ذاتی روپیہ خرچ نہ کرتے تو ایک پروفیسر بھی ہم کو میسر نہ آتا۔ اگر آج سید محمود مدرسے کی مدد سے دست کش ہو جائیں ' میری زندگی ہی میں مدرسہ چل نہیں سکتا۔ مولوی سمیع اللہ خاں مع حمید اللہ خاں اور دو چار سمیت اگر ایک پروفیسر بھی خصوصاً میرے مرنے کے بعد بلوا سکیں تو اگر میں زندہ ہوں تو میری ڈاڑھی منڈوا ڈالنا اور مر جاؤں تو قبر پر جا کر جوتے مارنا اور لعنت بھیجنا۔⁽⁴⁾

ٹرسٹی بل کی مخالفت

ان تمام واقعاتِ واقعی اور امور اتِ حالی اور حالاتِ وجدانی نے مجھ کو آمادہ کیا کہ میں مسودہ مجوزہ میں سید محمود کو اپنی زندگی تک جائنٹ سیکرٹری ' جس کا در حقیقت ابتدا سے وہ کام کرتے

ہیں' اور اپنے بعد لائف آنریری سیکرٹری مقرر کروں۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسا کرنے میں لوگ مجھ کو ہر طرح کے طعنے دیں گے اور کوئی بد گمانی اور کوئی اتہام ایسا نہ ہو گا جو مجھ پر نہ کریں گے۔ میں نے کہا کہ اگر میں قوم کی اور کالج کی بہتری اس میں سمجھتا ہوں اور اس پر یقین کرتا ہوں اور صرف اپنی طعنہ زنی کے خوف سے اس کو نہ کروں تو مجھ سے زیادہ کوئی بد دیانت اور دغاباز اور قوم کا دشمن نہ ہو گا۔ پس میں نے کیا جو میں نے کیا اور لومتہ لائم کا خوف نہیں کیا۔(1)

جس طرف سے اس تجویز کی مخالفت کی ہوا چلی مجھ کو ہرگز یقین نہ تھا کہ اس طرف سے یہ ہوا چلے گی۔ تمام لوگ جو کالج کی محنتوں میں میرے سیکرٹری ہونے کی حالت میں شریک تھے وہ اس وقت بھی شریک رہ سکتے تھے اور مدد کر سکتے تھے جب کہ سید محمود سیکرٹری ہوتے' مگر افسوس کہ مخالفت ہوئی اور ایسی بری طرح پر جس نے نہ اشخاص کو بلکہ قوم کو بدنام کیا۔ مخالفت رائے سے نہ رہی بلکہ عداوت اور ذاتیات تک نوبت پہنچ گئی۔ رسالے چھپے' اخباروں میں آرٹیکل چھپے' انگریزی میں پمفلٹ چھاپ چھاپ کر ہندوستان میں تقسیم ہوئے اور کوئی درجہ مخالفت کا باقی نہیں چھوڑا اور بقول "پایونیر" کے ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ کوئی بڑا کام اتفاق سے کر سکیں۔ ان ہی تحریرات پر قناعت نہیں کی بلکہ ایک گروہ مخالفین کا قائم کیا اور ایک میٹنگ کی اور جائز و ناجائز طریقہ سے اس میں لوگوں کو شریک کیا' اس ناجائز کمیٹی کی روئدادیں چھاپ کر مشتہر کیں اور چند ریزولیوشن پاس کیے۔(2)★

★ مولوی محمد سمیع اللہ خاں' جو مدرستہ العلوم کے بانیوں میں نمایاں مقام رکھتے تھے' اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ نواب وقار الملک کے نام سرسید کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب' جنہوں نے سرسید کے بہترین دوست اور ان کی ذات سے انتہائی مخلص ہونے کے باوجود اس معاملہ میں فریق مخالف سے تعاون کیا' ان کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس موضوع پر اصولی مباحث کے ساتھ انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ ٹرسٹی بل پاس ہو جانے کے بعد نواب صاحب نے اکثریت کی رائے کو قبول کر کے اپنا تعاون جاری رکھنے کی پیشکش کی اور سرسید بھی' جنہوں نے اپنے خطوط میں ان سے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا' پہلی سی محبت و الفت کے اظہار کے ساتھ پھر ان سے مراسلت کرنے لگے اور بالآخر ان کے گزشتہ مخالفانہ رویہ کو فراموش کر دیا۔ آہستہ آہستہ سرسید اپنے حق میں ساز گار فضا کی اس روشنی میں آزادی کے ساتھ ایسے اقدامات کرنے لگے جس سے متعدد ممبروں کو دکھ ہوا مگر وہ ان کی پر اثر شخصیت کے سامنے بے بس تھے۔ چند سال بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سرسید کے قریبی ساتھی بھی ان کی کارروائیوں سے غیر مطمئن دکھائی دینے لگے۔ اندرونی خلفشار اس صورت حال پر جس قسم کی کشمکش نے جنم لینا شروع کیا اس کی ایک جھلک نواب وقار الملک کے نام نواب محسن الملک کے خط میں ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں: "میں جب تک علی گڑھ رہا کالج کے معاملات سے درحقیقت غفلت نہیں

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

تحریک علی گڑھ کے چند ستون: حالی ۔ آرنلڈ ۔ نذیر احمد ۔ محسن الملک ۔ شبلی ۔ وقار الملک

تحریک علی گڑھ کے چند ستون: حالی ۔ آرنلڈ ۔ نذیر احمد ۔ محسن الملک ۔ شبلی ۔ وقار الملک

ایسے وقت میں جو کالج کی تکمیل کے لئے ہر ایک فردِ قوم کو متفق ہو کر کوشش کرنی تھی صرف ایک امر کے سبب سے 'فرض کرو کہ وہ میرا ہی قصور اور میری ہی بد دیانتی اور میری ہی خود غرضی ہو' اس قدر اختلاف کرنا اور اس کو اس قدر طول دینا نہایت افسوس کے قابل ہے۔①

ایک قدرتی ....

اور نیچرل بات ہے کہ اگر مدرسہ کے کاموں کے انجام میں مجھ سے اس قسم کی مخالفت کی جائے خود

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

کی مگر کیا کیجئے کوئی بات نہ چلی اور کسی بات کو سید صاحب نے نہ مانا۔ دو تین مرتبہ تو ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے بھی سخت رنج ہوا اور سید صاحب کو بھی نہایت غصہ آیا اور میں نے ٹرسٹی ہونے سے استعفیٰ دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا' مگر سید صاحب کی ذاتی حالت نے مجھے پھر اس ارادہ سے باز رکھا.......... اگر ان کی یہ خاص حالت نہ ہوتی تو آپ یقین کیجئے کہ میں ایک روز کے واسطے بھی ٹرسٹی رہنا گوارا نہ کرتا۔ ان کی رائے اس درجہ میری رائے کے مخالف ہے کہ گویا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔" (بحوالہ تذکرہ سرسید' ص 362)

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ چند نمایاں شخصیتوں نے مل کر اپنے اختلافات کے اعلانیہ اظہار کا فیصلہ کر لیا۔ نواب وقار الملک اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں۔

"........... ان حالات کو دیکھ کر وہ لوگ 'جن کو قوم کا زیادہ درد تھا' بہت فکر میں پڑ گئے تھے اور باہم سرگوشیاں ہونے لگی تھیں اور بالآخر باوجود سرسید مرحوم و مغفور کے ان اقتدارات اعظم اور عظمت و جلال کے' جس کی دوسری نظیر شاید مدت تک نہ ملے گی' بعض ٹرسٹیوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم کو صرف اپنی قوم کی بہبودی کا خیال مدِ نظر چاہئے اور جناب مرحوم و مغفور کی مروت کو قوم کے مقابلہ میں بالائے طاق رکھنا چاہئے۔ مضامین کا ایک سلسلہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں چھاپنا تجویز ہوا تھا جو گمنام نہ ہوتا بلکہ اس پر ایسے لوگوں کے دستخط ثبت ہوتے جیسے کہ نواب محسن الملک اور شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین حالی اور ایک یہ خاکسار مشتاق حسین اور مجھ کو اس وقت اچھی طرح یاد نہیں رہا غالباً آنریبل حاجی محمد اسماعیل خان بہادر کے دستخطوں کا بھی ان مضامین پر ثبت ہونا تجویز ہو گیا تھا۔ ان مضامین کے ذریعہ سے یہ بات ثابت کرنی مقصود تھی کہ کالج کے قیام سے جو اصل مقصد تھا اب جناب مرحوم و مغفور اپنے ہاتھ سے اس کو برباد کر رہے ہیں' اور ٹرسٹیوں اور قوم کو چاہئے کہ وہ جناب مرحوم کی اس خود مختاری کو روکے اور کالج کو تباہی سے بچائے۔"

"پہلا نمبر اس سلسلہ مضامین کا میں نے اپنے قلم سے لکھا تھا اور نواب محسن الملک بہادر اور شمس العلما مولوی حالی صاحب کی خدمت میں' جو غالباً اس وقت علی گڑھ ہی میں تشریف رکھتے تھے' دستخطوں کے لئے بھیجا گیا تھا کہ دفعتاً جناب مرحوم و مغفور کی رحلت کی خبر پہنچی اور میں نے فوراً نواب محسن الملک کو تار دیا کہ وہ مضمون واپس کر دیں کیونکہ اب ہمارے دلوں میں جناب ممدوح کی خوبیوں اور بے نظیر محمد لوصاف کے سوا اور کوئی خیال باقی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت سے ان مضامین کا سلسلہ ترک کر دیا گیا بلکہ دلوں سے بھی اس شکایت کو نکال دیا گیا۔" (بحوالہ تذکرہ وقار' ص 153 - 154)

میرا شوق اور میری کوشش اس میں باقی نہیں رہ سکتی' اگر میں چاہوں بھی تو مجھ سے نہیں ہو سکتی اور اس کالازمی نتیجہ مدرسہ کی بربادی ہے۔ اگر بدبختی سے امرِ متنازعہ کی طرف مجارٹی ہو جاتی تو یقیناً مجھ کو مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑتا' میرا دل ہی اس کام پر نہ رہتا بلکہ ایسے واقعات پیش آتے کہ مجھ سے مدرسہ کو قائم رکھنا محالات سے ہوتا۔①★

مولوی سمیع اللہ خاں کا استعفیٰ

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب..... اس کے بعد جب وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ خاں صاحب' میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں ہے۔ آپ رئیس ہیں' جب کہیں ملاقات ہوگی میں آپ کی تعظیم کروں گا۔ آپ ممبر کمیٹی کے ہیں' جب اجلاس میں آپ تشریف لائیں گے آپ کا ادب کروں گا لیکن میں آپ سے دوستانہ جو ملاقات تھی وہ راہ و رسم رکھنی نہیں چاہتا۔ پس دوستانہ طریقہ ملاقات و راہ و رسم مجھ سے اور آپ سے نہیں ہے۔ یہ بھی میں نے کہا کہ کمیٹی کی بدنصیبی ہے جو اس کے ایسے ممبر ہیں۔ میں نے ان کو.... کہا کہ آٹھ برس ہوئے کہ آپ کے نام کا بورڈنگ ہاؤس تیار ہو گیا مگر اس کا روپیہ آپ نے اب تک بیباق نہیں کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے' انہوں نے اپنا استعفا بھیج دیا②

مخالف ممبران کے نام میرے حربی چیلنج کا نمونہ

"ہمارے ایک دوست پوچھتے ہیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا کام آپ کی رائے کے مطابق چلے تو کمیٹی مقرر کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے دوست نے نہ کبھی کچھ دیکھا ہے اور نہ سمجھا ہے..... جب کوئی شخص ایک کام قومی فائدہ کے لئے شروع کرتا ہے اور اپنی جان کو محنت میں ڈالتا ہے تو کمیٹی اس واسطے مقرر ہوتی ہے کہ اس کی امداد کرے' اس کی محنت میں شریک ہو' اس کے ارادوں کو تقویت دے تاکہ وہ کام پورا ہو' نہ یہ کہ اس کی رائے سے اور اس کے کام سے مخالفت کر کے اس کام کے پورا ہونے میں خلل انداز ہو"③

★ اسی قسم کے عزم کا اظہار سرسید نے نواب وقار الملک کے نام ایک مکتوب میں کیا۔ انہوں نے لکھا "اگر آپ کا خیال ہو کہ کسی طرح سلسلہ جانشینی سید محمود کو چھوڑ دیا جائے تو اس خیال کو دور کر دیجئے۔ اگر ووٹ کثرت سے برخلاف اس کے فرض کرو' ہوں تو میں مدرسہ کو چھوڑ دوں گا" (خطوط سرسید' ص 130)

دوسری جانب کا ردِ عمل یوں ہوا کہ "باوجودیکہ مسودہ ممبران کمیٹی کے بھرے جلسہ میں مجارٹی کی رو سے پاس ہو گیا مگر ان کی مخالفت رفع نہ ہوئی' چنانچہ مولوی سمیع اللہ خاں اور تقریباً ان کی تمام پارٹی کالج سے بے تعلق ہو گئی" (حالی' حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 290)

"کمیٹیوں کے ناسمجھ اور نادان ممبروں پر "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان" کی مثل صادق آتی ہے۔ ممبر ہوئے اور یہ جانا کہ ہم کو رائے دینا ہمارا فرض ہے مگر اس فرض کو مطلق نہیں سمجھا۔ ان کا فرض یہ تھا کہ اس کام کرنے والے کی مدد کرتے اور اس کے انجام میں شریک ہوتے، نہ یہ کہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا کر اس کام کو برباد کرتے۔ اگر تم میں خود اس کام کو کرنے اور اس کو اپنی رائے کے مطابق انجام دینے کی قابلیت تھی تو تم آج تک کہاں چھپے بیٹھے تھے اور کیوں نہیں اس کام کو خود تم نے شروع کیا؟.... کوئی مثال، چھوٹی یا بڑی، آج تک دنیا میں موجود نہیں ہے کہ وہ بجز اُس شخص کی رائے کے جو اُس کا بانی ہوا ہے اور کسی مداخلت سے انجام پائی ہو۔ بے شک وہ اپنی مدد اور اعانت کے لئے اور لوگوں کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے جو قانونِ قدرت کے مطابق ہے۔ پس جو لوگ اُس کو اور اُس کے کام کو پسند کرتے ہیں وہ شریک ہوں اور جو نہیں پسند کرتے وہ علیحدہ ہو جائیں"[1]

"خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جو کسی کام کا بانی ہوتا ہے وہ ان مشکلات کو اوّل سمجھ لیتا ہے اور ان کی مداخلت پر بھی خوب مستعد ہوتا ہے۔ وہ کام پورا ہو یا برباد ہو جائے یہ خدا کی مرضی ہے مگر وہ اپنے قصدِ مصمم سے ہرگز منحرف نہیں ہوتا۔ اگر کسی میں جان ہو تو جاں بازی کو بھی حاضر ہے اور اگر لُچا پن اختیار کرنا ہو تو جوتی پیزار کو بھی حاضر ہے۔ اگر ہم نے ایک دوست کو لکھا کہ اگر ہماری رائے پر مدرسۃ العلوم نہ چلے تو نہیں چلنے کا، اس میں ہم نے کیا غلط لکھا؟ اور اگر ہم نے یہ لکھا کہ اگر ہم سے اختلافات کیا جاتا ہے تو ہم سکرٹری ہونا چھوڑ دیں گے اور کالج کو ملیامیٹ کر دیں گے تو اس سے ممبروں کو کیوں خوف ہوا اور ہمارے دوست نے کیوں سمجھا کہ ہم ممبروں کو خوف دلاتے ہیں تاکہ وہ ہماری رائے سے نسبت تقرر سید محمود کے اختلاف نہ کریں۔ اگر کسی میں اس بوجھ کے اٹھانے کی اور اس قومی کام کے انجام دینے کی طاقت و لیاقت تھی تو وہ خم ٹھونک کر سامنے آیا ہوتا کہ ہم انجام دیں گے۔ خوف زدہ ہونے کے کیا معنی ہیں؟"[2]

"سن لوا ے دور و نزدیک کے دوستو! سن لوا ے دکن اور اتر کے دوستو! سُن لوا ے پورب اور پچھم کے دوستو! سُن لوا ے آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والو! سُن لو وہ بھی جو مادر زاد بہرے ہیں کہ بے شک یہ کام جو میں نے کیا وہ قومی کام ہے، قوم کی بھلائی اور بہتری کے لئے کیا ہے مگر میں نے کیا ہے اور میں ہی انشاءاللہ انجام تک پہنچاؤں گا۔ اے مخالفو، ہوشیار رہو، رنڈیوں کی طرح کانا پھوسی کرنے اور نہایت بزدلوں کی طرح فرضی اور جھوٹے ناموں سے آرٹیکل چھپوانے سے کام نہیں چلتا۔ خود تمہارا جھوٹ، جو تم نے جھوٹا نام اختیار کرنے سے اپنے اوپر ثابت کیا ہے، خود تم کو شرماتا ہوگا۔ اگر مرد ہو چلو فرانس کی مثل داری میں، اگر سچے ہو اور ایمان داری لو ر

سچائی پر بھروسہ کرتے ہو تو چلو پیرس میں جو دنیا کا فردوس ہے اور ایک آن میں ہماری اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو۔ ان نالائق باتوں اور توتو مَیں مَیں سے کیا فائدہ ہے؟ میں ان لوگوں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو کہتے ہیں کہ ہم علی گڑھ میں رہ کر مدرسے میں فساد ڈالیں گے تاکہ لوگ دیکھیں کہ وہ اور ہم دونوں کوٹھیوں میں رہتے ہیں یا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں۔ خوب سمجھ لو کہ کس درجہ کے نتیجہ تک ہم مستعد ہیں۔ جس مدرسہ کو ہم نے جان بیچ کر بنایا ہے اس کی بربادی بے جان جائے امکان سے خارج ہے۔ آگ کو مت پھونکو، اگر پھونکتے ہو تو اس کے شعلوں کا بھی اندازہ کر لو۔"(۱) ★

یورپین سٹاف کے متعلق اعتراضات

اخراجات کی زیادتی کا سوال

سب سے زیادہ مشکل کام، جو بالفعل کالج میں ہے، وہ یورپین سٹاف کا ولایت سے بلانا اور کالج میں رکھنا ہے...... کالج ان کو اس قدر تنخواہ نہیں دے سکتا جس قدر کہ اسی حیثیت کے یورپین افسروں کو گورنمنٹ سے یا موجودہ ایڈڈ کالجوں سے اسی حیثیت کے پرنسپل یا پروفیسر کو ملتی ہے۔(۲)

ہمارے دوست بعوض اسکے کہ ان مشکلات کے حل کرنے اور اس کا سامان مہیا کرنے پر کوشش

★۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار سرسید نے نواب وقار الملک کے نام ایک خط میں کیا۔ انہوں نے مولوی سمیع اللہ خاں کی نسبت لکھا: "اگر کسی مجلس میں وہ اور میں جمع ہو جائیں گے تو آپ سن لیں گے کہ وہ معاملات پیش آئے جو پاجی سے پاجی اور شہدوں سے شہدوں میں بھی نہیں ہوں، اور کیا عجب ہے کہ دونوں فوجداری کی حوالات میں تشریف لے جائیں۔" (خطوطِ سرسید، ص 130)

۔ سرسید کے ایک انگریز دوست جے کینیڈی سابق کمشنر سرسید کی وفات پر ایک مضمون میں ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "انہوں نے مسلمانوں کو ابھارنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی لیکن جو کچھ انہوں نے کیا اس میں ان کا طریقہ مطلق العنانی کا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ طریقہ مشرقی مزاج کے عین مطابق ہے، میری جوانی کے زمانے میں ایک صوبہ دار سے لے کر چودھری تک ہر حاکم مطلق العنان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک عقلمند اور فیض رساں حاکم تھے اور سب کا خیال رکھتے تھے مگر تحکم پسند اور مطلق العنان طبیعت کے مالک تھے۔ وہ مداخلت برداشت کرتے تھے نہ مخالفت........ آخر عمر میں ان کے مزاج میں چڑچڑاپن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ سے زیادہ مجھے بعض ایسے جھگڑوں میں صلح کرانی پڑی جن میں راستی تمام و کمال سید صاحب کی طرف نہ ہوتی تھی۔ جو انوں کی غلطیوں کو وہ آسانی کے ساتھ معاف کر دیتے تھے مگر اپنے بہت سے پرانے دوستوں سے، جن کے مشوروں کی کبھی ان کے دل میں بڑی قدر تھی، بالکل بگڑ جاتے تھے۔" (تذکرہ سرسید، ص 434)

سرسید کے غیض و غضب کا مذکورہ نمونہ جے کینیڈی کے تجزیہ کی تائید کرتا ہے۔

کریں ان سب مشکلات کا الزام بھی مجھ پر رکھتے ہیں۔ کوئی تو کہتا ہے کہ کالج میں یورپین شاف کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے، 'تعلیم یافتہ بنگالی تھوڑی تنخواہ پر آسکتے ہیں اور بخوبی پڑھا سکتے ہیں اور طالب علموں کو یونیورسٹی کی ڈگریاں پاس کرا دیں گے' اور کیا چاہئے؟ دیکھو فلاں کالج میں صرف بنگالی ہیں 'ایک انگریز نہیں ہے اور کس قدر طالب علم ہر سال ایف اے اور بی اے میں پاس ہوتے ہیں۔ بعض دوست کہتے ہیں کہ نہیں' یورپین شاف کا ہونا ضرور ہے' میں اس کے مخالف نہیں مگر نالائق سیکرٹری نے یورپین شاف کی تنخواہیں زیادہ کر دی ہیں۔ اس سے کم تنخواہ پر یورپین پروفیسر بآسانی مل سکتے ہیں..... میں کہتا ہوں کہ جس اسکیل پر اور جس نتیجہ کی امید پر ہم نے کالج قائم کیا' اگر اس نتیجہ کے حاصل ہونے کی ہم کو امید نہ ہو یا اس نتیجہ کے مخالف آثار قائم ہوں تو کالج کا قائم رکھنا اور ہم کو اس قدر محنت و جانکاہی کا برداشت کرنا محض فضول ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ بغیر عمدہ اور معزز جنٹلمین شاف کے ہم اپنی قوم کو جنٹلمین بنا سکیں۔[1]

ہمارے کالج میں تو ایسے یورپین جنٹلمین افسروں کی ضرورت ہے جو تعلیم سے خود شوق رکھتے ہوں اور ان کے دل میں اس بات کا خود شوق ہو کہ ایک درماندہ قوم کو' جو کسی زمانہ میں علم و فضل میں بھی بلند نام تھی' پستی کی حالت سے نکال کر علم کی ترقی کے درجہ تک پہنچائے۔ بلاشبہ ایسے لوگ ملنے نہایت مشکل ہیں مگر میں نہایت خوشی اور فخر سے کہتا ہوں کہ کُل موجودہ یورپین شاف بھی یہی فیلنگ رکھتا ہے۔[2]

بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی کا مسئلہ

پرنسپل کو بحیثیت پرنسپلی بورڈنگ ہاؤس میں ڈسپلن قائم رکھنے اور قصورات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہوں ان کو دینے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہر ایک امر میں اختلاف کرنے کا ارادہ کر لیا ہے وہ ان صاف صاف باتوں سے بھی اختلاف کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی بجز مسلمان ممبر کے اَور کسی کو نہ دی جائے..... یورپ میں' ایشیا میں' ہندوستان میں' امریکہ میں کہیں کوئی کالج ایسا ہے کہ اس کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس ہو اور پرنسپل کو بورڈروں پر ویسی ہی حکومت نہ ہو جیسی کہ اس کو کالج میں ہو؟ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو جدا سمجھنا ایسا ہے جیسا کہ انسان کو اور اس کی روح کو جدا سمجھنا۔[1]

میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب و نفرت دور ہو' اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بہت بڑی کامیابی ہوئی ہے اور اس کامیابی کا اصل سبب ہمارے کالج کے یورپین افسر ہیں جو بورڈروں

سے پدرانہ شفقت اور دوستانہ محبت رکھتے ہیں۔ کسی دوسرے ضلع کا کوئی افسر جب علی گڑھ میں آجاتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ہمارے ضلع کی تمام لیڈیاں اور یورپین حکام ہمارے کالج کے طالب علموں کے ساتھ اور ہمارے کالج کے طالب علم ان کے ساتھ کیسا سچا اور دوستانہ برتاؤ رکھتے ہیں، کھیلوں میں شریک ہوتے ہیں، ڈنروں میں شریک ہوتے ہیں، بورڈنگ ہاؤس کی ڈنروں میں آتے ہیں، میچ کے دنوں میں ہمارے ضلع کی لیڈیاں طالب علموں کو لنچ دیتی ہیں اور سب لیڈیاں اور یورپین جنٹلمین اور ہمارے طالب علم ایک میز پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور بے تکلف، دوستانہ مگر باادب میل جول رکھتے ہیں تو وُہ حیران ہوجاتا ہے اور علی گڑھ کو ایک نئی دنیا سمجھتا ہے..... ہمارے کالج کے یورپین افسر اور بورڈر آپس میں دوستانہ ملتے ہیں اور صرف ان یورپین افسرانِ کالج کے سبب سے یہ خوبی ہمارے طالب علموں میں اور یہ عزت ہمارے بورڈنگ ہاؤس کو ہوئی ہے، اور میرا وہ مقصد جس پر میں نے کالج کی بنیاد ڈالی ہے کسی قدر حاصل ہوا ہے۔ پس اس باب میں جو مخالفین مخالفت کرتے ہیں اس کی ذرہ بھر بھی وقعت نہیں کر سکتا اور نہ میں بورڈنگ ہاؤس کو اس حالت میں رکھنا چاہتا ہوں جو وہ پسند کرتے ہیں۔ اگر میرا مقصد اس کالج سے حاصل نہ ہو تو کالج کو آج غارت کر دینا اس کے قائم رکھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔[1]

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب سے میرے دوست، بلکہ مسلمانوں کی قوم کے دوست، مسٹر بیک پرنسپل نے اپنی مہربانی سے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اپنے ذمہ لی ہے بورڈنگ ہاؤس کا ایسا عمدہ انتظام ہے کہ کسی وقت میں نہ تھا۔ ہر ایک کام میں ڈسپلن قائم ہو گیا ہے اور اس کے سبب سے طالب علموں میں نماز کی پابندی بہت زیادہ ہو گئی ہے جو کسی زمانہ میں نہ تھی۔[2] ★

★۔ ریٹائرڈ کمشنر جے کینیڈی لکھتے ہیں: "سید صاحب میں کاروباری صلاحیت کا فقدان تھا۔ کالج کے نظما کی مجلس مستقل نظم و ضبط کے معاملات میں مداخلت کرتی تھی اور میں نے سنا ہے کہ اندرونی طور پر کالج میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ مسٹر بیک نے قابل اور ہمدرد انگریز نوجوانوں کا اسٹاف اپنے چاروں طرف جمع کر لیا۔ نظم و ضبط قائم کیا، دفتری نظام درست کیا اور طلبہ کو روزانہ نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر مجبور کیا، اگرچہ جس منشی نے پہلے پہل اس حکم پر عمل کرانے کی کوشش کی تھی طلبہ کا ہجوم اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ مسٹر بیک انگریزوں میں بھی سید صاحب کے سب سے بڑے ترجمان کی حیثیت اختیار کر گئے۔ غرض اس تجربے کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی ابھارنے میں مسٹر بیک نے سید صاحب کی خاص مدد کی۔ اگر کالج کی بنا کا خیال خود سرسید کا ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعد میں اس کی کامیابی سید صاحب کے بعد خاص طور پر مسٹر بیک کی رہینِ منت ہے۔"
(تذکرہ سرسید، ص ۱۳۱)

کالج کے اہم مقاصد

مسلمانوں کو باعتبارِ مذاق اور رائے و فہم انگریز بنانا

اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔ ①☆

آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی نقل میں اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا

ہم اس مدرسۃ العلوم کو محمدن یونیورسٹی یعنی دار العلوم مسلمانی بنانا اور بالکل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹی کی (جس کو ہم دیکھ آئے ہیں) نقل اتارنا چاہتے ہیں۔ ②

کیمبرج اور آکسفورڈ کی دو یونیورسٹیاں ہماری ہدایت کے لئے موجود ہیں، پس ہمیشہ ہم ان کی ہی تقلید اور پیروی سے سلسلہ کتب درسیہ کا مُعیّن کرنا اور اسی طریق پر تعلیم دینا کافی ہو گا۔ ③

آکسفورڈ اور کیمبرج کے قاعدہ کے موافق مدرسۃ العلوم کے قائم ہونے سے طالب علموں کے دلوں میں ایک نئی روح بھر جائے گی اور اعلیٰ درجے کے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف راغب کر لے گی۔ ④

کالج نے اپنے وجود کے بیس سال کے عرصہ میں تعداد طلبہ میں، عمارات میں اور شہرت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ ہم کو اس کی توقع نہ تھی مگر پھر بھی آخری مقصود ابھی بہت دور ہے اور ہم کو توقع نہیں ہے کہ ہماری زندگی میں وہ حاصل ہو اور وہ مقصد ہندوستان میں کیمبرج و آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے نمونے پر ہندوستان کے مسلمانوں کے واسطے اسلامی یونیورسٹی قائم ہو جانا ہے۔ ⑤

مسلمانوں کو ذریعۂ معاش کمانے کے قابل بنانا

اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری خود

☆ اسی قسم کا انداز میکالے نے اپنی تاریخی یادداشت 1835ء میں اختیار کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا: "ہمیں اس وقت بس ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہئے جو ہمارے اور ان کروڑوں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے جن پر ہم اس وقت حکمران ہیں...... ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے [illegible] انگریز" (میکالے کا نظریۂ تعلیم، ص 69)

اپنے قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں[1]

محض ضروری مسائل و عقائد کی دینی تعلیم مہیا کرنا

اس کالج کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا اور مذہبی تعلیم کا صرف بقدر عقائد و مسائل روزمرہ نماز روزے سے ہے[2]

مذہبی تعلیم کالج اور اسکول میں جو دینی قرار پائی ہے اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ مسلمان طالب علم ضروری مسائل عقائدِ مذہبی اور نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' نکاح' وارث' ہبہ اور وصیت سے واقف ہو جائیں۔ مذہبی تعلیم کو اس قدر بڑھانا جس سے تعلیم انگریزی میں ہرج اور مشکل پیش آئے' مقصود نہیں ہے اور اسی لئے ہفتے میں صرف ایک دن مذہبی تعلیم کا ہے۔ اگر کتب مذہبی تعلیم کا سلسلہ عمدہ طرح سے قائم کیا جائے تو اس مدت میں جس قدر میں کہ انگریزی تعلیم ختم ہوتی ہے' مذہبی تعلیم میں بخوبی دست گاہ حاصل ہو سکتی ہے لیکن اگر سلسلہ تعلیم خراب طور پر ہو' جیسا کہ اب ہے' تو بجز اوقات ضائع کرنے کے اور کوئی معتدبہ فائدہ متصور نہیں۔ بعض گرم جوش مذہبی ممبروں نے مذہبی تعلیم کے نتائج امتحان پر کچھ اسکالرشپیں اور خاص مذہبی انعام دینے تجویز کئے تھے مگر چند روز گرم جوشی کے بعد بالکل سرد مہری ہو گئی...... مینجنگ کمیٹی کا نسبت مذہبی تعلیم کے صرف یہ کام ہے کہ تمام بورڈروں کو پانچوں وقت کی نماز پڑھنے پر تاکید رکھتی ہے' چنانچہ سب بورڈر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور جس قدر کہ انہوں نے مذہبی کتابیں پڑھی ہوتی ہیں' ان میں ہر سال امتحان لے کر ہر ایک کے امتحان کے نمبر بتا دیتی ہے جو اکثر افسوس کے لائق ہوتے ہیں[3]★

★ محمد علی جوہر لکھتے ہیں: "علی گڑھ نے بہت سی چیزوں میں مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج پیدا کیا اور مغربی سائنس اور لٹریچر میں اس کی ترقی کے باوجود اس نے اپنا جداگانہ تفخر برقرار رکھا جو اس کے فاضلین کے حق میں ایک مؤثر محرک کے طور پر کارگر ہوتا تھا مگر اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ اس نے انہیں ان کے اعتقادی علم کے معاملہ میں قیمتی ساز و سامان سے آراستہ نہیں کیا۔ وہ کافی ترقی پسند تھے' مسلمان ہونا ان کے لئے وجۂ افتخار تھا مگر افسوس کہ وہ مذہبی معلومات سے کوسوں دور تھے.......... (مذہبی) درسی کتب میں زیادہ تر رسمی طور پر طہارت اور نمازوں کے مسائل ۔۔ ر کر ہوتا تھا یا پھر بڑی جماعتوں کے طلبہ کے لئے اسلام کے چند اہم مسائل متعلقہ شادی' جہیز اور طلاق شامل ہوتے تھے۔ قرآنِ حکیم ہمارے لئے عملی طور پر ایک بند کتاب رہا اور سنت رسولؐ ایک نام سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ کالج کی چند جماعتیں صرف ایک محدود وقت کے لئے حضور اکرمؐ کی حیاتِ مبارکہ کے متعلق ایک ابتدائی قاعدہ پڑھتی تھیں جس کے صفحات بیس سے زائد نہیں تھے.........
ہفتے میں ایک بار مسلم نوجوانوں کو اس گھنٹے میں ان کے مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی جو دوسرے دنوں میں ثانوی زبان

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

ذریعۂ قومی ترقی ...... ہندو مسلم دونوں کے لئے

مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے...... ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پائیں' ساتھ ساتھ یہ دونوں دودھ نہ پئیں' ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پائیں' ایک ہی طرح کے وسائلِ ترقی دونوں کے لئے موجود نہ کئے جائیں ہماری عزت نہیں ہو سکتی۔ مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں میرا یہی مطلب تھا[1]

مجھ کو افسوس ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے......... میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق' جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے' بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں[2]

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

کی تعلیم کے لئے مخصوص تھا' جس کا نتیجہ یہ تھا کہ دینیات کا گھنٹہ تفریح کے گھنٹے سے بھی زیادہ لطف اندوز تھا۔"
...... (مائی لائف اے فریگمنٹ ' ص 22- 23 ترجمہ)

اس کے علاوہ انہوں نے ایک موقع پر علی گڑھ میں اپنے تجربات کو یوں بیان کیا: "افسوس کہ جو تعلیم دینیات ان بچوں کو وہاں دی جاتی تھی' وہ محض ناکافی تھی۔ فقہ میں عبادات کے چند ابتدائی مسائل کے سوا ہمیں وہاں کچھ نہ پڑھایا گیا۔ خدا بھلا کرے مولانا شبلی مرحوم کا کہ کچھ عرصہ تک کالج کی جماعتوں کو ابتدائی نصف گھنٹہ میں کچھ ترجمۃ القرآن سنا دیا جاتا تھا اور ایک مختصر سا رسالہ سیرتِ رسولؐ اور اسلام کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کالج کی جماعتوں کے درس میں داخل تھا اور نہ ہمیں مطالب قرآن سے کوئی واسطہ تھا' نہ حدیثِ نبویؐ سے اور نہ عقائد کے متعلق ہمیں کوئی تعلیم دی جاتی تھی" (اوراقِ گم گشتہ ' ص 591)

محسن الملک بیان کرتے ہیں: "یہاں کی مذہبی تعلیم تعصب سے پاک ہے تفرقہ کو دور کرنے والی ہے' غیر مذہب والوں سے اتحاد اور دوستی رکھنے کی تعلیم دیتی ہے' گورنمنٹ کی اطاعت اور یکی خیر خواہی کو جزوِ اسلام بتاتی ہے۔" (لیکچرز محسن الملک ' ص 470)

اپنی تعلیم پر خود مستعد ہونا

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ' جس میں ہندو و مسلمان سب تعلیم پاتے ہیں' عام پبلک کے فائدے کے لئے اور اس امر کے شائع کرنے کے لئے کہ رعایا کو خود اپنی تعلیم پر مستعد ہونا چاہئے' جو عین خواہش گورنمنٹ کی ہے' قائم کیا گیا ہے۔[1]

مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد پیدا کرنا

اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان دو قالب ہو کر .... شریک رہیں۔[2]☆

مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی برکتوں کا قدر شناس بنانا

ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق و کار آمد رعایا بنانا اور ان کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔[3]❀

☆۔ حالی لکھتے ہیں: "ان کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا اور مقدم مقصد' جو 57ء سے لے کر اخیر دم تک ان کے پیش نظر رہا' یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یکجہتی' میل جول اور اتحاد کو ترقی ہو' اسی لئے انہوں نے یورپین سٹاف کالج کا جزو لاینفک قرار دیا تھا" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 292)

❀۔ کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک موقع پر یہ اعلان ضروری سمجھا کہ "من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیریکٹر کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حقِ امانت سے انحراف کے مترادف ہے۔" (تذکرہ وقار' ص 212)

حالی سرسید کی توصیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وہ اپنی قوم میں وفاداری' اخلاص اور اطاعت کے ہمیشہ کے لئے بیج بو گیا ہے' وہ ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بار آور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری و فرمانبرداری ہے۔" (مقالاتِ حالی' حصہ دوم' ص 48)

بورڈنگ ہاؤس میں خصوصی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرماں برداری' جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے' اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہیں ظاہرا ہندوستان کے کسی انسٹی ٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔" (حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 92)

اسی قسم کے خیالات کا اظہار نواب محسن الملک یوں بیان کرتے ہیں: "ایک بورڈر جو مدرسۃ العلوم کی

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

کالج میں غبن

گیارہ برس میں ایک لاکھ روپے کا تصرف

دفتر مدرستہ العلوم کے ہیڈ کلرک نے بذریعہ جعلی چیکوں کے ایک زرِ خطیر زرِ امانت مدرستہ العلوم میں سے، جو بینک میں جمع تھا، غبن و تصرف کر لیا جس کے سبب سے نقصانِ کثیر زرِ امانت مدرستہ العلوم میں ہو گیا۔[1]

زرِ مجتمع میں اکیاون ہزار روپیہ غبن المال ہوا۔ علاوہ اس کے بیالیس تینتالیس ہزار روپیہ بینک کا فاضل ہو گیا، بس گیارہ برس کے عرصہ میں قریب ایک لاکھ روپیہ کے غبن ہوا۔[2]

وہ جعلی چیکیں وقتاً فوقتاً جاری کر کے روپیہ نکالتا رہا۔[3]

اس قدر مدت تک غبن کا حال نہ دریافت ہونے کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ جو انگریزی حساب بینک سے آتا تھا اس کا مقابلہ اردو حساب سے شام بہاری لال کے ذمہ تھا اور وہ بے ایمانی سے کہہ دیتا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔[4] ★

شام بہاری لال ضلع گورداس پور میں داروغہ جیل خانہ تھا اور تغلب غبن و تصرف از سرکاری اس کو برس یا دو برس کی قید ہوئی تھی۔[5] ●

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

چار دیواری میں قدم رکھتا ہے، اپنے تئیں نئی آب و ہوا اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے، اس کے کانوں میں ہر طرف سے محبت، ہمدردی اور گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی کی آوازیں آتی ہیں۔" (مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک، ص 466)

ایک اور موقع پر اس مدرسہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: "اس کالج تو گویا سرسید نے، اب جبکہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب، شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی مثال ہوں گے تو اس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتیں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔" (ایضاً، ص 486)

★ حالی لکھتے ہیں: "شام بہاری لال جون 83ء سے جولائی 95ء تک ان کے دفتر میں رہا۔ اس عرصہ میں کبھی اس نے یہ نہیں جانا کہ مجھ سے کوئی باز پرس کرنے والا ہے یا نہیں۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 296)

● ۔ حالی لکھتے ہیں: "سرسید نے اس کو ایک اشراف خاندان کا آدمی سمجھ کر اپنے انگریزی دفتر میں ہیڈ کلرک مقرر کر لیا تھا۔ اگرچہ سرسید کو اس کی تقرری کے برس ڈیڑھ برس بعد جتایا گیا کہ یہ پنجاب میں سرکاری ملازم تھا اور وہاں سرکاری روپیہ غبن کرنے کی علت میں سزا بھگت چکا ہے مگر سرسید نے اس خیال سے کہ اول تو اب اس کی تحویل میں کچھ روپیہ نہیں رہتا جس میں غبن کا احتمال ہو، دوسرے اشراف آدمی ایک دفعہ زک اٹھا کر پھر کبھی ایسی خطا نہیں کرتا اس کو بدستور اس کے عہدہ پر بحال رکھا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 295)

ذاتی صدمہ کی کیفیت

چند روز تک تو میری حالت ایسی خراب تھی کہ مجھے کسی بیماری شدید کے لاحق ہونے کا اندیشہ رہا۔ تین روز تک مطلق کھانا کھایا نہیں گیا اور طبیعت کی عجیب کیفیت تھی۔[1]

اس صدمے سے تین چار مہینے تک ایسا حال ہو گیا تھا کہ لوگوں کو یقین تھا کہ میں کسی سخت بیماری میں مبتلا ہو جاؤں گا مگر رفتہ رفتہ وہ حالت بدل گئی اور میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ جو امر واقع ہو گیا، گو کسی سبب سے ہوا ہو، اس پر رنج کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں بلکہ دل کو مضبوط کر کے، جہاں تک ممکن ہے، اس کی تلافی میں کوشش کرنی چاہئے۔[2]

زندگی میں ہی راز کھل جانے پر خدا کا شکر

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شام بہاری لال نے جو تصرف کیا وہ اس خیال سے تھا کہ چونکہ میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور موت کے دن قریب آتے جاتے ہیں، ایک دن میں مر جاؤں گا اور جو کچھ اس نے جعل سازی کی ہے وہ سب تلپٹ ہو جائے گی، مگر خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی ہی میں اس کی جعل سازی اور فریب کھل گیا ورنہ میرے بعد بڑی مشکل پڑتی اور لوگ سمجھتے کہ میں نے ہی روپیہ میں تصرف کیا ہے۔ پس خدا کی مہربانی تھی کہ کہ میرے سامنے ہی یہ راز کھل گیا۔ بعض لوگ اپنی حماقت سے سمجھتے ہیں کہ روپیہ میری تحویل میں اور میرے قبضہ میں تھا حالانکہ یہ امر بالکل غلط ہے۔ قانون ٹرسٹیاں میں حکم ہے کہ روپیہ بینک میں جمع کیا جائے چنانچہ کُل روپیہ بینک میں جمع تھا اور بینک کے خزانے سے بذریعہ جعلی چیکوں کے تصرف ہوا اور جعلی چیکوں کو روکنا، جب تک کہ ان کا حال نہ کھلے، کسی بشر کے اختیار میں نہیں۔[3]

مدرسہ کا کام بدستور چلا جاتا ہے۔ جو کچھ کہ مجھ کو افسوس ہے اس غبن کا ہے جو شام بہاری لال نے کیا جس کا کبھی خیال بھی نہ تھا۔[4]

فکرِ مستقبل

میرے بعد کون؟

میں دن رات اس غم میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے، خصوصاً مجھ سے آدمی کا جس نے بہت بڑا حصہ اپنی زندگی کا طے کر لیا ہے اور کچھ باقی ہے تو بہت قلیل باقی ہے۔ جب میرے کوچ کا وقت آن پہنچے گا تو کون شخص اس تمام کام کو اٹھائے گا اور کون شخص اس کام کو انجام تک پہنچائے گا۔[5]

دوستوں کے پرانے خیالات پر افسوس

ہم نے سنا ہے کہ ہمارے چند دوست ایک جگہ جمع تھے اور قومی ہمدردی کے سبب سے اس بات پر غور کرتے تھے کہ سرسید کے بعد مدرستہ العلوم کا کیا حال ہو گا۔ ایک دوست نے کہا کہ کچھ اندیشے کی بات نہیں ہے۔ تعلیم کی ضرورت پر اب ہر ایک شخص کو یقین ہو گیا ہے اور مدرستہ العلوم اب تیار ہو گیا ہے۔ بنی بنائی چیز کا ہاتھ میں لینا ہر ایک شخص پسند کرے گا۔ آمدنی بھی اس قدر ہے کہ موجودہ حالت قائم رہ سکتی ہے اور سرسید احمد خاں کے مرنے سے اس میں کچھ نقصان نہیں ہو سکتا کیونکہ بظاہر وہ آمدنی مستقل ہے۔ دوسرے دوست نے فرمایا کہ ہاں ' سچ ہے۔ کچھ شک نہیں ہے کہ سید احمد خاں کے بعد 'یعنی ان کے مرجانے پر ' بورڈنگ ہاؤس میں اس قدر اخراجات نہیں ہوں گے اور طالب علم زیادہ آئیں گے۔ کالج و سکول میں بھی سید احمد خاں نے بہت زیادہ خرچ بڑھا رکھا ہے۔ کم تنخواہ کے لوگ مقرر ہو کر بہت تخفیف سے کام چل سکے گا اور ان کے مرجانے پر جو اور چندر کاوٹیں ہیں وہ بھی جاتی رہیں گی۔[1]

افسوس ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہی میل پرانے خیالات ہیں۔ وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے ہی لوگوں سے بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مُردوں کی فاتحوں کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ افسوس کہ ان کو تعلیم کی ابھی قدر نہیں ہوئی۔ تھوڑی تنخواہ کے ٹیچر اور پروفیسر کیا تعلیم دے سکتے ہیں؟ انہوں نے کبھی چار روپوں سے زیادہ تنخواہ کا میاں جی دیکھا ہی نہیں۔ بلاشبہ ایک میاں جی کو پانچ سو اور سات سو روپے ملنا ان کو متعجب کرتا ہو گا۔ اگر ہمارے بعد مدرستہ العلوم کا یہی حال ہونا ہے جس کی دُوراندیشی ہمارے دوست کرتے ہیں تو ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ مدرستہ العلوم کا یہ حال ہو 'ایک شدید بھونچال آئے اور ہمارا پیارا مدرستہ العلوم زمین میں دھنس جائے۔ آمین![2]

وصیت ...... مدرسہ قوم کے ہاتھ سے نہ نکلے

میں اپنے دوستوں کو کئی دفعہ بطور وصیت کے کہہ چکا ہوں کہ میرے بعد مدرستہ العلوم کا جو کچھ حال ہو سو ہو مگر ایسا نہ کرنا کہ قوم کے ہاتھ سے نکل کر اور لوگوں کے قبضہ میں چلا جائے۔ بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔[3]

میری زندگی کا واحد مقصد

عمر کے اس مقام پر یہ محسوس کرتے ہوئے مجھے بڑی راحت ہوتی ہے کہ بہت سالوں سے میرا جو عزم رہا ہے اور جو اب میری زندگی کا واحد مقصد ہے اس نے جہاں ایک جانب میرے ہم وطنوں

کی استعداد کو ابھارا ہے وہاں دوسری طرف انہیں انگریز رعایا سے یکجہتی حاصل ہوئی ہے اور اپنے حاکموں کا تعاون حاصل ہوا ہے۔ نتیجتہً جب میری زندگی کے جو چند سال باقی ہیں ختم ہو جائیں گے اور میں تمہارے درمیان موجود نہیں ہوں گا، کالج پھر بھی دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے گا اور میرے ہم وطنوں کو یہ سکھانے میں کامیاب ہو گا کہ اپنے ملک کے لئے ان کے وہی احساسات ہوں، برطانوی حاکمیت کے لئے وفاداری کے وہی جذبات رکھیں، اس کی برکات کی اسی طرح قدر کریں، انگریز رعایا کے ساتھ دوستی کے اسی خلوص سے کام لیں جو کہ میری زندگی کا مطمع نظر رہا ہے۔ (1)

اے کالج کے طالب علمو تم یقین جانو کہ ہندوستان مین برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے اسکی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی جسکے سایہ عاطفت مین ہم امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہین خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔

میری یہ رائے آج کی نہین ہے بلکہ پچاس ساٹھ برس سے مین اسی رائے پر قایم اور مستقل ہون۔ گورنمنٹ انگریزی اور قوم انگریز مسلمانون کے ساتھ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

اے مسلمانو اگر تم بھی سچے خلوص اور سچی محبت اور سچی وفاداری اور سچی نمک حلالی سے گورنمنٹ انگریزی کے مطیع اور فرمانبردار رہو گے تو خدا نے جو اپنے حاکم کی اطاعت کا فرض تم پر کیا ہے اوسکو بھی ادا کرو گے اور اگر تم اپنے مین اور انگلش قوم مین کچھ دوری سمجھتے ہو اوسکو بھی دور کرو گے۔ کیونکہ سرکار انگریزی کی خیر خواہی جو ہم پر حکومت کرتی ہے سب سے پہلا ہمارا فرض ہے۔

سلطان عبدالعزیز خان مرحوم جب لندن مین آئے تھے تو اون کی دعوت اور مہمانداری کے لئے ایک شاندار محل سجایا گیا تھا۔ مین جب لندن مین گیا تو مین نے اس محل کو دیکھا تھا۔ اوسمین جابجا در و دیوار پر کریسنٹ اور کراس یعنی ہلال اور صلیب کے نشان آپسمین ملے ہوئے بنے تھے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ انگریزون اور مسلمانون کے اتحاد اور اتفاق کی یادگاری کی مبارک علامت ہے۔

اے دوستو۔ یہی نشان مین نے اپنے کالج کے لئے بھی اختیار کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اوس نشان کو اپنے دلون مین بھی نقش کرو گے اور یاد رکھو گے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانون اور انگریزون مین اتحاد ہو اور وہ ایک دوسرے کے اغراض مین یک جان و دو قالب ہو کر جیسا کہ اس نشان مین کریسنٹ اور کراس یکجان و دو قالب ہین شریک ہون گے۔ اور مین خدا سے دعا کرتا ہون کہ میری یہ آرزو پوری ہو۔

روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اجلاس نہم مطبوعہ 1895ء سے سرسید کے خطاب 30 دسمبر 1894ء کا عکس

انجمن سازی

سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۲ء)

یہ سوسائٹی اس مقصد سے قائم ہوئی تھی کہ انگریزی کتابوں کا اردو کتابوں میں ترجمہ کر کے چھاپے اور اس کے اخراجات کے لئے ممبروں سے چندہ لے اور بعوض اس کے جو کتابیں چھاپے بلاقیمت ان کو دے۔(۱)

اس کے ممبروں سے دو روپے مہینہ چندہ لینا ٹھہرا جو ترجمۂ کتب اور ان کے چھاپنے میں صرف ہوتا تھا۔(۲)

دس ہزار کئی سو روپیہ مجھ فقیر نے اپنے پاس سے دیا۔(۳)

چند سال تک یہ سوسائٹی نہایت بارونق رہی اور متعدد کتابیں اس نے ترجمہ کیں اور چھاپیں، اور ایسا انتظام کیا کہ ہر مہینے میں اس عمارت میں نیچرل سائنس پر لیکچر ہوتے تھے اور بذریعہ آلات کے اس کے تجربے دکھائے جاتے تھے۔(۴)

بہ ایں ہمہ ممبروں نے چندہ ادا کرنے میں کوتاہی شروع کی یہاں تک کہ ۱۸۷۷ء میں جب باقیات کا حساب جانچا گیا تو انتیس ہزار روپے سے زیادہ ممبروں پر باقی تھا جن میں سے تین ہزار سے کم بکمال دقت وصول ہوا اور باقی سب ڈوب گیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک انسٹی ٹیوشن کا اس قدر روپیہ ڈوب جائے تو اس کا کیا حال ہو گا؟ سوسائٹی کئی ہزار روپے کی قرض دار ہو

گئی اور کتابوں کے ترجمے اور چھاپنے کا کام بند ہو گیا۔

اس سوسائٹی سے صرف ایک اخبار جاری ہوتا ہے اور اس کا ہال عام جلسوں کے لئے کام میں آتا ہے۔ چونکہ علی گڑھ میں ایک اور بہت بڑا انسٹی ٹیوشن یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہو گیا ہے اور سوسائٹی کا اخبار بطور کالج کی آواز کے کام دیتا ہے اس واسطے ممبران موجودہ نے یہ درخواست کی کہ سوسائٹی کا انتظام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی مینجنگ کمیٹی سے متعلق ہو جائے۔ چنانچہ مینجنگ کمیٹی نے اس درخواست کو منظور کیا اور جب سے اس کا انتظام مینجنگ کمیٹی سے (بشمول آنریری عہدہ داران اور ممبرانِ سوسائٹی کے) تعلق رکھتا ہے۔★

برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے قیام سے متعلق میری تجویز کے الفاظ (۱۸۶۶ء)

ایک بڑی وقت ہندوستان کو جو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی عمل داری میں تھی وہ یہ تھی کہ اکثر بلکہ تمام معاملات ہندوستان کے صرف کورٹ آف ڈائریکٹروں تک پہنچتے تھے اور پارلیمنٹ سے بہت کم تصفیہ پاتے تھے مگر جب سے کہ جناب ملکہ معظمہ کوئین وکٹوریا دامَ اقبالہا نے حکومت ہندوستان کی اپنے قبضۂ اقتدار میں لی اس وقت سے جو زیادہ تر ہندوستان کی بھلائی اور بہتری کی توقع تھی۔ اس کا اصلی منشا صرف اسی بات کی توقع میں تھا کہ اب پارلیمنٹ کو ہندوستان کے امورات میں زیادہ تر مداخلت اور دسترس ہو گی...... جو انگریز ہندوستان میں رہتے ہیں انہوں نے اس بات کی ضرورت سمجھی اور اب وہ اس تدبیر میں ہیں کہ ایک نہایت عمدہ ایسوسی ایشن مجلسِ رعایا کے ذریعہ سے پارلیمنٹ میں اپنا تعلق پیدا کریں اور اس کے فیاض ممبروں کو اپنا حامی بنائیں...... تمہارے دل میں خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری ان باتوں سے ہمارے حکامِ ضلع، جن کے ہاتھ میں ہماری جان اور مال اور عزت ہے، ہم سے ناراض ہو جائیں، گورنمنٹ ہم کو برا اور غیر مطیع نہ سمجھنے لگے اور کہیں گورنمنٹ کے نزدیک ہم مجرم ٹھہریں، مگر یہ سب تمہاری غلطی اور خام خیالی ہے...... ممکن نہیں ہے کہ گورنمنٹ کا کوئی حکم، گو وہ کیسی ہی نیک دلی سے جاری ہو اور خصوصاً ایسی حالت میں جو بلا مشارکت رائے اور بلا مشورہ رعایا کے ہو خلافِ مرضی رعایا کے نہ ہو اور رعایا کو گورنمنٹ کے کسی حکم سے بھی ناراضی نہ ہو۔ پس اگر رعایا اس ناراضی کو چھپائے اور اس کو اعلانیہ گورنمنٹ کے سامنے پیش نہ کرے اور دل میں رنج رکھے اور ظاہر میں ہاتھ جوڑے تو یہ اعلانیہ ثبوت اس بات کا ہے کہ وہ رعیت گورنمنٹ کی خیر خواہ نہیں ہے اور ضرور اپنے

★ سوسائٹی کی بقیہ تفصیلات اس سے قبل باب بعنوان "قومی ہمدردی کے کاموں کا آغاز" میں درج ہو چکی ہیں

اس رنج کے دور کرنے کے لئے اَور کچھ فکر یا کسی توقع میں ہے۔ پس رعیت کا با ادب اور مخلصانہ نیک نیتی سے اپنے تمام رنجوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا اور اپنے تمام حقوق کا نہایت مضبوطی اور استقلال سے اپنی گورنمنٹ سے دعویٰ کرنا ایک بہت بڑا ثبوت خیر خواہی گورنمنٹ کا ہے...... تم اپنے بے ہودہ خیالات اور اوہام کا مطلق ذرمت کرو۔ گورنمنٹ کی طرف سے نیک دل رہو اور اس پر سب طرح کا بھروسہ رکھو اور بے دھڑک اپنی تمام اغراض اور اپنی تمام ناراضیوں کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرو اور اپنے حقوق پر گورنمنٹ سے بخوبی بے دھڑک ہو کر جھگڑو کہ یہ باتیں عین خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی ہیں۔ تم سب بھی آپس میں مل کر ایک ایسوسی ایشن بنانے کی تدبیر کرو جو شمال مغربی اضلاع کی ایسوسی ایشن کہلائے اور اس ایسوسی ایشن کے ساتھ، جو انگلستان میں قائم ہوئی ہے، اپنے مطالب و مقاصد کو گورنمنٹ اور پارلیمنٹ تک پہنچانے کی تدبیر کرو تاکہ آئندہ تم کو پھر حسرت و افسوس نہ رہے۔"(1)

یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے کی ایسوسی ایشن

ہم نے ۱۸۶۸ء میں کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں کو یورپ کے سفر پر آمادہ کرنے والی ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے اور اس کے ممبر دو روپے مہینہ بطور چندہ دیا کریں اور وہ چندہ بطور ایک فنڈ سفر یورپ کے جمع ہوتا رہے اور ایک مناسب تعداد جمع ہو جانے کے بعد اس فنڈ سے لائق ہندوستانیوں کو، ہندو ہوں یا مسلمان، یورپ کے سفر کرنے کے لئے امداد دی جائے...... مگر افسوس ہے کہ اس زمانے میں اس تدبیر میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ ظاہراً اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارے ملک کے ہندو صاحب تو یورپ کے سفر کو مذہب و ذات کے برخلاف سمجھتے تھے اور مسلمان بھی تعصب مذہبی میں گرفتار تھے۔(2)

سید امیر علی کی محمڈن نیشنل کانفرنس میں شرکت سے انکار

جب میں کلکتہ میں تھا تو خود مولوی امیر علی صاحب میرے پاس تشریف لائے اور نہایت دلائل و اصرار سے چاہا کہ میں محمڈن نیشنل کانفرنس میں شریک ہوں مگر میں نے انکار کیا۔ سبب اس کا یہ ہے میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے مقاصد سے متفق نہیں ہوں۔ میری رائے میں مسلمانوں کو کسی قسم کا پولیٹیکل ایجی ٹیشن اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔(3)★

★ سید امیر علی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں: "1877ء میں ہم نے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی تو ہم نے بڑے احترام کے ساتھ ان (سرسید) کی گراں قدر حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔" (امیر علی ص 557)

محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن

ہم نے ایک ایسوسی ایشن کا قائم کرنا تجویز کیا.......... کہ مسلمانوں کے لئے سول (سروس) کے امتحان میں جانے کے لئے ایک فنڈ جمع کریں اور ہر سال ہندوستان سے ایک یا دو مسلمان منتخب کر کے سول سروس کا امتحان دینے کے لئے ولایت روانہ کریں اور اس فنڈ سے ان کے اخراجات کی تائید کریں۔①

یہ ایسوسی ایشن ۱۸۸۳ء میں قائم کی گئی۔②

کمیٹی مدرسۃ العلوم نے کالج میں ایک کلاس از نام (سول سروس اینڈ یورپین ایجوکیشن پریپریٹری کلاس" قائم کیا۔ اس کلاس کی غرض یہ تھی کہ ان طالب علموں کو، جن کے والدین کا ارادہ ان کو تعلیم کی غرض سے آخر کار یورپ میں بھیجنے کا ہے ان کی پہلی تعلیم سے آئندہ تعلیم کے پورا کرنے میں مدد ملے...... مگر افسوس ہے کہ اس کلاس میں کافی تعداد طالب علموں کی بہم نہ پہنچ سکی اور آخر کار وہ کلاس بند ہو گئی۔③

ایسوسی ایشن میں ۲۹۹ ممبر شامل ہوئے اور لوگوں نے کچھ ڈونیشن بھی دیا اور چند روز تک چندہ بھی دیا لیکن پھر سب کے خیالات ست ہو گئے اور تمام کوششیں بھلا دی گئیں۔ چندہ بھی بند ہو گیا اور جیسا کہ اس قسم کی ایسوسی ایشنوں کا، جو ماہواری یا سالانہ چندوں پر قائم ہوتی ہیں، حال ہوتا ہے وہی حال اس ایسوسی ایشن کا بھی ہو گیا۔④

محمڈن ایسوسی ایشن

یہ ایسوسی ایشن ۱۸۸۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس ایسوسی ایشن کے مقاصد حسب ذیل تھے:

۱۔ برٹش سلطنت کی خیر خواہی کے ساتھ مسلمانوں کی دنیاوی حالت کی ترقی اور بہبودی کے لئے کوشش کرنا اور اس کے ہر ایک مناسب ذریعے پر غور کرنا اور بہم پہنچانا۔

۲۔ مسوداتِ قوانین پر، جو لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستان کی بھلائی و بہتری کے لئے پیش ہوتے ہیں، غور کرنا اور بحالتِ ضرورت ان کی نسبت نہایت مؤدبانہ اور خیر خواہانہ طریقے میں گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا۔

۳۔ مسلمانوں کی ضرورتوں اور حقوق کو اور ملک کی بہتری اور ترقی کی تجویزوں کو مؤدبانہ اور خیر خواہانہ طریقے میں گورنمنٹ کے سامنے پیش کرنا۔

۴۔ ایسے امور سے، جو ملک کی بہبودی کے مانع ہوں، گورنمنٹ کو اطلاع دینا۔

..........اس ایسوسی ایشن میں یہ قید تھی کہ کوئی شخص، جو ملازم سرکاری ہے، اس ایسوسی

ایشن کے ممبروں میں داخل نہ کیا جائے۔ جب یہ ایسوسی ایشن قائم ہوئی تو بہت لوگ ممبروں میں داخل ہوئے اور فیاضی سے ڈونیشن بھی دیا اور سالانہ چندہ بھی دینا قبول کیا اور کچھ دنوں تک چندہ دیا مگر بہت ہی جلد اس کا شوق ٹھنڈا ہو گیا اور چندہ دینا بھی بند ہو گیا مگر یہ ایسوسی ایشن برخاست نہیں ہوئی ہے۔[1]

محمڈن ایجوکیشنل کانگرس قائم کرنے کا ابتدائی ریزولیشن (۱۸۸۶ء)

مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لئے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہو گا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے کی خواہش کریں اور اس کا انتظام منظور فرمائیں، منعقد ہوا کرے گا"[2]

محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کو "کانفرنس" بنانے کی قرارداد پر رائے

"مدت سے مجھ کو خیال تھا کہ کانگرس کا لفظ ہماری مجلس کا نام ہونے کے لئے مناسب نہیں ہے۔ کانگرس کا لفظ پولٹیکل مجلسوں کے لئے، جو دو بادشاہوں کے سفیروں اور نائبوں کے باہم ملکی معاملات کی اصلاح یا فیصلہ کے لئے ہوں، زیادہ تر مناسب ہے۔ ہماری مجلس تعلیمی کو ایسے امور سے یا کسی قسم کے پولٹیکل امور سے علاقہ نہیں ہے اور اس لئے بلاشبہ وہ نام اس کے لئے نازیبا تھا.......... اس میں کچھ شک نہیں کہ لفظ "کانگرس" کی بجائے لفظ "کانفرنس" کا قرار دینا نہایت ہی مناسب ہے"[3]

جن لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہو گی میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کی ترقی کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔[4]

کانگرس سے مخالفت اور ہندوؤں کا ردعمل

مسٹر ہیوم نے قیام کانگرس کے وقت مجھ سے [illegible] جواب میں واضح طور پر لکھ دیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں[5] ★

★ – حالی لکھتے ہیں: "نیشنل کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم [illegible] سے ناراض ہو گئے اور انگلستان میں انہوں نے ہندوستان کے ایک [illegible] کہا کہ مجھ کو نیشنل کانگریس کا خیال صرف سید احمد کی کتاب "اسباب [illegible] نہیں جانتا کہ اب اس کو کیا ہو گیا۔" (حیات جاوید، حصہ دوم، ص ۹ [illegible])

جب کہ انڈین نیشنل کانگرس نے اوّل اوّل شور و غل کیا تو میں نے اپنی پبلک اسپیچوں میں اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کو یہ صلاح دی کہ اس کانگرس کی خطرناک اور اس لئے غیر وفادار اور گمراہ کرنے والی اور دھوکہ دینے والی تحریک سے بالکل الگ رہیں [1]

پنجاب کے اہلِ ہنود پہلے عام طور پر میرے نہایت مدّاح اور معتقد تھے مگر بدقسمتی سے چند واقعات ایسے پیش آئے کہ مجھے عام طور پر بعض پولیٹیکل وجوہات سے ہندو قوم کی مخالفت کرنی پڑی اور اس طرح سے عام ہندو میرے مخالف ہو گئے۔ پھر بھی خاص تعلیم یافتہ ہندوؤں کو مجھ سے ہمدردی تھی چنانچہ میرے گزشتہ سفر پنجاب میں ہندو پارٹی کے معزز اراکین نے ایسوسی ایشن کی وساطت سے مجھے ایڈریس بھی دیا مگر بدقسمتی سے نیشنل کانگرس کا معاملہ پیش آگیا جس کے باعث وہ تعلیم یافتہ ہندو بھی یک قلم میرے مخالف ہو گئے اور اس طرح ہندوؤں کی قوم کُلّھم اجمعین میرے خون کی پیاسی ہو گئی [2]☆

☆ خود مسلمانوں میں سرسید کی مخالفانہ تحریک کے توڑ میں علمائے ہند سے رجوع کیا گیا اور ایک استفتا اس انداز میں تیار ہوا کہ اس میں کانگریس سے مخالفت کے ضمن میں سرسید کے افکار و کردار کا تذکرہ اور اس کے مقابلے میں حکومت سے حقوق و مراعات طلب کرنے کے لئے کانگریس سے تعاون کا رنگ جھلکتا تھا۔ سینکڑوں مولویوں نے فتووں پر دستخط کئے جن میں چند نامی علماء کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

مولوی رشید احمد گنگوہی نے لکھا " سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہیے اگرچہ وہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام و مسلمان کو سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا۔" (نصرت الابرار، ص 19)

مولوی محمود حسن مدرسہ اسلامیہ دیوبند نے تحریر کیا: " ہنود سے معاملہ کرنے میں حکم شرعی یہ ہے کہ بشرطِ عدمِ مخالفت و مضرت دینی جائز ہے علی ہذا القیاس فرقہ نیچریہ کے بارے میں، جو کہ منکرِ نصوص قرآنی واحادیثِ نبوی و اجماعِ امت ہے، جو کچھ علمائے معتبرین نے ارشاد فرمایا ہے وہ امرِ حق موافق کتاب و سنت ہے۔" (ایضاً، ص 23)

مولوی محمد عبدالحق مصنف تفسیر حقانی نے بھی ان فتووں پر مہر تصدیق ثبت کی (ایضاً، ص 26)

مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے اپنے جواب میں ذمیوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا: " ہنود زمانہ عند التحقیق ان سب احکام کے مستحق ہیں، خصوصاً اس معاملہ میں انہیں شریک کرنا جس میں رفاہِ عام و نفع انام و حفظِ حقوق و مراعاتِ مخلوق ہو کہ اس میں خاص انہی کا فائدہ نہیں بلکہ اپنا اور تمام اہلِ وطن کا نفع ہے .... رہے حضرات نیچریہ، شرعِ مطہرہ میں ان کے اور تمام مبتدعین کے احکام، جن کی بدعت درجۂ کفر کو پہنچی ہو، احکامِ جمیع اقسام کفار سے اشد و اعظم ہیں .... ہندو کی بات کھلی مخالفت کی بات ہے کہ ہر جاہل سا جاہل اس کے کفر پر مطلع اور اسے اپنے مذہب سے جدا جانتا ہے، یہ حضرات کہ بظاہر کلمہ پڑھتے اور زبانی دعویٰ اسلام رکھتے بلکہ اپنے ہی آپ کو سچا پکا مسلمان و خیر خواہ مومنین و ایمان بتاتے ہیں دام در سبزہ و مار در آستین ہیں۔ ان کا زہر آلود افسوں سیدھے بدبخت پر جلد چلتا اور انجام کار ہلاک کر دیتا ہے۔" (ایضاً، ص 30 - 32)

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام کا ایک ابتدائی اعلان (۱۸۸۸ء)

" کانگریس کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو آوازیں اٹھائی ہیں اس کا تو ہندوستان کے سرکاری افسروں اور عوام کو علم ہے لیکن کانگرس کے حامی غلط طریقے اختیار کر کے انگلستان میں لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے تمام باشندے ہندو اور مسلمان سب کانگرس کے ساتھ ہیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ انگلستان کے لوگوں کو ہم حقیقت سے باخبر کریں کہ مسلمان اور بہت سے با اثر اور صاحبِ اقتدار ہندو بھی کانگرس کے مخالف ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہندو اور مسلمان جو کانگرس کے خلاف ہیں ان کی ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے۔ اس کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہو..... ہندو مسلمانوں کے علاوہ اگر کوئی انگریز ایسوسی ایشن کا ممبر بننا پسند کرے تو ہم اس کی اعانت کے انتہائی ممنون ہوں گے...... ممبری کے خواہاں اصحاب اپنے نام یا تو منشی امتیاز علی یا منشی نول کشور لکھنؤ یا راجہ شیو پرشاد بنارس یا سید ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ الہ آباد یا مسٹر تھیوڈور بیک یا راقم کے نام علی گڑھ بھیج دیں۔"① ★

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے نام میں "یونائیٹڈ" کے اضافہ کا اعلان

"ہندوستان کے تمام اقوام... سکھ، ہندو، اور مسلمانوں کے ذی اثر امور اور ذی مقتدر حضرات انڈین نیشنل کانگرس کے حامیوں کے اغراض و مقاصد کے مخالف ہیں اور ایسوسی ایشن بہ معروف انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا یہ مناسب خیال کیا گیا ہے کہ اس کے نام میں یونائیٹڈ کے لفظ کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ اس سے واضح ہو کہ یہ ایسوسی ایشن ہندوستان کی تمام قوموں کے ارکان کے متحدہ عمل سے تشکیل دی گئی ہے۔"② ❀

★۔ باوجودیکہ اس ایسوسی ایشن میں معروف ہندو اور انگریز بھی شامل تھے سرسید نے مسلمان رہنماؤں کو اس کی رکنیت پر مائل کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا اس کا ایک عکس جامع مسجد دہلی کے امام سید محمد بخاری کے نام ان کے مکتوب محررہ 25 اگست 1888ء میں موجود ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "جو ایسوسی ایشن برخلاف ہندوؤں کے ہم نے قائم کی ہے اس میں تمہارا شریک ہونا نہایت ضرور اور مناسب ہے۔" (مکتوبات سرسید ص 328) اسی خط میں آگے چل کر انہوں نے مکتوب الیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ان کا پیغام مولوی نذیر حسین (محدث) کو بھی پہنچائیں تاکہ وہ مسلمانوں کی بھلائی کے نام پر اس میں شریک ہوں۔

❀۔ سرسید گراہم کے نام ایک مکتوب میں تھیوڈور بیک پرنسپل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "میں نے نام نہاد کانگریس کے خلاف ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی ہے جس کا کام دوسرے کاموں کی نسبت بدرجہا زیادہ ہے اور میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ بیک اس معاملے میں میرے ساتھ بہت زیادہ تعاون کرتے ہیں ورنہ ہمارے لئے اس کام کو آگے بڑھانا نہ صرف انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا۔" (دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خان ص 273)

انڈین لائل ایسوسی ایشن میں شمولیت اور استعفیٰ (۱۸۸۸ء)

راجہ شیو پرشاد بہادر سی ایس آئی نے یہ قرار دیا کہ لکھنؤ میں ایک مستقل سنٹرل ایسوسی ایشن بطور اینٹی کانگرس کے بہ سرپرستی ہزہائی نس مہاراجہ بنارس قائم ہو اور اس کا نام انڈین لائل ایسوسی ایشن رکھا جائے' چونکہ میری رائے یہ ہے کہ جس قدر متعدد اینٹی کانگرس کمیٹیاں قائم ہوں' ہندوؤں یا مسلمانوں کی' ان سے ہماری پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے مقاصد کو مدد پہنچے گی' میں نے اس میں کچھ عذر نہیں کیا اور بخوشی اس کمیٹی کے ممبروں میں اپنا نام شامل کیا اور راجہ صاحب نے اپنی مہربانی سے' باوجود ہمارے عذر کرنے کے' مجھ کو اور راجہ صاحب بھنگا کو اس نئی ایسوسی ایشن کا آنریری سیکرٹری مقرر کیا...... میرے ہاتھ میں اس قدر کام ہیں کہ امکان سے خارج تھا کہ میں اس نئی ایسوسی ایشن کے سیکرٹری ہونے کا بوجھ اٹھا سکتا اس لئے میں نے سیکرٹری منتخب ہونے کی عزت جو مجھے دی گئی تھی اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اس کے ساتھ اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیا۔①

انجمنوں کی بے عملی بمقابلہ انجمنِ حمایتِ اسلام

تمام ہندوستان میں اس قدر انجمنیں اور سوسائٹیاں مختلف ناموں سے اور مختلف کاموں کے لئے مسلمانوں نے قائم کی ہیں کہ شاید کسی اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس سے زیادہ نہ نکلیں گی۔ ان کے بڑے بڑے نام اور عالی عالی مقاصد سن کر انسان متحیر رہ جاتا ہے مگر جب دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے کیا کیا' تو نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے کہ کچھ نہیں۔ تمام انجمنوں نے ...... بجز باتیں بنانے کے اَور کچھ کام نہیں کیا ہے۔ جس قدر کہ ہم زبان سے کہتے ہیں اور جس قدر دلسوزی اور قومی ہمدردی ہم لفظوں میں ظاہر کرتے ہیں اس کا پچاسواں حصہ بھی اگر عمل میں آئے تو قوم کو لازوال فائدے حاصل ہوں۔ میں نے بجز انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے اَور کسی انجمن کی نسبت اب تک نہیں سنا کہ در حقیقت اس نے قومی بھلائی کے لئے کچھ عملی کارروائی کی ہے۔ اگرچہ پوری طرح پر میں واقف نہیں ہوں کہ اس نے بھی کس حد تک عملی کارروائی کی ہے' بہرحال جس چیز کی ہم کو ضرورت ہے وہ عملی طور پر کاموں کے کرنے کی ہے۔②

"سر" کے خطاب کا حصول

تراجم فرامینِ شاہی

(عکس از حیاتِ جاوید)

(اول)

(دستخط) وکٹوریا آر آئی

وکٹوریا مد ظلہ متحدہ گریٹ برٹن و آئرلینڈ - ملکہ حامی دین قیصر ہند فرماں روائے

طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خان بہادر ہمشریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر

ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارک باد آنکہ

چونکہ یہ مدنظر ہوا کہ آپ کو ایک ایسا نشان خسروانہ عطا کیا جائے جس سے وہ قدر منزلت آپ کی نمایاں ہو جو اس سلطنت اور آپ کی ذات اور ان خدمات کے شایاں ہو جو آپ سے اس سلطنت کے لیے ظاہر ہوئیں : لہذا یہ مناسب و زیبا ہے کہ آپ کو اعزاز "نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند" سے ممتاز و سربلند کیا جائے ۔ اسلیے بذریعہ اس تحریر کے آپکو اعزاز نائٹ کمانڈر طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند عطا ہو کر اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ اس اعزاز سے سرفراز و مفتخر ہو کر حقوق جز و کل متعلقہ طبقۂ اعلائے موصوف سے مستفید ہوں ۔

عدالت عالیہ مقام آسبورن بذریعہ مہر طبقۂ موصوف

آج یکم جنوری ۱۸۸۸ء عیسوی اور اکیاونویں سنہ جلوسی کو جاری کیا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

(دوم)

(دستخط) وکٹوریا آر۔ آئی

وکٹوریا مد نلہ متحدہ گریٹ برٹن آئرلینڈ۔ ملکہ حامیِ دین۔ قیصر ہند۔ فرماں روائے

طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند

بنام نامی مولوی سید احمد خان بہادر شریک طبقۂ اعلائے موصوف ممبر کونسل قانونی نواب لفٹنٹ گورنر بہادر

ممالک مغربی و شمالی بہ سلامتی و مبارکباد آنکہ

آپ کو اعزاز طبقۂ اعلائے ستارۂ ہند سے ممتاز و نامور کیا گیا ہے ازانجا کہ ہمکو حسب اختیارات قوانین طبقۂ اعلائے موصوف اختیار حاصل ہے کہ آپ کی حاضری ولایت کی بغرض استفادۂ اعزاز طبقۂ اعلے کے معاف کریں لہذا حسب اختیارات خسروانہ طبقۂ موصوف ہم آپ کو پورے اختیارات پہننے و استعمال کرنے ستارۂ موصوف کی بجانب چپ بالائی پوشاک بیرونی عطا کرتے ہیں۔ اور نیز نشان خاص و بندش متعلقۂ نائٹ کمانڈر موصوف پہنیں اور استعمال کریں۔ اور حسب فحوائے اختیارات مذکور آپکو اختیار دیا جاتا ہے کہ تمامی حقوق جزو کل متعلقۂ طبقۂ نائٹ کمانڈر موصوف مع استعمال ایک نشان خاص نائٹ بیچلر سلطنت موصوف سے مستفید و بہرہ یاب ہوں۔ اور ویسے ہی طریقہ اور مراسم سے متصور ہے جیسا کہ آپ اس نائٹ ہڈ سے۔ ہم سے یا بجائے ہمارے ہمارے نائب سلطنت اور گورنر جنرل ہند سے جو گرینڈ ماسٹر طبقہ موصوف ہیں اعزاز حاصل کرتے۔

عدالت عالیہ مقام آسبورن بذریعۂ مہر طبقۂ موصوف

آج ۱۱۔ فروری ۱۸۸۸ء عیسوی اور ۵۱ سنہ جلوسی کو جاری ہوا

(دستخط) کراس (وزیر ہند)

تصنیف و تالیف

سوچنے والی طبیعت کی رغبت

گو مجھ کو علمی لیاقت کچھ نہیں ہے اور میرا درجہ ایک جاہل آدمی سے شاید ہی کچھ زیادہ ہو لیکن الٹے پن ہی سے سوچنے والی طبیعت تھی۔ جب حیوانی زندگی سے طبیعت نے دوسری طرف پلٹا کھایا تو اس کی کروٹ. بجز مذہبی کروٹ کے اور کیا ہو سکتی تھی؟ اور وہ پہلو. بجز اس پہلو کے جو عام تھا اور جس پر سب کا یقین تھا' اور کیا ہو سکتا تھا؟ مگر سوچنے والی طبیعت ہر دم ساتھ تھی اور وہی تمام انقلابوں کا باعث ہوئی اور اسی نے اس سچائی تک پہنچایا جس کو میں ٹھیٹ اسلام یقین کرتا ہوں' گو کہ رسمی مسلمان اس کو ٹھیٹ کفر سمجھتے ہوں۔ اس عرصہ میں متعدد مذہبی کتابوں کے لکھنے کا اتفاق ہوا جو ہر ایک وقت کے خیالات کے مطابق ہیں۔[1]

میری پچھلی تصنیفات .... اس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتی تھیں جو کہ ایک طالب علم اپنے زمانۂ طالب علمی میں اپنے کچے علم اور کچی زبان میں کچھ لکھتا ہے۔[2] ★

★ حالی لکھتے ہیں: "سرسید کی ابتدائی تحریریں غالباً سید الاخبار میں درج ہونی شروع ہوئی تھیں جس کو ان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے 1836ء یا 1837ء میں اس وقت جاری کیا تھا جب کہ سرسید کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔" (حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 397)

تصانیف کا مختصر تعارف

قواعدِ صرف و نحو زبان اردو (۱۸۴۰ء)

اہالیانِ سرکار کمپنی بہ مقتضائے تکلم الناس علیٰ قدر عقولہم یہ منظور ہوا کہ زبان اردو کو رواج دیجئے اور اچھی طرح عدل و انصاف کیجئے تاکہ ہر کہ و مہ اپنے مطلب کو پہنچے اور مطالب کو سوچے، مگر یہ بات بسبب منضبط نہ ہونے قواعد اس زبان کے بن نہیں پڑتی اور وہ بات ہو نہیں سکتی .... اس واسطے میں نے .... یہ کتاب بطور قواعد صرف و نحو زبان اردو کے بنائی تاکہ ہر شخص اس سے فائدہ مند ہو اور مطلب سرکار کا بآسانی حاصل ہو۔[1]★

جلاءُ القلوب بذکرِ المحبوب (۱۸۴۳ء)

یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب کہ لوگوں کی دیکھا دیکھی مولود کی مجلس کا دل میں بڑا شوق تھا۔ ہر مہینے کی دواز دہم کو لوگ جمع ہوتے تھے۔ سوا لاکھ دفعہ چھوہارے کی گٹھلیوں پر درود پڑھا جاتا تھا اور ختم کے بعد شیرنی بٹتی تھی اور ہم کو لوگ بہت نیک اور محبِ رسولؐ سمجھتے تھے حالانکہ اس زمانہ میں ہم نے نہ رسولؐ کو سمجھا تھا اور نہ رسولؐ کی محبت کو۔ اسی زمانہ میں بہت سے رسالے مولود کے دیکھے، اس وقت کے خیال کے مطابق بھی ان میں ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو ٹھیک نہ تھیں اور بجائے اس کے کہ ان میں آنحضرتؐ کے حالات بیان ہوں وہ رسالے زیادہ تر مرثیہ خوانی یا کتاب خوانی کے، جس کا رواج محرم کی مجلسوں میں ہے، مشابہ تھے۔ اس لئے دل میں آیا تھا کہ ایک مختصر رسالہ، جو بطور بیان حالات اور واقعات کے ہو اور جس میں نامعتبر باتیں نہ ہوں، لکھا جائے مگر اب افسوس ہوتا ہے کہ اسمیں بھی بہت سی نامعتبر بلکہ لغو باتیں ہیں۔ بڑا ماخذ اس رسالہ کا "سرور المحزون" ہے جس کو شاہ ولی اللہ صاحب نے تصنیف کیا تھا اور کچھ باتیں "مدارج النبوت" سے، جس میں ہزاروں لغو نامعتبر کہانیاں مندرج ہیں، لی گئی تھیں۔[2]

بعض بعض اصل رسالہ میں سے کم کر دی گئیں اور جناب استاذی اعلم العلما، افضل الفضلا مولانا محمد نور الحسن صاحب .... کی اصلاح سے صحیح اور درست ہوا۔[3]

جب مذہبی مسائل میں زیادہ تر پختگی ہوئی اور ان عقائد کی جانب میلان ہوا جس کو وہابیت کہتے ہیں تو مجلسِ مولود کو بدعت سمجھا۔[4]

اس زمانہ میں تو اس رسالے کے لکھنے پر بڑا فخر تھا مگر اب اس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ مولود

★ اس کتاب کی اشاعت نہ ہونے کے باعث اہلِ علم ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک اس سے بے خبر رہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری نے اس کے مخطوطہ کی متروک شکستہ عبارت سے اعلیٰ صحت کے ساتھ نقل کا اہتمام کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔

کی نسبت جو خیال اس زمانہ میں تھا اس میں بھی انقلابِ عظیم ہو گیا ہے۔[1]

اس رسالہ میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو حال کے یقین کے بر خلاف ہیں...... معراج کا بیان بھی، جس طرح اس رسالہ میں لکھا ہے، صحیح نہیں ہے۔ جو صحیح ثابت ہوا ہے وہ اس کے بعد کی تصانیف میں مندرج ہے۔ مہرِ نبوت کا ذکر بھی صحیح نہیں ہے۔ راویوں نے اس کے بیان میں غلطی کھائی ہے جس کی تفصیل ہماری کتابوں میں ملے گی۔ آنحضرتؐ کے بہت سے معجزات بھی اس رسالے میں مندرج ہیں جس میں شقِ قمر کا معجزہ بھی شامل ہے جس سے اکثر علماء محققین نے بھی انکار کیا ہے...... باقی جس قدر معجزے اس رسالہ میں بیان ہوئے ہیں وہ میری تحقیق میں حدِ ثبوت کو نہیں پہنچے۔[2]

تسہیل فی جرِ الثقیل (۱۸۴۴ء)

جرِ ثقیل کا علم بہت عجیب و غریب ہے۔ ساری دنیا کے کارخانے اسی پر موقوف ہیں۔ حق یہ ہے کہ اگر یہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا کارخانہ نہ چلتا۔ اور یہ علم بہت تھوڑا ہے۔ کل اصل اصول اس کے پانچ کلیں ہیں اور باقی سب صورتیں ان ہی پانچوں کلوں کے توڑ جوڑ سے نکلتی ہیں۔ اور اس علم میں پہلے پہل ابوذر نامی حکیم مخالیف یمن کے رہنے والے نے عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ بعد اس کے ابو علی نام ایک شخص عالم نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ بطور خلاصہ کے کیا...... میں نے ۱۲۵۹ء ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۸۴۳ عیسوی علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام میں اس رسالہ کے قواعد کا اردو میں ترجمہ کیا اور اپنے استاد جناب مولوی نورالحسن صاحب...... کی اصلاح سے صحیح اور درست کیا اور اس رسالہ کا نام "تسہیل فی جرِ الثقیل" رکھا۔[3]

تحفۂ حسن (۱۸۴۴ء)

شیعوں نے جو خلفائے راشدین کی نسبت جھوٹی جھوٹی باتیں بنائی ہیں وہ سب باتیں ان کے مذہب کا لٹر کا لٹر کا چوچا چوہا نوکِ زبان رکھتا ہے اور عوام ان باتوں کو سن کر حیران ہوتے ہیں اور ڈگمگانے لگتے ہیں، اور جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز نے جو "تحفۂ اثنا عشریہ" لکھی ہے اس سے تحفہ کوئی کتاب ہو نہیں سکتی اور بن نہیں آتی، اس واسطے میں نے اس کتاب کے دسویں باب سے مطاعنِ ابو بکر صدیقؓ کا، جو خلیفہ اول ہیں، صاف صاف اردو زبان میں ترجمہ کیا کہ چھوٹے سے بڑے تک اور جاہل سے عالم تک کو فائدہ پہنچے اور شیعوں کی اوچھی اوچھی باتیں سب کو معلوم رہیں، اور اس ترجمہ کا نام "تحفۂ حسن" رکھا گرچہ ظاہر ہے کہ اس ہیچمدان

کو اتنی کہاں استعداد تھی کہ تحفہ کے ترجمہ کا نام لیتا بلکہ اس کا خیال بھی دل میں لاتا لیکن جناب استاذی اور ملاذی حضرت مولوی نور الحسن صاحب..... نے میرے دل کو تقویت دی اور سب طرح کی ذمہ داری لی' جب میں نے اس پر ہاتھ ڈالا اور ترجمہ کا ارادہ کیا۔ شکر خدا کا' یہ سارا ترجمہ ان کی اصلاح سے درست ہوا اور ان کے ملاحظہ سے گزرا۔①★

فوائد الافکار فی اعمالِ الفرجار (۱۸۴۶ء)

پرکارِ متناسبہ ایک آلہ ہے قدیم اور اس سے اکثر نجوم کے عمل اور ہندسہ کی شکلیں اور حساب کے مسئلے آسانی سے نکلتے تھے چنانچہ بعضی بعضی پچھلی کتابوں اور اگلے حاشیوں میں اس آلہ کا ذکر لکھا ہے لیکن اس سبب سے کہ اس آلہ کا بنانا اور عمل کرنا بہت کٹھن تھا' یہ آلہ ہم لوگوں میں بالکل ناپید ہو گیا یہاں تک کہ یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ پرکارِ متناسبہ کس ہتھیار کا نام ہے۔ جبکہ نانا صاحب مرحوم نے بعض کتابوں میں اس آلہ کا ذکر دیکھا تو اس کے دیکھنے کے نہایت مشتاق ہوئے اور جو لوگ کہ بڑے ریاضی دان مشہور تھے ان سے اس آلہ کا حال پوچھا۔ انہوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور کہا کہ اس آلہ کو نہ ہم نے دیکھا نہ سنا' ہم نہیں جانتے کہ پرکارِ متناسبہ کس جانور کا نام ہے۔ ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۶ء کے ہمارے نانا صاحب مرحوم لکھنؤ میں وارد ہوئے اور جنرل مارٹین صاحب اور مسٹر گوراوزلی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان صاحبوں نے ایک آلہ دکھایا اور کہا کہ اس آلہ سے بہت عمل ہوتے ہیں مگر میرے تئیں دو تین عمل اس کے معلوم ہیں اور باقی عمل مجھ کو کیا بلکہ اکثر صاحبانِ انگریز کو بھی نہیں معلوم۔ چنانچہ ان صاحبوں نے ہمارے نانا صاحب مرحوم کے روبرو تقسیم خط اور وتر اور جیب نکالنے کے عمل کئے اور کہا کہ ہم کو تو صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ تھوڑے دن بعد ہمارے نانا صاحب مرحوم' مسٹر جان بیلی صاحب اور مسٹر لوٹ صاحب کے پاس کلکتہ میں گئے اور وہاں نیلام میں سے ایک کنج پرکاروں کا لیا کہ اس میں یہ آلہ بھی تھا۔ پھر انہوں نے غور اور فکر کی اور سوچ سوچ کر اس آلہ کے اپنی فکر اور ذہن سے سب اعمال نکالے اور جانا کہ پرکارِ متناسبہ یہی آلہ ہے کہ پہلے عرب اور عجم میں رائج تھے' اب صرف انگریزوں اور فرانسیسیوں میں مروج ہے۔ وہ مسودے ایک جگہ پڑے ہوئے تھے اور ان کے سرے پر یہ نام لکھا ہوا تھا کہ فوائد الافکار فی اعمالِ الفرجار۔ میں نے ان مسودوں کو جمع کر کے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور مناسب طور پر مرتب کیا۔②

★ حالی لکھتے ہیں: "اس ترجمہ کے سوا بھی سرسید نے کوئی کتاب یا رسالہ یا آرٹیکل ایسا نہیں لکھا جس سے شیعوں پر اعتراض کرنا یا ان کے اعتراض کا جواب دینا مقصود ہو" (حیات جاوید 'حصہ اول' حاشیہ ص ۹۱)

آثارُ الصنادید (طبع اوّل) (۱۸۴۷ء)

مدّت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ پر بہانہ سے اند کے نجات حاصل ہو جائے اور فلک ناتواں بیں کے پنجہ سے کچھ مہلت ہاتھ آئے تو ایک ایسا نسخۂ عجیب اور مجموعۂ غریب خامہ چابک رقم کی مدد اور فکر آسمان پیر کی اعانت سے لکھا جائے کہ عمارات سواد حضرت شاہ جہاں حرسہ اللہ عن الفساد اور مکانات درونِ شہر اور قلعہ مبارک کا حال اس میں مندرج اور اطوار و اوضاع ساکنینِ شہر کا احوال اس میں مندرج ہو اور بسبب کثرتِ علائق اور ہجومِ عوائق کے یہ امر صورت پذیر نہ ہوتا تھا۔ الحمدللہ والمنۃ کہ کارسازی لطفِ الٰہی دست گیر ہوئی اور مراحم یزدانی نے اعانت کی کہ یہ آرزو پردۂ تقدیر سے بر ہفت حصول سے مزین ہو کر دیدۂ شوق میں جلوہ نما ہوئی اور یہ تمنا حجلۂ غیب سے چہرہ کشا۔ عرصہ دراز تک آرام کو آرام نہ سمجھا اور آسائش کو آسائش نہ جانا جب یہ شاہد جادو طراز جلوہ شیریں لبان سحر پرداز سے دلربا تر ہوا[1]

قطب صاحب کی لاٹ کے بعضے کتبے، جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جاسکتے تھے، ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوالیا جاتا تھا اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرطِ محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا[2]★

آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انہوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیئے تھے[3]✱

★۔ حالی لکھتے ہیں: "سرسید ہمیشہ تعطیلوں میں عماراتِ بیرونِ شہر کی تحقیقات کے لئے شہر سے باہر جاتے تھے اور جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو رات کو بھی اکثر باہر رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی مرحوم ہوتے تھے۔" (حیاتِ جاوید، جلد اول، ص 54)

✱ حالی نے بھی اس بات کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "آثار الصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی پائی جاتی ہے وہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے، مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص 351)

سرسید کے ہم عصر مولانا عبدالحق حقانی مؤلف تفسیرِ حقانی لکھتے ہیں: "دراصل آثار الصنادید سید صاحب کی تالیف کردہ کتاب نہیں بلکہ مرزا سنگین بیگ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے مرزا بخشی محمود کے پوتے، نے بحکم سرجان چارلس مٹکاف ایک کتاب موسوم بہ "سیر المنازل" لکھی جو دراصل فارسی میں ہے جس کو میں نے قلعہ کے عجائب خانہ میں داخل کر دیا ہے۔ جس کا دل چاہے جا کر دیکھ لے اور آثار الصنادید سے مقابلہ کرے۔ حضراتِ دہلی کے حالات، جو کہ آخر کتاب آثار الصنادید میں مذکور ہیں، یہ سید صاحب کی ذاتی تحقیق ہے۔" (تفسیرِ حقانی، جلد دوم، ص 112)

قولِ متین فی ابطالِ حرکتِ زمین (۱۸۴۸ء)

ہم نے ایک رسالہ لکھا تھا جس کا نام "قولِ متین فی ابطالِ حرکتِ زمین" اور فخر کرتے تھے کہ نہایت خوبی سے ہم نے حرکتِ زمین کا ابطال کیا ہے، مگر جب غور کیا تو سمجھے کہ

"خود غلط بود آں چہ ما پنداشتیم"[۱]

کلمۃُ الحق (۱۸۴۹ء)

یہ کلمۃ الحق بے اختیار پیری مریدی کے بیان میں ہماری زبان سے نکلا ہے۔[۲]

راہِ سُنت در ردِّ بدعت (۱۸۵۰ء)

یہ رسالہ "راہِ سنت" اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جبکہ وہابیت کا نہایت زور و شور سے دل پر اثر چھایا ہوا تھا۔ اگرچہ اس رسالے کی طرز تقریر و بیان میں کچھ فرق ہو مگر در اصل یہ رسالہ جناب مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے ایک رسالہ مسمّٰی بہ "احقاق الحق الصریح فی احوال الموتیٰ و الضریح" سے ماخوذ ہے .... یہ رسالہ دو قسموں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جو عقائدِ عبادت سے علاقہ رکھتی ہے جس کو اب میں مذہب کہتا ہوں۔ دوسری جو عادت سے، اور اَور باتوں سے جو دنیاوی امور سے متعلق ہیں، علاقہ رکھتی ہے جیسے کھانا، پینا، پہننا، معاملہ کرنا وغیرہ امورِ تمدن و معاشرت۔ پس جو کچھ میں نے عقائد و عبادت کی نسبت لکھا ہے اس کو اب بھی میں ویسا ہی برحق سمجھتا ہوں جیسا کہ جب سمجھتا تھا۔ باقی امورِ معاشرت و تمدن کو جو میں نے مذہب میں شامل کر دیا ہے، اس کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ بڑی غلطی جانتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائے تعلیم سے یہ خیال جما ہوا تھا کہ مذہب دین و دنیا دونوں سے علاقہ رکھتا ہے، اور جب یہ رسالہ لکھا اس وقت بھی یہی خیال تھا پس دین و دنیا دونوں کی باتیں اس میں ملا دیں۔ بہت غوروں اور فکروں اور اونچ نیچ سمجھنے اور خدا اور خدا کے رسول کے احکام پر خوب فکر کرنے کے بعد دونوں میں تفرقہ معلوم ہوا ہے اور یہ غلطی، جو اس رسالے میں ہوئی ہے، کھلی ہے۔ میں نہایت خوشی سے اقرار کرتا ہوں اور یقین جانتا ہوں کہ دینی اور دنیاوی امور میں تفرقہ نہ کرنا اور دونوں کو برابر مذہبی احکام سمجھنا در حقیقت ایک بڑی غلطی ہے۔[۳]

سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء)

جس زمانہ میں صاحب والا مناقب، عالی مناصب، عدالت گستر، رعیت پرور مسٹر آرتھر آسٹن رابرٹسن صاحب بہادر...... صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں آباد نے کتاب آثار الصنادید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا اور اس کی نہایت صحت کی تاکید فرمائی تو بسبب اختلاف

کتب تواریخ اور غلطی کاتبوں کے ہر امر کی صحت میں کمال دقت اور نہایت کلفت ہوتی تھی اور بسبب نہ مرتب ہونے سلسلہ حکومت بادشاہوں اور راجوں کے اس کتاب کی صحت نہ ہو سکتی تھی کیوں کہ اس کتاب میں اگلے بادشاہوں اور امیروں اور راجاؤں کی بنائی ہوئی عمارتوں کا حال ہے۔ پھر جب تک ان بادشاہوں اور راجاؤں کا حال بصحت معلوم نہ ہو اس وقت تک اس کتاب کی صحت کیونکر ہو؟ اس واسطے میں نے دہلی کے راجاؤں اور بادشاہوں کی فہرست بنائی جس میں پانچ ہزار برس کے راجاؤں اور بادشاہوں کا حال تھا۔ اتفاق سے وہ فہرست صاحب ممدوح ملاحظہ سے گزری اور پسند طبع عالی ہوئی۔ اسی سبب سے میں نے خیال کیا کہ اگر وہ فہرست بطریق اسلوب مرتب ہو جائے اور ایک کتاب بن جائے تو نہایت مفید ہوگی اور یہ مختصر کتاب وہ فائدہ دے گی جو بڑی بڑی کتابوں سے بھی حاصل نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے اس ارادہ کو پورا کیا اور رفتہ رفتہ وہ فہرست ایک کتاب بن گئی اور "سلسلۃ الملوک" اس کا نام رکھا۔(۱)

ہم نے اس تاریخ کے لکھنے میں وہ سعی اور کوشش کی ہے کہ ہماری دانست میں اس سے زیادہ صحت متصور نہیں۔(۲)

نمیقہ در بیان مسئلۂ تصورِ شیخ (۱۸۵۲ء)

میں نے اسے شاہ احمد سعید صاحب کو دکھایا تھا۔ انہوں نے اس کو دیکھ کر یہ فرمایا کہ جو باتیں اس میں لکھی گئی ہیں وہ اہلِ حال کے سوا کوئی نہیں لکھ سکتا۔ بس یہ اس توجہ کی برکت ہے جو شاہ صاحب★ کو تمہارے ساتھ تھی اور اب تک ہے۔(۳)

ترجمہ کیمیائے سعادت (۱۸۵۳ء)

دل چاہتا تھا کہ ایسی کتاب اردو زبان میں لکھی جائے جس سے نفس کو 'تہذیب اور اخلاق کو آراستگی' دل کو نرمی' ایمان کو مضبوطی حاصل ہو لیکن مکروہاتِ زمانہ سے یہ بات لیت و لعل میں پڑی تھی۔ اتفاقاً ۱۲۷۰ء ہجری میں حاجی محمد امداد اللہ صاحب دہلی میں تشریف لائے اور انہوں نے کیمیائے سعادت کے ترجمے کو فرمایا۔ اگرچہ دل میں شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ اگر اس قسم کا کام کسی بادشاہ 'امیر' وزیر کی فرمائش سے کیا جاتا تو روپے ہاتھ لگتے 'ان درویشوں کی فرمائش سے محنت میں پڑنا کیا فائدہ؟ اگر اچھے ہیں تو اپنے لئے ہیں' ہم کو کیا؟ مگر پھر خیال میں آیا کہ بزرگوں کی دعا بھی کافی ہے۔ آؤ' ہم ان کے ارشاد بموجب ترجمہ میں محنت کریں اور وہ ہم کو دعائیں دیں۔ الحمد للہ کہ ان کے ارشاد کی برکت نے اس سے بھی بڑھ کر کام کیا کہ جب میں نے اس

★ شاہ غلام علی صاحب

کتاب کے ترجمہ کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل سے بدلے کی طمع کو مٹا دیا اور اس محنت کو خالص مخلص اپنے لئے کیا۔[1]

آثار الصنادید (طبع دوم) ۱۸۵۴ء

۱۲۶۳ ہجری مطابق ۱۸۴۶ عیسوی کے میں نے ایک کتاب ضلع دہلی کے مکانات کے حال میں لکھ کر چھاپی تھی۔ اسی زمانہ میں جناب مسٹر آرتھر آسٹن رابرٹس صاحب بہادر صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ شاہ جہاں آباد ولایت انگلستان کو تشریف فرما ہوئے اور اس کتاب کو لے جا کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں پیش کیا۔ ممبران سوسائٹی نے اس کتاب کو نہایت پسند کیا۔ ان میں سے جناب عالی کرنل سیکس صاحب بہادر شریک محکمہ عالیہ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے صاحب ممدوح کو فرمایا کہ اگر اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہو تو بہت بہتر ہے۔ جبکہ صاحب موصوف ولایت سے ہو کر پھر دہلی میں تشریف لائے تو انہوں نے اس خاکسار کی شرکت سے اس کتاب کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ✪ اس وقت یہ بات دل میں آئی کہ اگر از سرِ نو یہ کتاب بہت اچھی طرح سے مرتب کی جائے اور جو خرابیاں کہ پہلی کتاب میں ہو گئی ہیں' وہ سب درست کی جائیں تو بہت اچھی بات ہے۔ الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے اس آرزو کو پورا کیا اور جس طرح کہ دل چاہتا تھا اسی طرح یہ کتاب پوری ہوئی۔ پہلی کتاب سے یہ کتاب بہت باتوں میں اچھی ہے۔[2]

تاریخ ضلع بجنور (غیر مطبوعہ) ۱۸۵۷ء

اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے سوا کوئی عام دلچسپی کی بات نہ تھی مگر اثنائے تحقیقات میں بعض قانون گویوں کے پاس اکبر اور عالم گیر کے زمانہ کے ایسے کاغذات ملے جس سے نہایت عمدہ نتیجے نکلتے تھے[3]

(یہ تاریخ) پوری ہو گئی تھی مگر غدر میں گم ہو گئی۔[4] ✱

✪ ۔ حالی لکھتے ہیں: "ابھی بہت کچھ ترجمہ کرنا باقی تھا کہ مسٹر رابرٹس کی دلی سے تبدیلی ہو گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ وہ ترجمہ پورا ہوا یا نہیں اور کسی نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا یا نہیں لیکن فرانس کے مشہور او رینٹلسٹ موسو گارساں دتاسی نے 1861ء میں اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کر کے مشتہر کیا جس کی ایک جلد سرسید کو بھی بھیجی تھی۔ اسی ترجمہ کو دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو سوسائٹی مذکور کا آنریری فیلو مقرر کیا تھا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول ص 57)

✱ ۔ سرکاری رپورٹ نمبر 56 مورخہ 5 جون 1858ء امام کمشنر روہیل کھنڈ میں الیگزینڈر شیکسپیر کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور لکھتے ہیں کہ سرسید نے "ضلع بجنور کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی تھی کہ جو چند روز پہلے غدر سے ہم نے یہ کتاب گورنمنٹ کی خدمت میں بھیجی تھی...... [illegible] غدر کے تلف ہو گئی۔" ([illegible] آف انڈیا' حصہ اول ص 24)

سرکشی ضلع بجنور (۱۸۵۸ء)

طرف داری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کا وبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے بہت سا اس میں میری آنکھوں کا دیکھا اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت ہی سچ لکھا ہے۔[۱]

اسباب سرکشی ہندوستان (۱۸۵۹ء)

ہنوز سیاست ہائے ایامِ غدر جاری تھیں کہ میں نے ایک رسالہ قوم کی بے گناہی کا لکھا جو "کازز آف انڈین ریولٹ" کے نام سے موسوم ہے۔ میں بیان کرنا نہیں چاہتا کہ وہ کیا وقت تھا اور میرے دوست کیا یقین کرتے تھے کہ اس جوشِ قومی ہمدردی سے، جس کو میں خود دیوانہ پن کہہ سکتا ہوں، مجھ پر کیا گزرنے والا تھا۔ یہ میرا سبق قومی ہمدردی کا تھا۔ میرے غم خوار مجھ کو اس سے مانع آتے تھے اور میرا دل ان سے یہ کہتا تھا ۔

حریف کاوشِ مژگانِ خوں ریزم نہ ناصح
بدست آور رگِ جانی ونشتر را تماشا کن[۲]

بہت بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو۔[۳]

اس سبب سے کہ میں بھی ہندوستان کا باشندہ ہوں میں نے خیال کیا تھا کہ جو غلط خیال ہمارے، حاکموں کے دلوں میں اس خراب زمانہ کی نسبت جم گئے تھے ان کو مٹاؤں اور سچے واقعات ظاہر کروں۔ گورنمنٹ کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ سچے واقعات ظاہر کئے جائیں۔[۴]

سرکشی ہندوستان کے جواب مضمون میں...... میں نے اصلی اسباب بغاوتِ ہندوستان کے بیان کئے تھے۔[۵]

...... ولایت میں سرجان کے 'فارن سیکرٹری وزیرِ ہند' سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی تو ان کے میز پر ایک دفتر کاغذات کا موجود تھا۔ انہوں نے ہنس کر کہا کہ تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے؟ یہ تمہارا رسالہ اسبابِ بغاوت اصل اور اس کا انگریزی ترجمہ ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام مباحثات ہیں جو اس پر پارلیمنٹ میں ہوئے، مگر چونکہ وہ تمام مباحثے کانفیڈنشل تھے اس لئے وہ نہ چھپے اور

نہ ان کا ولایت کے کسی اخبار میں تذکرہ ہوا۔☆(۱)

لائل محمڈنز آف انڈیا (رسالہ خیر خواہانِ مسلمانان) ۶۱۔ ۱۸۶۰ء

۱۸۵۷ء '۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی آب و ہوا ایسی بگڑ گئی تھی کہ ہر ایک شخص کے دل میں میں ایک غلط خیال ایسا مستحکم ہو جاتا تھا کہ وہ اسی کو سچ سمجھتا تھا حالانکہ اس کی کچھ بھی اصل نہ ہوتی

☆۔ حالی لکھتے ہیں: "گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کیننگ گورنر جنرل اور سر بارٹلر فریئر نے جو کونسل میں ممبر تھے 'اس مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا مگر مسٹر سسل بیڈن نے 'جو اس وقت فارن سیکرٹری تھے 'اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہئے اور جواب لینا چاہئے ' اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہئے ' لیکن چونکہ اَور کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا اس لئے ان کی اسپیچ سے کوئی مضر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔"

"لارڈ کیننگ نے فرخ آباد میں دربار کیا اور سر سید بھی اس دربار میں بلائے گئے تو وہاں ایک موقع پر مسٹر سسل بیڈن فارن سیکرٹری گورنمنٹ انڈیا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ سید احمد خاں یہی شخص ہے اور اسی نے اسباب بغاوت پر وہ مضمون لکھا ہے تو سر سید سے دوسرے روز علیحدہ مل کر اپنی نہایت رنجش ظاہر کی اور بہت دیر تک تلخ گفتگو ہوتی رہی۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم گورنمنٹ کی خیر خواہی کے لئے یہ مضمون لکھتے تو ہرگز اس کو چھپوا کر ملک میں شائع نہ کرتے بلکہ صرف گورنمنٹ پر اپنے یا رعایا کے خیالات ظاہر کرتے "۔ سر سید نے کہا "میں نے اس کتاب کی کل پانچ سو جلدیں چھپوائی تھیں جن میں سے چند جلدیں میرے پاس موجود ہیں اور ایک گورنمنٹ میں بھیجی ہے اور کچھ کم پانچ سو جلدیں ولایت روانہ کی ہیں جن کی رسید میرے پاس موجود ہے۔ میں جانتا تھا کہ آج کل بسبب غیظ و غضب کے حاکموں کی رائے صائب نہیں رہی اور اس لئے وہ سیدھی باتوں کو بھی الٹی سمجھتے ہیں اس لئے جس طرح میں نے اس کو ہندوستان میں شائع نہیں کیا اسی طرح انگریزوں کو بھی نہیں دکھایا ' صرف ایک کتاب گورنمنٹ میں بھیجی ہے۔ اگر اس کے سوا ایک جلد بھی کہیں ہندوستان میں مل جائے تو میں فی جلد ایک ہزار روپیہ دوں گا۔ مسٹر بیڈن کو اس بات کا یقین نہ آیا اور انہوں نے کئی بار سر سید سے پوچھا کہ کیا فی الواقع اس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں شائع نہیں ہوا؟ جب ان کا اطمینان ہو گیا 'پھر انہوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا اور اس کے بعد ہمیشہ سر سید کے دوست اور حامی و مددگار رہے۔ "

"اس کتاب کے سرکاری طور پر متعدد ترجمے ہوئے۔ انڈیا آفس میں اس کا ترجمہ ہوا اور اس پر متعدد دفعہ بحثیں ہوئیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں بھی اس کا ترجمہ کرایا گیا۔ پارلیمنٹ کے بعض ممبروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا مگر کوئی ترجمہ پبلک میں شائع نہیں کیا گیا۔ لیکن اسی زمانے میں ایک مدبر حاکم نے اشاعت کی نظر سے اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا تھا جس کو کرنل گراہم نے 'جو سر سید کے بڑے دوست ہیں' پورا کیا اور 1873ء میں چھپ کر شائع ہوا۔" (حیاتِ جاوید 'حصہ اول 'ص 89- 91)

تھی۔ اسی آب و ہوا کا اثر تھا کہ اکثر متکلمین اور مصنفینِ کتب بغاوت نے ایک شور بے اصل باتوں کا مسلمانوں کی نسبت مچا دیا۔[1]

کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانہ میں ہوئی ہو' گو وہ رام دین اور ماتا دین ہی نے کی ہو' اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ کوئی بلا آسمان پر سے نہیں چلی جو اس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا۔

ہر بلائے کز آسماں آید
گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ می پرسد
خانہ مُسلمی کجا باشد[2]

ان دنوں میں جو میری نگاہ سے انگریزی اخبار کثرت سے گزرے اور جو کتابیں اس ہنگامہ کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں۔ ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بد ذات کوئی نہیں مگر مسلمان' مسلمان! کوئی کانٹوں دار درخت اس زمانہ میں نہیں اگا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بولہ نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا' مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا ایسا اور کوئی ہو جس نے خالص سرکار کی خیر خواہی میں اپنی جان' مال' عزت' آبرو کھوئی ہو۔ زبانی بات چیت کی خیر خواہیاں ملا دینے اور جھوٹے سچے ایک دو پرچے لکھ بھیجنے بہت آسان ہیں۔ مسلمانوں کے سوا وہ کون شخص ہے جس نے صرف سرکار کی خیر خواہی میں اپنی اور اپنے کنبہ کی جان دی اور ہر وقت ہاتھ' پاؤں' دل و جان سے جاں نثاری کو حاضر رہا۔[3]★

ایک بڑا الزام جو ان لوگوں نے مسلمانوں کی طرف نہایت بے جا لگایا وہ مسئلہ جہاد کا ہے حالانکہ کجا جہاد اور کجا بغاوت' بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔[4]

★۔ حالی لکھتے ہیں: "راجہ جے کشن صاحب سی ایس آئی کی جو آخر کو سرسید کے نہایت گہرے دوست ہو گئے' اس وقت تک ان سے ملاقات نہ تھی' ان کا بیان ہے کہ جب سرسید نے رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سید احمد خاں نہایت متعصب آدمی ہیں اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے۔ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ ان ہی دنوں میں میرا مراد آباد جانا ہوا...... جہاں سرسید سے مڈبھیڑ ہو گئی میں نے ان فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے معذرت کی اور اپنی قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔" (حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 104)

اسی زمانہ میں مَیں نے چند رسالے لکھے اور مشتہر کیے جو لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے مشہور ہیں۔[1]

رسالہ خیر خواہ مسلمانان میں چند مسلمانوں کا ذکر کیا جنھوں نے ہماری گورنمنٹ کی خیر خواہی اور خدمت گزاری سے سرخ روئی حاصل کی۔[2]

جو لوگ انصاف دوست ہیں وہ خیال کریں گے کہ ان حالات اور واقعات کی تحریر میں مَیں نے کسی جگہ انصاف کو ہاتھ سے (جانے) نہیں دیا۔ جس کسی مسلمان کی خیر خواہی کا ذکر لکھا ہے اس کے ساتھ بجنسہٖ حکامِ متعہد کی رپورٹیں، جو اُن کے حق میں ہوئیں اور سرٹیفکیٹ، جو اُن کو دیئے، اور گورنمنٹ سے جو انعام و اکرام ان کو ملے وہ سب لفظ بلفظ اس میں مندرج ہیں۔[3]

تصحیح تاریخِ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء)

تاریخِ فیروز شاہی ضیا برنی بہت کمیاب کتاب ہے۔ بہت تلاش کے اور تجسس سے مجھ کو ایک نسخہ بہم پہنچا تھا۔ اس کے مقابلہ اور صحت میں مجھ کو بہت دقت اٹھانی پڑی۔ ایک ناقص نسخہ کتب خانہ شاہِ دہلی سے مجھے میسر ہوا تھا، اور ایک نسخہ جو مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے بہم پہنچایا تھا وہ میں نے لے لیا، اور ایک نسخہ ایڈورڈ طامس صاحب بہادر کے پاس تھا وہ بھی میں نے لے لیا، اور ایک نسخہ بنارس سے ہاتھ آیا۔ ان چار نسخوں سے میں نے اپنی کتاب کا مقابلہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس کے صحیح کرنے پر کوشش کی...... ہماری ایشیاٹک سوسائٹی نے اس نایاب اور عمدہ کتاب کا چھاپنا چاہا اور میری کتاب اور میری صحت اور مقابلہ سے یہ کتاب چھپی۔[4]

تبیینُ الکلام فی تفسیرِ التوراۃِ والاِنجیل (۶۵-۱۸۶۲ء)

کسی مسلمان نے آج تک بائبل مقدس کی تفسیر نہیں لکھی۔ خواہ کچھ ہی وجوہ ہوں جن کی وجہ سے ہمارے آباؤ اجداد نے اس کام کو نہیں اٹھایا مگر جو امر کہ موجودہ زمانے کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس کام سے مانع رہا ہے اور بہت کچھ مانع ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان عیسائی مذہب کی کتابوں کو ہمیشہ ایک بیکار اور لغو اور جھوٹے قصوں کا مجموعہ سمجھتے اور یقین کرتے رہے ہیں اور ان کے اس معتقد یقین کو اکثر اوقات بعض پادریوں کی ناعاقبت اندیشی اور بے سمجھی کے دلائل سے بہت قوت اور مدد ملی ہے۔ ان دلائل سے بجز اس کے کہ جانبین میں ناپسندیدہ جھگڑا اور تعصب اور مخالفت اور دشمنی پیدا ہو اور دونوں کے دل برے ہوں اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا...... جب کہ فریقین کی یہ حالت ہو تو آپ بآسانی خیال کر سکتے ہیں اور نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی تصنیف کرے جس کا مقصد انجیلِ مقدس کی تفسیر لکھنا، اس کی تائید کرنا اور اس کو آسانی

کتاب مانتا ہو تو اس کی حالت اور منزلت اس کے ہم مذہب لوگوں میں کیا ہوگی۔ بلاشبہ اس سے سب لوگ متنفر ہوں گے اور اس کو برا کہیں گے۔ یہی حالت میری ہوئی۔ اس کام کے شروع میں میرے ساتھ یہی برتاؤ ہوا مگر میں نے ان کی بے جا تضحیک' بے بنیاد دھمکیوں اور اسی قسم کی زیادتیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اس بات کے کہنے میں' جس کو میں حق سمجھتا تھا' کسی چیز سے اندیشہ نہیں کیا ——————— جو انعام کہ مجھ کو عیسائیوں سے میرے کام کے آغاز میں ملا وہ بھی اس سے کم نہ تھا جو میرے ہم مذہبوں نے مجھ کو دیا۔ مگر میری تفسیر کا اول حصہ چھپنے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ جو کچھ میں انجیل کی تائید میں لکھتا تھا وہ خود قرآنِ پاک اور دیگر مستند کتابوں کی بنا پر تھا۔ بہت سے میری تعریف کرنے لگے اور انجیلِ مقدس پر اعتقاد رکھنے اور اس کا ادب کرنے میں میرے ہم خیال ہو گئے اور بہت سے توہمات اور خیالاتِ فاسدہ' جو اُن کو انجیل کی بابت مدتوں سے تھے' کم ہو گئے باایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھے نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلے کا قائل نہیں ہوں اس لئے کہ میں انجیل میں کہیں اس مسئلے کی تائید اور وجود نہیں پاتا ہوں ——— مجھ کو یقین ہے کہ مذہبِ اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجود دونوں انجیل سے ثابت ہیں اس لئے مجھ کو کچھ پروا نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو' خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی' خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو ایک دن سب کو جانا ہے' البتہ میری یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمان اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو کیونکہ قرآنِ مجید کے موافق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہو سکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔[1] ★

★ سرسید کی اس تفسیر جلد اول کے متعلق ان کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے جان میولسن آرنلڈ اپنی کتاب "قرآن اینڈ بائبل" مطبوعہ 1866ء میں لکھتے ہیں: "اگر یہ خیالات عام ہو جائیں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلتے جاتے ہیں تو ان ہی کی وجہ سے وہ نہ صرف وفادار ہو جائیں گے بلکہ رفتہ رفتہ وہ دشمنی جو اسلام کے پھیلنے سے قوموں میں ہو گئی ہے' دور ہو جائے گی۔ یہ تفسیر' جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا واجب التعظیم بیان کرتی ہے اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے' اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے اس سے زیادہ مفید اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں جس نگاہ سے کہ وہ قرآن کو دیکھتے ہیں اگر یہ کام مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے ہو جائے تو پھر عیسائیوں کو یہ ثابت کرنا کچھ دشوار نہ ہو گا کہ اگر انجیل سچ ہے تو (نعوذ باللہ) قرآن ضرور جھوٹ ہے۔" (بحوالہ حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 116-117)

میری تفسیر کا پڑھنے والا جا بجا میری تفسیر میں پائے گا کہ میں کچھ پابند نہیں رہا ہوں ان قولوں کا جن کو سودی عالم یا عیسائی عالم یا مسلمان عالم بلا تحقیقات بطور باپ دادا کے تبرک کے مانتے چلے آئے ہیں بلکہ میں پابند رہا ہوں صرف ہولی سکرپچرز کا اور سچ کا اور سچے خدا کا جس نے ہم کو صرف سچ پر چلنے کے لئے نبی بھیجے اور اپنی سچی کتابیں اتاریں۔⑨★

احکامِ طعامِ اہلِ کتاب (۱۸۶۶ء)

یہ ایک مختصر رسالہ درباب احکامِ طعامِ اہلِ کتاب کے لکھا ہے...... تاکہ مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائیوں پر بدگمانی کرنے اور برا بھلا کہنے سے باز آئیں اور گناہ میں پڑنے سے محفوظ رہیں۔⑦

ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر اعتراضات (انگریزی) ۱۸۶۹ء

۱۸۶۹ء میں، جبکہ میں لندن میں تھا، میں نے ایک چھوٹا سا رسالہ ہندوستان کی تعلیم پر لکھا تھا۔⑧ خصوصاً طریق تعلیم مسلمانان کے متعلق کہ ان کو تمام دُنیوی علوم مثل حساب، جغرافیہ، ریاضی، جرثقیل سیاستِ مدن، تاریخ، طبقات الارض اور علم نباتات وغیرہ جملہ علوم کی تعلیم اردو زبان میں دی جائے۔⑨ .... اس کے علاوہ دو دیگر زبانیں بھی انہیں سکھائی جائیں یعنی عربی اور انگریزی یا فارسی اور انگریزی، اور اپنی دانست میں اس میں یہ ثابت کیا کہ گورنمنٹ اسکول ہندوستان کے لوگوں کی تمام اغراض کے واسطے کافی نہیں ہیں۔⑩

اسکا ایک فقرہ اس مقام پر نقل کرنا نامناسب نہ ہو گا میں نے لکھا تھا کہ

"سرکار انگریزی نے ہندوستان میں دو نہایت بڑے کام کئے ہیں مگر ایک کام دوسرے کا متناقض ہے۔ اول تو گورنمنٹ نے نہایت فیاضی سے اقرار کیا کہ اس کی تمام رعایا کے حقوق، خواہ وہ رعایا ہندوستانی ہو یا انگریزی، ہر اعتبار سے برابر ہوں گے۔ دوم، گورنمنٹ نے ہم کو ہماری زبان اور ہمارے موروثی علوم سے محروم کر دیا اور ہم کو انگریزی زبان مادری اور یورپین سائنس کے سیکھنے پر مجبور کر دیا......"⑪

★ حالی لکھتے ہیں "افسوس ہے کہ یہ تفسیر پوری نہ ہو سکی اور سرسید کا ایک نہایت مفید اور ضروری کام ادھورا رہ گیا۔ صرف دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ مالی مشکلات کے سبب اس ارادے سے دست بردار ہونا پڑا۔" (مقالاتِ حالی، حصہ دوم ص 112)

جب سرسید نے اپنی تصانیف کا مجموعہ "تصانیفِ احمدیہ" کے نام سے شائع کیا تو اس کے حصہ اول جلد دوم میں اس تفسیر کا تیسرا حصہ بھی شامل کیا۔

خُطباتِ احمدیہ (انگریزی) ۷۰ - ۱۸۶۹ء

آں حضرتؐ کی زندگی کے حالات، جن کو مسلمان "سِیَر" اور انگریز "لائف" کہتے ہیں، صرف دین دار مسلمانوں عالموں ہی نے نہیں لکھے بلکہ غیر مذہب کے علما اور مؤرخین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔①

عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ کتاب ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی...... جبکہ یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا۔ مگر جب ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آں حضرتؐ کے حالات کی نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح لکھنا مقصود اور مرکوزِ خاطر تھا تو ان کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر جو نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے اور اپنی دینیات اور الٰہیات سے محض ناواقف تھے ان میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی بڑے پہلو پر لے جا کر لکھا ہے تو فی الواقع ان کی اصلیت کیا ہے۔ میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں میں نے ارادہ کیا کہ آں حضرتؐ کے متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح لکھی جائے کہ جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں ان کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کے ترتیب سے لکھا جائے اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جداگانہ اس ترتیب سے جمع کیا جائے، اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور حمقا کو دامِ تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں ان کو علیحدہ بترتیب لکھا جائے اور ان ہی کے ساتھ ان کے غلط اور نامعتبر ہونے کا ثبوت اور ان کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جائیں مگر میں اپنے اس ارادہ کو بہت سے موانعات کے سبب سے، جن میں سب سے بڑا اپنی فکرِ معاش میں مبتلا رہنا اور اس سے بھی بڑا کسی کا میرے ارادہ کے ممد معاون نہ ہوتا تھا، پورا نہ کر سکا۔ اور علاوہ اس کے اس کام کے لئے بہت سی پرانی کتابیں، جن کو قدیم مصنفوں نے تصنیف کیا ہے، درکار تھیں جو مجھ کو بسبب برباد ہو جانے قدیم کتب خانوں کے دستیاب نہ ہو سکیں اور یہ بھی ایک قوی سبب اس ارادہ کے پورا نہ ہونے کا ہوا، مگر اس پر بھی مختلف اوقات میں مختصر طور پر مختلف مضامین اور مسائل مذہب اسلام اور آں حضرتؐ کے حالات پر کچھ کچھ

لکھتا رہا چنانچہ ان ہی تحریروں میں یہ بارہ مضمون ہیں جو بعنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں اور جس کو اس ایک جلد میں جمع کر دیا ہے۔ ①★

★ ۔ یہ کتاب سرسید نے لندن میں بیٹھ کر تصنیف کی اور اس دوران نواب محسن الملک سے باقاعدہ رابطہ رکھا۔ حالی لکھتے ہیں: "سرسید ولایت میں خطباتِ احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی ہندوستان سے ان کے لئے میٹرل بھیجتے تھے۔ وہ ولایت میں اس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان میں اس کی چھپائی کے لئے چندہ وصول کر کر کے روانہ کرتے تھے۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص 319)

سرسید کی محسن الملک سے مراسلت شروع تا آخر جاری رہی۔ ان کے نام خطوط سے اس تصنیف کی تیاری کے درجہ بدرجہ مراحل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سرسید تصنیف کی تیاری کا عزم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:
"ولیم میور صاحب نے جو کتاب آں حضرتؐ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت صلعم کے سیرۃ میں، جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو، جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو، مارا ہمیں تمغہ شاہنشاہی بس است۔" (خطوطِ سرسید، ص 49)

تیاری کے اقدامات کے متعلق سرسید لکھتے ہیں: "میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیرۃ منگانی شروع کر دیں، چٹھیات روانہ ہو گئیں، سیرتِ ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن خرید لیں، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کے مضمون بتا سکے۔" (ایضاً، ص 49)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک کے حال میں سر ولیم میور اور دوسرے مصنفوں کے اعتراضات پر سرسید نے جو لکھا اس کے متعلق تحریر کرتے ہیں: "سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے مگر ایسا جواب نہیں ہے جیسا کہ تمہارے یہاں کے ملاں مشرکین فی صفۃ النبوۃ دیتے ہیں۔ نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں، نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے، تو تو میرا نام ورنہ میرا نام ہی نہیں۔ اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔" (ایضاً، ص 59 - 60)

دیگر بعض خطوط کے قابلِ ذکر اقتباسات درج ذیل ہیں:

"اگر میری کتاب تیار ہو گئی...... تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔"
(خطوطِ سرسید، ص 55)

"میری کتاب خطباتِ احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں جانتا ہوں۔ اس کے چند مقام ایسے ہیں جن کو دیکھ کر "تا مسلمانانِ ہند" فتویٰ کفر دیں گے۔" (ایضاً، ص 94)

"میرے ہم قوم اس محنت کی، جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے، قدر نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتائیں گے کیونکہ میں پابندِ تقلید نہیں رہا ہوں اور شاید دو یا تین مسئلوں میں جمہور سے اختلاف کیا ہے اور چند علما کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ پس ہمارے شفیق تمام چیز کو چھوڑ کر ان ہی مسئلوں کی [illegible] کفر [illegible] گے۔" (ایضاً، ص 71 [illegible]

..................میں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں ان انگریزوں کی تصنیف کا حال...... جنھوں نے نہایت انصاف سے مذہبِ اسلام کی حمایت کی ہے، شکر کیا ہے اور ان کے اقوال اور رائیں بھی جا بجا نقل کی ہیں۔①

یہ قابلِ ادب شخص ایڈورڈ گبن، قدیم روم کی سلطنت کا مشہور مؤرخ، اور گاڈفری ہیگنز رحمہا اللہ تعالیٰ اور ٹامس کارلیل اور جان ڈیون پورٹ (سلمہا اللہ تعالیٰ) ہیں۔②

یہ کتاب زیادہ تر اُن نوجوان مسلمان لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہے جو انگریزی علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں اس لئے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ تیار ہوا ہے اور اُسکی انگریزی عبارت ایک نہایت لائق اور قابل اور عالم میرے یورپین دوست نے درست کی ہے جس کے سبب وہ مسلمان طالب علموں کی انگریزی تحصیل کے لئے بہت مفید ہے۔③

۱۸۷۰ء میں جب کہ خطباتِ احمدیہ چھپ کر لندن میں شائع ہوئی تو اس پر لندن کے ایک اخبار میں کسی انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہو جانا چاہئے کہ ہندوستان کے ایک مسلمان نے ان ہی کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوش نما چہرے پر لگاتے ہیں۔"④

سر ولیم میور نے...... جس وقت خطباتِ احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آئے ہیں۔⑤

ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ۱۸۷۱ء

ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی وہ کتاب، جو انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی بابت لکھی۔ میں نے بھی اس امید سے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا کہ شاید اس کتاب کے سبب سے اس پیچیدہ معاملے میں، جو عوام کے نزدیک ایک دقیق بات ہے، مجھ کو کچھ روشنی حاصل ہو کیونکہ میں نے یہ بات سنی تھی کہ اس کتاب کا مصنف مسلمانوں کا ایک بڑا دوست اور نہایت بڑا لائق عالم ہے۔⑥

مجھ کو ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے بہت بڑی باتوں کی توقع تھی لیکن بڑا افسوس ہے کہ میری توقع بھی اَور بہت سے آدمیوں کی طرح مایوسی سے بدل گئی...... اور جب میں نے اس کتاب کو پڑھا تو برملا میں نے کہا کہ خدا مجھ کو میرے ایسے دوستوں سے بچائے...... جس طریقے سے اس عالی دماغ مصنف نے اپنی کتاب لکھی ہے اس طریقے سے اس نے تمام نیک ارادوں کو

Presented to T. W. Arnold Esqre
by his sincere friend the author
Syed Ahmed

Aligarh
7th July 1897

تصانیف احمدیہ

حصہ اول　　　جلد ششم

مشتمل بر کتب و رسائل مذہبی

تفسیر القرآن

جلد چہارم

تفسیر سورۃ انفال — تفسیر سورۃ توبہ — تفسیر سورۃ یونس

سنہ ۱۳۱۹ نبوی

علیگڑہ انسٹیٹیوٹ پریس میں باہتمام لالہ گلاب رائے چھاپہ ہوئی

سنہ ۱۳۰۶ ہجری　　　سنہ ۱۸۸۸ع

پروفیسر آرنلڈ کو پیش کئے گئے سیٹ تفسیر القرآن کے ایک نسخے کا سرورق

جو اثر ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی علمی لیاقت سے ہندوستان کے باشندوں پر ہوا ہے اس کا رفع کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے اور یہ اثر ہندوستانیوں کی نسبت اس سبب سے اور بھی زیادہ قوی ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی کتاب کو ہندوستان میں سب سے اعلیٰ حاکم نے منظور کر لیا تھا۔ پس جس صورت میں ایسی غلط باتیں تمام ملک میں مشہور ہو گئیں تو میرا خاموش رہنا مناسب نہ ہوتا' چنانچہ میں نے حتی الوسع ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی غلطیوں کی تردید کی۔[۱]

قدیم نظامِ دیہی ہندوستان (۱۸۷۸ء)

سلطنت انگریزی کے اوسط زمانہ میں بعض ملکوں کے حالاتِ دیہی دریافت کرنے پر توجہ ہوئی۔ اس تحقیقات کا بڑا ذخیرہ محکمہ بندوبست کا دفتر ہے مگر اس میں بہ نسبت اس کے کہ نظامِ دیہی کے قدیم حالات دریافت کیے جائیں' زیادہ تر موجودہ رسم و رواج کے دریافت پر توجہ کی گئی ہے...... اس رسالہ میں ہمارا مقصد اس بات پر بحث کرنے سے کہ وہ نظامِ دیہی کس طرح پر قائم ہوئے تھے' نہیں ہے بلکہ اس بات کا دکھانا مقصود ہے کہ وہ نظامِ دیہی کس طرح پر تھے تاکہ جو لوگ مال گزاری و بندوبست کے کام سے علاقہ رکھتے ہیں ان کو اپنے کام کے انجام میں ایک نوع کی زیادہ تر بصیرت حاصل ہو۔[۲]

تفسیرُ القرآن (۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۵ء)

جبکہ میں نے علومِ جدیدہ و انگریزی زبان کو مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کی تو مجھ کو خیال ہوا کہ کیا در حقیقت وہ علوم مذہب اسلام کے ایسے ہی برخلاف ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے' میں نے بقدر اپنی طاقت کے تفسیروں کو پڑھا اور بجز ان مضامین کے جو علم و ادب سے علاقہ رکھتے ہیں باقی کو محض فضول اور مملو روایات ضعیف و موضوع اور قصص بے سروپا سے پایا جو اکثر یہودیوں کے قصوں سے اخذ کیے گئے تھے۔ پھر میں نے بقدر اپنی استعداد و طاقت کے کتب اصول تفسیر پر توجہ کی...... پھر میں نے بقدر اپنی طاقت کے خود قرآن مجید پر غور کی اور چاہا کہ قرآن ہی سے سمجھنا چاہیے کہ اس کا نظم کن اصولوں پر واقع ہوا ہے اور جہاں تک میری طاقت میں تھا میں نے سمجھا اور میں نے پایا کہ جو اصول خود قرآن کریم سے نکلتے ہیں ان کے مطابق کوئی مخالفت علومِ جدیدہ میں نہ اسلام سے ہے نہ قرآن سے...... پھر میں نے ان ہی اصول پر ایک تفسیر قرآن مجید کی لکھنی شروع کی...... اس تفسیر کے چھپنے اور مشتہر ہونے پر لوگوں نے مخالفت کی اور اس کی تردید

میں کتابیں لکھیں۔ ①★

★ سر سید نے جب تفسیر القرآن لکھنے کا ارادہ کیا تو اس کا مقصد ایک تحریر میں اس طرح بیان کیا: "تفسیر سے ہمارا مقصد مسائل فقیہہ وغیرہ سے بحث کرنے کا نہیں ہے بلکہ ہم صرف ان ہی مقاموں کی تفسیر لکھیں گے جو مشکل ہیں اور جن کو لوگ برخلاف علم و قانونِ قدرت سمجھتے ہیں، اور تاریخی واقعات قرآنِ مجید کو بطور تاریخ بیان کریں گے، نہ بطور قصہ و کہانی کے جیسا کہ مفسروں نے کیا ہے۔" (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 16 اکتوبر 1877ء، ص 858)

حالی لکھتے ہیں کہ مولوی وحید الدین سلیم نے "تفسیر کے لکھنے میں کئی سال تک برابر سر سید کو مدد دی۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص 393)

سر سید کی تفسیر پر چند آرا درج ذیل ہیں:

ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا: "مجھ کو ان کے معتقدات با ثیرہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر دیوانِ حافظ کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوڑتوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتابِ تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیاتِ قرآنی سے اپنے پندار میں اِستنباط کئے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے یا چپکائے) "قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرنا سہل ہے اور ان معانی کو ماننا مشکل...... یہ وہ معنی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبرئیل حاملِ وحی کا، نہ رسولِ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدوّن کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہورِ مسلمین کا۔" (موعظۂ حسنہ، ص 175)

سید جمال الدین افغانی نے لکھا: "(سید) احمد خاں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے جس میں قرآنی الفاظ کے معانی میں تحریف کر کے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کو بدلنے کی کوشش کی۔" (مضامین جمال الدین افغانی، طبع دوم، ص 299)

حالی نے لکھا: "اگرچہ سر سید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 232)

حالی ایک اور موقع پر بیان کرتے ہیں: "سر سید کا خیال تھا کہ اس تفسیر سے کچھ عجب نہیں بلکہ نہایت قرینِ قیاس ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) لوگوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے موجودہ فرقوں سے کسی قدر مختلف ہو لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ ایسا نیا اسلامی فرقہ بہ نسبت اس کے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیں یا کسی مذہب کے پابند نہ رہیں، ہزار درجہ بہتر ہے۔" (مقالاتِ حالی، جلد اول، ص 221)

حالی ایک واقعہ لکھتے ہیں: "علی گڑھ کے ایک مشنری (پادری) صاحب نے سر سید کے ایک دوست سے کہا کہ سید صاحب تو یہ خوب جانتے ہوں گے کہ محمدن کالج کے طالب علم مسلمانوں کے طریقے پر قائم نہیں رہ سکتے، پھر یہ تفسیر لکھ کر ان کو ہمارے ہاتھ سے بھی کیوں کھوتے ہیں؟" (ایضاً، ص 221-222)

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ کتب سنی و شیعہ اس قابل نہیں ہیں کہ بعد تعلیمِ علومِ جدیدہ کسی مسلمان کا اعتقادِ قلبی مذہبِ اسلام پر رہے۔ صرف معتزلیوں کے اصولِ مذہب اور کتابیں کسی قدر عمدہ معلوم ہوتی ہیں مگر موجود نہیں ہیں۔ یہی خیال مجھ کو باعث ہوا ہے کہ میں نے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھی ہے۔[1]

اگر زمانہ کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے ان خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آئے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تاکہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سردست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔[2]

تفسیر کی جلد ششم بھی چھپ کر تیار ہو گئی ہے اور جلد ہفتم کا مسودہ بھی تیار ہے۔[3]

سورۂ کہف سے تین سورتوں تک تفسیر میں لکھ چکا ہوں۔[4] ★

تفسیر قرآنِ مجید کا تمام ہونا تو مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اس کے چھاپہ میں اس قدر خرچ پڑتا ہے کہ میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ مسودہ لکھ کر ڈھیر کرتا جاؤں، اس امید پر کہ کبھی چھپ رہے گی۔ مگر میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ مقاماتِ مشکلِ قرآنِ مجید کے اور جو مشکلات بعض معترضین کی طرف سے مذہبِ اسلام پر وارد ہوتے ہیں ان کے جواب میں چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ ڈالوں۔ اگر خدا نے اس کام کو انجام کر دیا تو تمام مشکلات حل ہو جائیں گی اور صرف قرآن کا ترجمہ باقی رہ جائے گا جس کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔[5]

تصانیفِ احمدیہ (۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۵ء)

تصانیفِ احمدیہ تصنیف کی ترتیب سے چھپی ہیں۔[6]

ان سب کا بہ ترتیب جمع کرنا گویا ان تمام زمانوں کے خیالات کو بہ ترتیب سامنے رکھنا ہے جس سے شاید خود مجھ کو اور آئندہ آنے والی نسلوں کو فائدہ ہو۔[7] ●

★ یہ جلد سرسید کے انتقال سے چھ سال بعد پہلی بار شائع ہوئی۔

● سرسید نے جب تصانیفِ احمدیہ کی اشاعت کا ارادہ کیا تو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ کے شمارہ 18 مئی 1878ء میں اس تجویز کو باقاعدہ مشتہر کیا۔ مجوزہ فہرست میں "رسالہ ابتدائی متعلق علم ہیئت" اور "اصولِ علم طبعی" کے نام سے ان کی دو کتابیں بھی شامل ہیں مگر ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا وہ ان کی سابقہ تصانیف تھیں یا تفسیر القرآن کی مانند ان موضوعات پر آئندہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں اس اشاعتی منصوبہ کا [illegible]

ان تصنیفات سے خود ہمارے لئے ہمارے خیالات کی ایک تاریخ موجود ہو جائے گی جس پر تعجب سے نگاہ ہو سکے گی کہ کس طرح پر وہ تبدیل ہوتے گئے۔[1]

خُطباتِ احمدیہ (اردو) ۱۸۸۷ء

کتابِ خطبات اردو زبان میں مرتّب ہو کر چھپ گئی انگریزی پڑھنے والے جب اس اردو کتاب کو انگریزی کتاب سے، جو ۱۸۷۰ء میں چھپی ہے، مقابلہ کر کے پڑھیں تو علاوہ اس اختلاف کے جو انگریزی زبان کی طرزِ تحریر اور اردو زبان کی طرزِ تحریر میں ہے، اس اردو زبان کی کتاب کے ہر ایک مضمون کو زیادہ تر وسیع پائیں گے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انگریزی کتاب در حقیقت بطور خلاصہ ان مضامین جن کی یادداشت اول اردو زبان میں لکھی گئی تھی، بنظرِ تسہیل ترجمہ انگریزی مرتب کی گئی تھی اور اس اردو کتاب کو ہم نے اپنی اردو یادداشتوں سے مرتب کیا ہے اور اس میں مضامین کو اسی وُسعت سے لکھا ہے جس وُسعت سے کہ یادداشتوں میں تھی۔[2] ★

النظر فی بعض مسائلِ الامامُ الغزالی (۱۸۸۹ء)

اگرچہ یہ رسالہ امام غزالی کا...... بہت چھوٹا ہے مگر اس میں نہایت عالی مضامین بھرے ہوئے ہیں جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی نہیں ہیں، بایں ہمہ شترگربہ سے خالی نہیں، اس پر نظر ڈالنے اور اس کا ریویو لکھنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے ان دونوں قسم کے مضامین میں تمیز کروں۔[3]

ازالۃ الغَین عن ذی القرنین (۱۸۹۰ء)

سدِ یاجوج وماجوج کی نسبت جو قصہ ذوالقرنین کا قرآن مجید میں مذکور ہے اس کو مؤرخانہ تحقیقات سے...... اور قرآن مجید کی آیتوں کو واقعی حالات سے مطابق کر کے...... کہ در حقیقت وہ قصہ کیا ہے...... میں نے اس رسالہ کا نام "ازالۃ الغین عن ذی القرنین" رکھا۔[4]

ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم (۱۸۹۰ء)

من جملہ ان قصوں کے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے ایک قصہ اصحاب الکہف والرقیم کا ہے یہ قصہ آں حضرت صلعم کی بعثت کے قبل ایشیا میں اور روم کے عیسائیوں میں اور عرب جاہلیت میں مشہور تھا اور جیسا کہ اس قسم کے قصوں کا دستور ہے، بہت سی بے اصل اور عجیب و غریب باتیں اس میں شامل ہو گئی تھیں، خدا تعالیٰ نے اس قصہ کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا اور بتایا کہ اصلی و صحیح

★۔ یہ کتاب پہلی بار تصانیفِ احمدیہ کے اس مجموعہ میں ہی اشاعت پذیر ہوئی۔

قصہ کیا ہے مگر مفسرین و مورخین نے بعوض اس کے کہ ان بے اصل کہانیوں کو' جو مشہور تھیں' اس قصہ سے علیحدہ کرتے قرآن مجید کی تفسیروں اور ان تاریخوں میں جو زمانۂ اسلام میں لکھی گئیں اس طرح شامل کر دیا کہ گویا وہ کہانیاں اسلام ہی کی ہیں حالانکہ اسلام اس قسم کی بے ہودہ کہانیوں سے بری ہے۔[1]

اس امر پر خیال کر کے میں نے چاہا کہ قصہ اصحاب الکہف والرقیم کو صاف طور پر جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے بیان کروں اور بے اصل کہانیاں جو اس میں شامل ہو گئی ہیں ان کو اصل قصہ سے علیحدہ کر دوں' الحمد للہ کہ یہ کام پورا ہوا اور اس رسالہ کا نام "ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم" رکھا میں نے اس قصہ کو اول صاف اور سیدھے طور پر بغیر تعرض آیاتِ قرآنِ مجید کے بیان کیا ہے...... اس کے بعد قرآنِ مجید کی ان آیات کی تفسیر بیان کی ہے جو قصہ اصحابِ کہف سے متعلق ہیں اور دکھایا ہے کہ بے اصل کہانیاں جو مشہور ہیں ان ہی کی تردید قرآنِ مجید سے ہوتی ہے۔[2]

تفسیر الجن والجان علیٰ مافی القرآن (۱۸۹۲ء)

یہ رسالہ میں نے نہایت محنت سے لکھا۔[3]

الدعا والاستجابۃ (۱۸۹۲ء)

رسالہ استجابت دعا علیحدہ لکھا ہے۔[4]

تحریر فی اصولِ التفسیر (۱۸۹۲ء)

میرا ارادہ تھا کہ جب میری تفسیر پوری ہو جائے گی اور اول سے آخر تک قرآن بنظرِ غائر تمام ہو جائے گا اس وقت میں دیباچہ تفسیر کا لکھوں گا اور اس میں وہ تمام اصول بیان کروں گا جو تفسیر لکھنے میں مَیں نے اختیار کیے ہیں مگر چونکہ اس کو زمانۂ دراز درکار تھا اس لئے میں نے خیال کیا کہ مقدم اصولوں کو' جو میں نے تفسیر کے لکھنے میں اختیار کیے ہیں' لکھ دوں اور باقی اصول اس وقت پر منحصر رکھوں جبکہ کہ تفسیر تمام ہو جائے اور خدا کی مرضی ان کے لکھنے پر ہو۔ پس یہ چند مقدم اصول ہیں جن پر میری تفسیر مبنی ہے اور جو کہ ایک رسالہ کی صورت میں لکھے گئے ہیں اور اس لئے میں نے اس کا نام بھی "تحریر فی اصول التفسیر" رکھا ہے۔[5] ★

★ حالی لکھتے ہیں: "سرسید نے جن اصول پر قرآن کے معنی بیان کیے ہیں ان میں بظاہر اکثر کی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس پر کچھ گرفت ہو سکے مگر اس میں شک نہیں کہ بہت سی آیتوں کے معنی بیان کرنے میں جن اصول کی ان کو پابندی کرنی چاہیے تھی ان کی پابندی نہیں کی گئی اور اسی وجہ سے بعض آیات کی تفسیر میں سرسید کے قلم سے [illegible]

فضائلُ الامام، من رسائل حجۃُ الاسلام (۱۸۹۳ء)

میرے پاس اس کا ایک نسخہ تھا میں نے بقدر طاقت و استعداد اس کی تصحیح کی۔ میں نے بعض مقامات پر غلطیاں پائیں .... ①

تبرئۃُ الاسلام عن شَینِ الاُمّۃِ والغُلام (عربی) (۱۸۹۵ء)

میں نے رسالہ غلامی کو عربی زبان میں چھاپا ہے، جو رسالہ کہ اردو میں چھپا تھا اس رسالہ کو اس سے زیادہ کر دیا ہے یعنی راویان اور احادیث اور بعض دیگر مضامین اس عربی رسالہ میں زیادہ کر دیئے۔ ②

اس کا عربی ترجمہ بعض عزیز دوستوں نے کیا، پھر مصنف نے ترجمہ پر نظر ثانی کر کے اس میں اضافے کئے۔ ③

تہذیبُ الاخلاق (جلد دوم) ۱۸۹۵ء

اس سے پہلے ہمارے مکرم دوست منشی فضل الدین صاحب .... نے ایک مجموعہ ان تمام مضامین کا چھاپا تھا جو نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی سات برس کے قریب تک تہذیب الاخلاق کے پرچوں میں لکھتے رہے ہیں۔ اب انہوں نے اس کی دوسری جلد چھاپی ہے اور اس میں ہفت سالہ سید احمد خاں کے جو مضامین وقتاً فوقتاً تہذیب الاخلاق میں چھپتے رہے ہیں، نہایت خوبی و ترتیب سے جمع کر دیئے ہیں اور جلد دوم تہذیب الاخلاق سے اس کو موسوم کیا ہے۔ اس جلد کے 620 صفحے ہیں اور صفائی اور خوبی سے چھاپے گئے ہیں۔ ہم اس کی نسبت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لکھ سکتے کہ ہمارے مکرم دوست منشی فضل الدین صاحب نے نہایت عمدگی سے وہ سب مضامین جمع

(② یا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)

ہم خیال آدمی ان کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص 377)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔" (ایضاً، ص 522)

بانی دارالعلوم دیوبند مولوی محمد قاسم نانوتوی اپنے ایک خط میں سرسید کی خود رائی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

"سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندی اہلِ اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہارِ محبت کروں تو بجا ہے مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں..... کوئی کچھ کہو وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ ان کے اندازِ تحریر سے یہ بات نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلطی نہ کہیں گے۔" (تصفیۃ العقائد، ص 9،۲)

کئے ہیں اور جو لوگ مضامین تہذیب الاخلاق کو پڑھنا چاہتے ہوں، ان کے لئے یہ مجموعہ نہایت بکار آمد ہے۔[۱]

تغیر السمٰوات (۱۸۹۷ء)

ایک رسالہ تغیر السمٰوات کا میں نے لکھا تھا جو پرانے تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں چھپ گیا تھا۔ اب اس کو بھی بطور ایک مستقل رسالہ کے علیحدہ چھپوالیا ہے۔[۲]

ازواجِ مطہرات (زیرِ تصنیف)

ان دنوں میں ایک بہت نازک اور بڑے امر پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں یعنی ازواجِ مطہرات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بھی رسالہ چھپے گا تو مجھے امید ہے کہ کسی کے دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے کا۔[۳]★

دیگر تصانیف کے سنہ ہائے اشاعت[۴]❋

جامِ جم (۱۸۴۰ء)
آئینِ اکبری (تصحیح) ۱۸۵۵ء
شکریہ (۱۸۵۹ء)
کتابِ فقرات (درسی) ۱۸۶۰ء
تحقیقِ لفظ نصاریٰ (۱۸۶۱ء)
توزکِ جہانگیری (تصحیح) ۶۴-۱۸۶۳ء

خلق الانسان علیٰ مانی القرآن (۱۸۹۳ء)
ابطالِ غلامی (۱۸۹۳ء)

★۔ اس رسالہ کی تکمیل سے پیشتر ہی سرسید انتقال کر گئے۔ یہ نامکمل مضمون سرسید کے آخری مضامین پر مشتمل کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔

❋ اس عنوان کے تحت درج کردہ تمام کتب مطبوعہ ہیں۔ "کتابِ فقرات" اہلِ علم سے مخفی تھی۔ راقم کو انڈیا آفس لائبریری لندن کے ذخیرہ سے اس کا ایک ایڈیشن دستیاب ہوا جس پر سرسید کے نام کے ساتھ "سی ایس آئی" لکھا ہے اور اس پر گورنمنٹ شمال مغربی صوبہ کی 1871ء کی مہر ثبت ہے۔ یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایڈیشن سرسید کے "سی ایس آئی" بننے کے بعد 1870ء میں طبع ہوا۔ راقم نے اس کتاب کو 1981ء میں انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ کے ذریعہ متعارف کروایا۔ بعد میں اس کے ایک سابقہ ایڈیشن کا بھی علم ہوا جس پر کتاب کے نام کے ساتھ "برائے تعلیم طالب علمان پنچایتی مدرسہ مراد آباد مؤلفہ سید احمد خاں صدر الصدور مراد آباد" تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنِ طباعت 1860ء کے لگ بھگ ہے۔

دو برس تک یعنی جب تک کہ میں گورنمنٹ اف انڈیا

لیجس لیٹیف کونسل میں ممبر تہا مولوی ابو الحسن میری پاس بطور

پرسنل اسسٹنٹ کے رہی - اوس عہدی کے لیے مجہی ایسی شخص کی مدد

درکار ہتی جو انگریزی میں لایق ہو اور سب سی زیادہ یہ ہو کہ ایماندار

اور معتمد و رازدار ہو اور یہ سب صفتیں مولوی ابو الحسن میں

موجود ہتیں اور میں تصدیق کرتا ہوں کہ اونہوں نے مجہکو اوس

مشکل کام میں ہر طرح کی مدد دی اور نہایت ایمانداری اور معتمدی

اور رازداری سے کام کیا اور اونکی انگریزی کی قابلیت اور لیاقت نے

مجہکو بہت بڑی مدد دی - وہ برابر کلکتہ و شملہ میں میرے ساتہ

رہی پس میں احسانمندی کے ساتہ یہ سارٹیفکیٹ اونکو دیتا ہوں

مقام علیگڈہ

سید احمد

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۸۱

Syed Ahmed

سرسید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تعریفی سند ..... ان کے اردو اور انگریزی دستخطوں کے ساتھ

مصنف کی لائف پر تالیفات

دی لائف اینڈ ورک آف سید احمد خاں از گراہم (۱۸۸۵ء)

یہ کتاب اعلیٰ انداز میں تحریر کی گئی ہے' طباعت وشباہت عمدہ ہے' جلد اچھی ہے اور اس کے مصنف کے باعث ایک قابلِ فخر چیز ہے تاہم اس کا واحد نقص یہ ہے کہ یہ مجھ جیسے مسکین شخص کی لائف کے لئے وقف کی گئی ہے۔ قاری ایک فارسی شاعر کے مندرجہ ذیل شعر کا تصور کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (ترجمہ)

"اگر تم میں ایک اچھی صفت ہے اور سترہ بُری صفات تو تمہارا دوست ان تمام کو نظرانداز کر دے گا اور اپنی توجہ اس اچھی صفت کی طرف مبذول رکھے گا"

میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس کوشش میں ساری کتاب کی ورق گردانی کی کہ اس میں کوئی ایسا لفظ تلاش کر سکوں جو میرے لئے قابلِ فخریات ہو اور اس سے مجھے حقیقی خوشی حاصل ہو۔ اور جب میں نے اس کے دیباچہ میں یہ الفاظ پائے "میں یہ کہوں گا کہ سید احمد سے میری جان پہچان دوست سے زیادہ ایک عزیز رشتہ دار کی مانند ہے" تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی.......... میں خود کو اس حقیقت پر مبارکباد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ اگرچہ مجھے اس قسم کی کتاب کا لکھا جانا منظور نہ تھا تاہم میں اس شخص کی خوشی کا باعث ہوا جس کی قدر میری نظروں میں بطور ایک دوست کے ہی نہیں بلکہ ایک بھائی کی طرح ہے۔[1]

لائف از سراج الدین احمد

حاجی محمد اسماعیل خاں صاحب نے جو میری لائف منشی سراج الدین احمد سے لکھوائی تھی' وہ مسودہ انہوں نے مولوی الطاف حسین صاحب کو دے دیا۔ اب مولوی الطاف حسین بطور خود میری لائف لکھیں گے اور خود ہی چھپوائیں گے' اور جو [illegible] کریں گے۔ میں بھی اس پر راضی ہو گیا ہوں کہ مولوی الطاف حسین جو کچھ لکھیں [illegible]۔ مولوی سراج الدین نے جو کچھ لکھا تھا وہ چھاپہ ہونے کے قابل نہ تھا۔ بعض [illegible] اور طرز بیان درست نہ تھا۔ لائف ایک مدح نامہ نہیں ہوتی بلکہ ایسی [illegible] کہ اس شخص کی بھلائی برائی سب کا نمونہ ہو اور الفاظ مدح و ذم اس سے [illegible] کرنے والے نہ ہوں تو

در حقیقت اس میں ہو۔ میری نسبت لکھ دینا کہ بہت ذی علم و فاضل اکمل ہیں، کیسی غلط بات ہے!★

★۔ اس سوانح کی تحریک کا ابتدائی پس منظر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ 3 جنوری 1890ء کی ایک تحریر سے یوں واضح ہوتا ہے: "حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاولی کو چند سال سے اس بات کی دھن لگ گئی ہے کہ سید احمد خاں کی لائف اور جو کام انہوں نے کئے ہیں ان کا تذکرہ اردو میں لکھا جائے۔ سید احمد خاں نے ہرچند ان کو روکا اور چاہا کہ وہ اس خیال کو چھوڑ دیں لیکن انہوں نے نہیں مانا۔ حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب نے اولاً مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی سے درخواست کی کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ اگرچہ انہوں نے آرے سولے کی مگر کچھ نہیں کیا۔ پھر انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی سے التجا کی کہ وہ اس کے لکھنے پر متوجہ ہوں۔ مولانا نے کہا کہ میں خود اس کے لکھنے کا خیال رکھتا ہوں مگر بہ سبب عوارضات کے معلوم نہیں کب وقوع میں آئے گا۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے منشی سراج الدین سے اس کے لکھنے کو کہا، وہ کمر باندھ کر مستعد ہو گئے" (بحوالہ یادگار شبلی، ص 139) بعد میں ان کا لکھا ہوا مسودہ مولوی الطاف حسین حالی کو مل گیا جنہوں نے سرسید کی مفصل سوانح "حیاتِ جاوید" کے نام سے ان کی وفات کے تین سال بعد 1901ء میں شائع کی۔

سوانح عمری کے ضمن میں حالی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں: "ایک شخص نے چند اجزا سرسید کی لائف کے نام سے لکھ کر ان کے پاس بھیجے جس میں بہت سی باتیں خلافِ واقعہ درج تھیں اور جا بجا ان کی تنقیص کی گئی تھی، مگر مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرسید نے اس پر یہ ریمارک کر کے اخبار میں چھپوا دیا "ایک ہمارے شفیق غائبانہ نے، جن کی ہم سے ملاقات ظاہری نہیں ہے، ہماری لائف اپنے خیال کے مطابق لکھ کر ہمارے پاس بھیجی ہے جس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے ہم خود واقف نہیں ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور یہ رباعی حسب حال لکھتے ہیں۔

اے آنکہ مرا ندیدہ بشناختہ نادیدہ تصورم چنان ساختہ

با ایزد بے مثال مانند نیم حقا کہ ندیدہ و نشناختہ

سرسید نے اپنی سوانح عمری کے ایک مسودہ کو "مدح نامہ" ہونے کی بنا پر رد کیا تھا اور دوسرے کو "خلافِ واقعہ" ہونے کے باعث۔ ان کی رضامندی سے تحریر کی گئی "حیاتِ جاوید" پر ان کا تاثر بوجہ وفات معدوم رہا مگر شبلی نعمانی نے اسے "مدلل مداحی" "یک رخی تصویر" (مکاتیبِ شبلی، حصہ اول، ص 142) اور "کذب و افترا کا آئینہ" (بروایت مولوی عبدالحق بحوالہ موجِ کوثر ص 140) قرار دیا۔

مطاعن و فتاویٰ

کفر کے فتوے

نیچری یا دہریہ ہونے کا طعنہ

ہم کو ہمارے شفیق نیچرلسٹ یا دہریہ کہتے ہیں اس سبب سے کہ ہم نے اپنی تصنیفات میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو مذہب نیچر کے برخلاف ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اسی کے ساتھ اپنا یہ یقین بھی ظاہر کیا ہے کہ بحیث مذہب اسلام' جب کہ وہ بدعاتِ محدثہ سے پاک ہو' بالکل نیچر کے مطابق ہے اسی لئے کہ وہ سچا ہے اور اس لئے وہ سچا ہے۔ اگر یہی وجہ ہمارے دہریہ ہونے کی ہو تو ہم پکے دہریہ سہی۔[1]

کافر' ملحد' زندیق' لامذہب' عیسائی' دجّال کے القاب

ناصحانِ شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ' آخر کار ہم کو کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا۔ دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا ہی منگوائیں۔[2] ★

★ حالی لکھتے ہیں: "مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستان میں ہیں کیا سنی کیا شیعہ' کیا مقلد کیا غیر مقلد' کیا وہابی کیا بدعتی' سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتووں پر مہریں یا دستخط ہیں۔"
(حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 282)

محسن الملک بیان کرتے ہیں: "شاید سب سے پہلے میں نے ہی ان کے کفر کا فتویٰ دیا تھا [illegible] کہا۔" (لیکچرز محسن الملک' ص 412)

ہماری قوم کے ایک اخبار نویس نے چھاپا کہ ہم عیسائی ہو گئے اور ایک گرجا میں جا کر بپتسما یعنی اصطباغ لیا۔[1]

جس قدر مخالفت ہمارے ساتھ لوگوں نے کی اور ہم کو سخت وسست برا بھلا کہا، ہم کو دجال اول کا لقب دیا، ہمارے اجداد کو نعوذ باللہ دجال کے اجداد قرار دیا، جن کا کلمہ روز پڑھتے ہیں ان کو معاذ باللہ دجال کا دادا سمجھا حقیقت میں یہ بہت کم ہوا۔ جب ہم نے اس کام پر ہاتھ ڈالا تو ہم کو اس سے بھی بہت زیادہ مخالفتوں کا یقین تھا۔[2]

ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم ورواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزماں محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں۔ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسے ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِ امجد ابراہیم اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں، پھر وہ لوگ ہم کو ملحد و زندیق و لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں کیونکہ ہم ان کے خداؤں اور پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔[3]

گوزِ شُتر کے برابر بے وقعت فتووں سے بے پرواہی

میں اول درجے کا چکنا گھڑا ہوں اور گالیاں کھاتے کھاتے بے حیا بن گیا ہوں۔ میں نے آج تک کفر کے فتووں کی اور نہ اخبارات کی تحریروں کی کوئی پرواکی ہے۔[4]

میں تو بڑے بڑے مولویوں اور جگادریوں کے فتووں پر ملتفت ہوتا ہی نہیں۔[5]

میں ان کے کافر بنانے سے کافر نہیں ہو سکتا۔ تکفیر کے فتوے کچھ نئی بات نہیں ہے۔ کون شخص بزرگانِ دین میں سے بچا ہوا ہے جس کی تکفیر کے فتوے نہیں ہوئے...... اگر میں ان سب بزرگوں کا نام لوں جن پر کفر کے فتوے جاری ہوئے تو غالباً کئی جزو میں بھی ان کی فہرست ختم نہ ہوگی۔ پس جب کہ یہ حال ہے تو میں غریب کس گنتی میں ہوں۔ مجھ کو اپنی تکفیر کے فتووں کا نہ کچھ ڈر ہے اور نہ کچھ غم۔[6]

ان فتووں سے کیا ہوتا ہے؟ بقولِ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کہ گوزِ شتر کے برابر بھی کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ پہلے وہ خود تو مسلمان ہولیں جب دوسروں کی تکفیر کریں۔①

میں تو اپنے تئیں بڑا حامئ اسلام سمجھتا ہوں گو سارا زمانہ مجھ کو دہریہ کیوں نہ سمجھے۔②

کٹ ملاؤں کی ہنڈیا اور چمچے

کٹ ملاؤں کے اس فتویٰ کفر سے 'کہ عذاب قبر سے انکار کیا اور معراج سے منکر ہوئے اور شیطان کے وجود کو نیز جداگانہ میں نہ ماننے سے نص قرآنی کا انکار کیا' کچھ ڈرنا نہیں چاہئے۔ اگلے لوگوں نے جن میں سب کے سرتاج امام حجۃ الاسلام غزالیؒ ہیں اور سب کے آخر میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ ہیں ان کی نسبت بھی ان کٹ ملاؤں نے اسرارِ دین کے بیان کرنے کے سبب سے بہت سے کفر کے فتوے دیئے ہیں۔ ان فتووں سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑا مگر ان کٹ ملاؤں کی ہنڈیا میں جو تھا وہی ان کے چمچوں میں نکل آیا۔③

لمبی پوزیشنوں والے مولویوں کے حال اور کرتوت

جو لوگ ہماری تکفیر کا فتویٰ دیتے ہیں ذرا ان کو شرم کرنی چاہئے اور اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے۔ کونسی لمبی پوزیشن کے مولوی صاحب ہیں جن کے حال اور کرتوت سے ہم واقف نہیں؟④

جاہلوں میں بیٹھ کر فتویٰ بازی کی شیخی

واہ 'کیا معتقدین رسول کے ہیں کہ جو برائیاں ان میں ہیں وہ سب پیغمبر کی نسبت بھی قیاس کرتے ہیں اور جب ہم ان سے مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی بدگمانی پیغمبر سے مت کرو تو ہمارے زمانہ کے لمبی ڈاڑھی اور اونچے پاجامے والے ہم کو غیر مقلد ائمہ اربعہ اور کافر اور ملحد بتاتے ہیں اور ہم اپنی اس فکر کو ان کے ایمان سے بہت اچھا سمجھتے ہیں۔⑤

قلم ہاتھ میں لے کر بے سود باتوں سے کاغذ کو سیاہ کر دینا اور تفسیر القول بما لا یرضیٰ قائلہ کر کے لوگوں کو کافر و ملحد و مرتد کہنا کچھ دین داری کی بات نہیں ہے 'البتہ جاہلوں میں بیٹھ کر شیخی کرنے کو اور بڑے پکے دین دار کہلانے کو تو بہت عمدہ ہے۔ ہم کیوں پیروی کریں ان ملاؤں کے قول کی جن کا قول خلافِ واقعہ ثابت ہوا ہے؟ اور کیوں پیروی کریں اس تفسیر کی جس سے تمام قرآن نعوذ باللہ غلط اور خلافِ واقعہ معلوم ہوتا ہے؟ ہم کسی مفسر اور کسی عالم پر ایمان نہیں لائے کہ قرآن کی بات کی بیچ کریں۔ ہم تو خدا پر اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اس کے کلام پر ایمان لائے ہیں اور اس کے عاشق ہیں۔ پس جو شخص یا جو قول ایسا ہے جس سے ان میں نقص لازم آتا

قصہ مُفتیانِ حرمین شریفین کے فتووں کا

بیان کردہ الطاف حسین حالی

(عکس از حیاتِ جاوید)

اگرچہ مولوی امداد العلی کی کوشش سرسید کے کفر و ارتداد کے فتوے حاصل کرنے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی تھی؛ دلی، رامپور، امروہہ، مرادآباد، بریلی، لکھنؤ، بھوپال اور دیگر مقامات کے سالم عالموں اور مولویوں اور واعظوں نے کفر کے فتووں پر مہریں اور دستخط کیے تھے؛ گویا ہندوستان کے تمام اہل حل و عقد کا اس حکم پر اجماع ہو گیا تھا، صرف خدا کی طرف سے اُسکی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی سو مولوی علی بخش خان نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔ اُنھوں نے غالباً اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ معظمہ میں جا کر مذاہب اربعہ کے مفتیوں کے سامنے دو استفتے عربی زبان میں پیش کیے جنھیں سے ایک کا ترجمہ یہ ہے

"آپ کیا فرماتے ہیں اُس شخص کے باب میں جو ابلیس کے وجود خارجی سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اُس سے مراد قوت بہیمیہ ہے جو نفس انسان میں ہے، اور ملائکہ کا سجدہ آدم کے واسطے حقیقی سجدہ نہ تھا بلکہ اُس سے قُوے کا مطیع ہونا مراد ہے، اور اَبیٰ وَاستکبَرَ سے عدم اطاعت قوت بہیمیہ مراد ہے جو آدمی کی اغوا کرنے والی ہے نہ کہ حقیقی سجدے سے انکار کرنا، اور کہتا ہے کہ افلاک اجسام نہیں ہیں بلکہ اُن سے فضائے بسیط یا سبع سیارات مراد ہیں، اور کہتا ہے کہ لونڈی غلام بنانا حرام ہو گیا ہے آیۂ اِمّا منّاً بعدُ و اِمّا فداءً سے اور یہ آیت نازل ہوئی ہے فتح مکہ میں اور یہ سب سے اخیر آیت ہے جو قیدیوں کے باب میں نازل ہوئی ہے، اور کہتا ہے کہ معراج خواب میں ہوئی تھی اور جسم کے ساتھ نہ ہوئی

ہانے سے انکار کرتا ہے ، اور انکار کرتا ہے شق صدر آنحضرت ؐ کا ، اور کہتا ہے کہ گلا گھونٹے ہوئے پرند حلال ہیں ۔
پس ایسے شخص کے باب میں کیا حکم ہے ؟

اس استفتے کے جواب میں مذاہب اربعہ کے چاروں مفتیوں[1] نے جو مکہ معظمہ میں رہتے ہیں علیحدہ علیحدہ عبارت لکھی ہے اور ان چاروں صاحبوں کے جوابات کا حاصل یہ ہے کہ "یہ شخص ضال اور مضل ہے بلکہ وہ ابلیس لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اور اسکا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بھی بڑھکر ہے خدا اسکو سمجھے ۔ واجب ہے اولیاء الامر پر اس شخص سے انتقام لینا ۔ اسکو تنبیہ کرنی چاہیے اور اگر جاہل ہو تو سمجھانا چاہیے پھر اگر باز آوے تو بہتر ہے ورنہ ضرب اور حبس سے اُسکی تادیب کرنی چاہیے اگر ولاۃ اسلام میں کوئی صاحب غیرت ہو۔ نہیں تو خدا اُسکو سمجھیگا اور اُسکی ضلالتوں اور رسوائیوں کی سزا دیگا "
اسکے بعد سید محمد کتبی حنفی مدرس حرم شریف اور مولانا رحمتہ اللہ مرحوم ہندی مہاجر مکہ معظمہ نے چاروں مفتیوں کے جوابوں کی تصویب کی ہے ۔

پھر مولانا علی بخش خان مدینہ منورہ گئے ہیں اور اسی قسم کا استفتا شیخ محمد امین بالی مفتی احناف کی خدمت میں پیش کیا ہے ۔ اُنکے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ "جو کچھ رد المختار اور اسکے حاشیہ سے معلوم ہوتا ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی کسی جانب مائل ہو گیا ہے یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا یا اباحی ہے کیونکہ منخنقہ کا کھانا مباح بتلاتا ہے ۔ اور اہل مذہب (حنفی) کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی ۔ پس اگر اس شخص [illegible]

---

[1] یعنی شیخ عبد الرحمن بن شیخ عبد اللہ سراج مفتی حنفیہ اور احمد بن زینی دحلان مفتی شافعیہ [illegible] مفتی حنابلہ اور حسین بن ابراہیم مفتی مالکیہ ۔

توبہ کرلی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اُس سے ظاہر ہوگئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اسکا قتل واجب ہے دین کی حفاظت کے لیے اور ولاۃ امر پر واجب ہے کہ ایسا کریں"

دوسرے استفتے کا ملخص یہ ہے کہ "اُس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جسکے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد اور اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل سلام کے اخلاق مہذب نہ ہونگے جب تک کہ وہ تہذیب یورپ کے فلاسفہ جدید کی پیروی نہ کرینگے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کیے ہیں بےفائدہ ہیں اسلئے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جسمیں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پرستاضرور یہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں سے ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفہ جدیدہ کے خلاف نہوں۔ اور جب لوگوں نے اُسپر اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا۔ اور اُسکی اعانت سے انکار کیا تو اُسنے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کرونگا اور اپنے ارادہ سے بھی باز نہ آؤنگا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا۔ حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اُسی کے گروہ کے ہیں اور اُنکی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہیں۔ پس ایسی حالت میں آیا مسلمانوں کو اُسکی اعانت کرنی جائز ہے یا نہیں۔ بینوا توجروا"

اسکا جواب بھی حرمین شریفین کے مفتیوں نے الگ الگ لکھا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ "یہ مدرسہ جسکو خدا برباد اور اُسکے بانی کو ہلاک کرے اسکی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر یہ مدرسہ بنکر تیار ہو جائے تو اسکو منہدم کرنا اور اُسکے بانی سے اور اُسکے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جسمیں حمیت اسلامی ہو واجب ہے کہ اس مدرسہ کی مخالفت جہانتک کہ قدرت ہو اور ادنے درجہ یہ ہے کہ دل سے اُسکا مخالف ہو"

مولوی 'ملّانوں' پیروں کا کردار

مکار' دغاباز' فریبی' ریاکار

تمام مذاہب میں جو لوگ زیادہ مقدس گنے جاتے ہیں' خواہ وہ یہودی مذہب کے ربی کاہن ہوں یا عیسائی مذہب کے پوپ یا ہندو مذہب کے گرو یا مسلمانی مذہب کے مولوی' اکثر ان میں مکار' دغاباز' فریبی و ریاکار دکھائی دیتے ہیں ۔ "یقولون مالایفعلون" ان کا ٹھیٹ مذہب ہوتا ہے' خدا کو دھوکہ دیتے ہیں' ہر حیلہ سے ہوائے نفس کو پورا کرتے ہیں اور اپنا دوزخ بھرتے ہیں۔(۱)

حیلے باز

ہم نے بہت سے اہل مذاہب اور شریعت پر چلنے والوں کو بھی دیکھا ہے اور ایسے تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کو لامذہب عُرفی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے۔ ہم نے ان پچھلوں کو ان پہلوں سے ہزار درجہ زیادہ نیک اور ایماندار پایا ہے۔ پہلے کو نہ برائی کے برائی ہونے کا دلی یقین ہوتا ہے' نہ بھلائی کے بھلائی ہونے کا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ چیز اس لئے بری ہے کہ بری کہی گئی ہے .... اس برائی کو کسی حیلہ سے چھُپا کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک بے گناہ معصوم عورت کو حیلہ سے بہکا کر لے آتا ہے' لوگوں کا مال حیلہ سے کھالیتا ہے' جن کاموں کو اس نے اوپری دل سے ناجائز سمجھ رکھا ہے ان کے جائز کرنے کے لئے سینکڑوں حیلے پیدا کرتا ہے اور کتب فقہ میں دفتر کے دفتر کتابُ الحِیَل کے لکھ دیتا ہے .... ان حیلوں کے بھروسہ اس کو بُرا نہیں سمجھتا اور اس کی برائی اس کے دل میں نہیں رہتی۔ نہ خدا سے شرم کرتا ہے اور نہ دنیا سے۔ مسجد کے غسل خانہ میں نہا کر ڈاڑھی پھٹکار' عمامہ باندھ' کرتا پہن' چاند سامنہ لے کر منبر پر وعظ کو آن بیٹھتا ہے اور نہایت قرأت سے اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھتا ہے اور بالکل خیال نہیں کرتا کہ جس سے پناہ مانگتا ہے وہ تو منبر ہی پر ہے۔(۲)

خدا' رسول' اسلام' مسلمانوں کے دشمن

ہماری قوم میں قومی ہمدردی نہیں ہے۔ ان کے دلوں کو مولویوں [illegible] سیاہ اور پتھر سے بھی زیادہ سخت کر دیا ہے اور بجز تمنائے حور و قصور غلمان ایمان کا [illegible] ان کے دل میں باقی نہیں رکھا۔(۱)

اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ امورِ معاش وتمدن وحسنِ معاشرت اور علم کی ابتری وخرابی کے سبب روز بروز خراب وذلیل وحقیر وبرباد ہوتے جاتے ہیں اور یہ واعظ و مولوی اور پیرجی خدا و رسول کے دشمن، ان کو روز بروز برباد وتباہ کرتے جاتے ہیں۔[1]

جو کام مسلمانوں کی بھلائی و بہتری اور ترقی کا سوچا جاتا ہے یا کیا جاتا ہے یہ عقل کے دشمن، خدا کے دشمن، رسول کے دشمن، مسلمانوں کے دشمن ایک نہایت مسکینی سے ٹھنڈے سانس بھر کر کہتے ہیں.......... ایسی بات کرو جو وہاں کام آئے۔ دنیا تو گزر ہی جاتی ہے۔ ہاں، جتنی دنیا ہوگی اتنا ہی زیادہ حساب دینا پڑے گا۔ تقدیر پر شاکر رہو۔ انسان کو خدا بھوکا اٹھاتا ہے پر بھوکا سلاتا نہیں۔"[2]

جو لوگ کہ ہماری تدبیروں کی مخالفت کرتے ہیں وہ پکے دشمن اسلام کے اور مسلمانوں کے ہیں۔ تمام باتیں ان کی ظاہری اور محض جھوٹی ہیں۔ اپنے مطلب پر وہ وہ باتیں کرتے ہیں جو ایک ادنیٰ دنیادار بھی نہیں کیا کرتا۔ کیا اس زمانہ کے لوگ واقف نہیں ہیں کہ اپنی غرض پر مولوی نون بسر اور مولوی سین بسر اور مولوی میم بسر اور مولوی عین بسر وغیرہ وغیرہ نے کیا کیا کیا؟[3]

جو مقدس اشخاص علومِ مفیدہ کے حاصل کرنے سے قوم کو باز رکھتے ہیں اور مذہبی تعصب کو کام میں لاتے ہیں اور مذہبی ٹٹی کی آڑ میں لوگوں کو اغوا کرتے ہیں وہ قوم کے، اسلام کے، مسلمانوں کے در حقیقت دشمن ہیں۔ بعض تو صرف اپنی دکان داری اور مشیخت قائم رکھنے کو اور بعضے صرف اپنا تقویٰ اور تقدس لوگوں میں جتانے کو قوم کو غارت کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ دین داری اور ادعائے تقدس محض جھوٹا ہے۔[4]

دنیا کے بندے

خود تو دنیا کے بندے ہیں اور کسی مرید و معتقد کی نذر تک نہیں چھوڑتے مگر زبان سے دنیا کی بے ثباتی اور دنیا کا ہیچ ہونا کہتے ہیں۔ اپنی جیب میں دنیا بھرتے ہیں اور لوگوں کو اس کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے ہیں۔[5]

منبر پر بیٹھ کر دنیا کے ہیچ اور اہلِ دنیا کے کافر ہونے کا وعظ فرماتے ہیں مگر جب سفید سفید گول گول نذر پیش ہوتی ہے تو جھٹ ہاتھ لمبا کر کے اور ایک عجیب شتر غمزہ سے اٹھا کر جیب مبارک میں رکھ لیتے ہیں۔[6]

وہ لوگ جو پیر بن کر شہر بشہر اپنے مریدوں سے ٹیکس وصول کرتے پھرتے ہیں، یا منبر پر بیٹھ کر جھوٹے بیہودہ قصے سنا کر اور واعظ بن کر لوگوں سے روپیہ لیتے پھرتے ہیں، اور بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے تئیں کسی پیر فقیر کے خاندان کا بیان کر کے، کسی درگاہ کا خادم کہہ کر، یا مکہ معظمہ کا

مطوف اور مدینہ منورہ کا زیارت کرنے والا بتا کر روپیہ مانگتے پھرتے ہیں' جو مسلمان ان لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں در حقیقت اپنی قوم کے یعنی مسلمانوں کے دشمن ہیں۔[1]

اسلام کا بھجن گا کر روٹی کمانے والے

اسرارِ اسلام کے سمجھانے والے سب مٹ گئے اور صرف اسلام کا بھجن گا کر روٹی کمانے والے اور اپنا دوزخ بھرنے کو تمام دنیا کو دوزخ میں بھیجنے والے باقی رہ گئے جو بہشت کو خاص اپنی جاگیر سمجھتے ہیں' کفر کے خزانے کے مالک ہیں' اس میں سے ہر ایک کو جتنا جتنا مناسب سمجھتے ہیں تحفہ دیتے ہیں۔[2]

مذہبی ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنے والے

پابندِ مذہب وہ سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے جزئیاتِ مسائل کو فرض و واجب سے بھی اعلیٰ درجہ دیا ہے۔ ان کا کام دن رات ادنیٰ ادنیٰ مسئلوں پر بحث و تکرار کرنا اور سر پھوڑنا اور پھڑوانا ہے۔ تمام دین داری انھوں نے اپنی ظاہری باتوں تعصب' تقشف' تصلب' ترہب پر منحصر کی ہے اور اندرونی نیکی سے کچھ غرض اور تعلق نہیں رکھا۔ ہوائے نفسانی کے پورا کرنے کو حیلِ شرعی کی ٹٹی بنائی ہے اور ٹٹی او جھل شکار کھیلنا اپنا دین اختیار کیا ہے۔[3]

فتوے باز' افترا پرداز

دن رات اس خیال میں مبتلا ہیں کہ مسواک کتنی لمبی اور ازار کتنی اونچی رکھنی چاہئے' نماز میں ہاتھ ناف کے نیچے ہوں یا چھاتی کے اوپر' آمین آہستہ سے کہی جائے یا ایسے پکار کر جس سے مسجد گونج جائے۔ جب اس سے بھی فارغ ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کی تکفیر کے فتوے لکھنے پر مصروف ہوتے ہیں۔ جب اس کا بھی محل نہیں پاتے تو ان کی نسبت جن کو وہ اپنا ساتھی نہیں سمجھتے افترا پردازی اور بہتان بندی کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں۔ غرض کہ بلبلوں کی طرح اسی طرح بولتے رہتے ہیں' دل کی نیکی اور اندرونی حالت کی درستی پر مطلق خیال بھی نہیں جاتا۔[4]

بظاہر پابندِ شریعت مگر دلِ سیاہ

ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ ہماری ہکم تو عمامہ و دستار' جبّہ اور کرتا سے بہت کچھ مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شائستگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں..... ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل پست و افسردہ ہو جاتے ہیں اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور اور اپنے کو بے مثل و نظیر قابلِ ادب سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شائستگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے

ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔[1]

گول عمامہ ' بُرج کی صورت کا عمامہ ' عرب والوں کے عمامہ کی طرح کا عمامہ سر پر باندھے ' شملہ کئی انگل کا چھوٹے ' اس کی تحقیق کئے اور ٹھیک گُدّی کے پیچھے لٹکائے ' ریش مبارک کنگھی پھٹکارے ' قمیض مسنون پہنے ' اس پر صدری عربی لگائے اور اس پر عبائے کسروانی ' جس کو بعضی کتابوں میں خُسروانی منسوب الی کیخسرو کافر بادشاہ فارس لکھا ہے ' زیبِ تن کئے مسجد یا خانقاہ یا کسی مدرسۂ اسلامی میں تشریف رکھتے ہیں۔ بعضے نہایت سادہ سیدھا دیہاتیوں کا سا لباس اپنی سادگی اور محض للّہیت اور خالص بے تکلفی جتانے کو پہنے ہوئے پھرتے ہیں مگر پوچھو تو سہی کہ تمہارے دل بھی کسی لباس پُر تکلف یا ملبوس سادہ سے آراستہ ہیں؟ بجز اس کے کہ مسواک اتنی لمبی ہو اور ڈاڑھی اتنی مٹھی ' پاجامہ اتنا اونچا ہو اور کرتا اتنا نیچا ' اور کچھ نہیں۔ اور کچھ ہے تو یہ ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ سب ثواب اور جو کچھ دوسرا کرے وہ سب عذاب۔[2]

کوئی گمراہی انسان کے لئے اس سے زیادہ نہیں ہے جب وہ جانتا ہے کہ میں پابندِ شریعت ہوں۔ وہ زبان سے اپنے تئیں گنہ گار کہتا ہے مگر اس کا دل اس کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کہنے کو بھی وہ ایک نیکی سمجھتا ہے۔ اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے مگر اس کا دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ ازار کے دو انگل نیچے ہونے ' ڈاڑھی کے لمبی یا یک مشت دو انگشت ہونے ' کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے ' پانی کے پاک ناپاک ہونے پر دن رات بحث کرتا ہے۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے مگر دل کو نجاستوں سے پاک کرنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ اکلِ حلال و صدقِ مقال پر لمبے لمبے وعظ کرتا ہے مگر جب کوئی لقمہ تر آ جائے تو جھپ نگل جاتا ہے ' اور کبھی اگل دیتا ہے تو اس امید پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمہ تر بہ تر آئے گا۔[3]

متکبر و مغرور

کون شخص اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ مُلّا نے مسجدوں میں وعظ کرنے والے ' سر منڈے ' ٹخنہ کھلے ' نرے وہابی یا نیم چڑھے وہابی جس قدر ٹخنہ کھلی ازار پہننے سے متکبر و مغرور معلوم ہوتے ہیں..... اس کا کروڑواں حصہ بھی نیچی ازار پہننے والوں میں تکبر و غرور نہیں ہے۔[4]

مولوی صاحب اور پیر جی صاحب بننے سے جو خوشی دل کو حاصل ہوتی ہے اور تکبر و فخر و غرور انا مقدس کے خیال سے دل کو بالیدگی ہوتی ہے وہ بادشاہ کو بادشاہت میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔

جس [illegible][5]

"مولوی صاحب" سننے کی خوشی' پیش امام بننے کا فخر' منبر پر چڑھ کر خوش الحانی سے عید کا خطبہ پڑھنے کا افتخار' لوگوں کے قدم چومنے' ہاتھ چومنے کی خوشی دل کو ایسا پھلا دیتی ہے جس کی انتہا نہیں۔①

جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گرد اُن کے معتقدین کا حلقہ ہوتا ہے اور حجر اسود کی مانند ان کے دستِ مبارک کے بوسہ دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو ان کا دستِ مبارک یمین الرحمٰن سے بھی بالا دست ہو جاتا ہے۔ "مولوی صاحب" "حضرت صاحب" کی آواز کا چاروں طرف سے ان کے کان میں آنا پادشاہان کسرا و کیقباد کی آواز سے بھی قوی اثر ان کے دل پر ڈالتا ہے۔ مسکینی اور انکسار ان کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے اس لئے وہ اور زیادہ مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اور اس لئے دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی حاجت سے زیادہ بغیر محنت کے درہم و دنانیر لا دیتی ہے اور اس لئے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں ان کی ہر ایک بات پر لوگ آمناّ و صدقنا کہتے ہیں اس لئے دوسرے کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے' ہاتھوں کو چھواتے چھواتے' پاؤں کو چھواتے چھواتے' ہر ایک مشکل کے حل کو دعائیں منگواتے منگواتے' ہر ایک مسئلہ کا فتویٰ دیتے دیتے ایک لو بے معلوم چیز ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب بھلائی برائی' دوزخ و بہشت' کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور کسی کو مرتد' کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت' کبھی خازنِ جنت ہیں اور کبھی مالکِ جہنم۔ خدا کے نور کے دل میں بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول پھلا کر کپا ہو جاتا ہے۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سنیں' نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ دیکھیں' نہ منہ رہتا ہے کہ حق بات کہیں۔ جو سرور اور دلی آسائش اور دل کے پھولنے سے جو مزا اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیا دار کو میسر ہے نہ کسی دولت مند کو اور نہ کسی صاحبِ تخت و سلطنت کو۔②

اصل مذہب کو بگاڑ دینے والے

میں اصلی مذہب اسلام کو' جسے خدا اور رسولؐ نے بتایا ہے' سچ جانتا ہوں' نہ اس کو جسے علما نے اور مقدس مولویوں اور واعظوں نے گھڑا ہے۔③

زندہ مولویوں اور بالتخصیص واعظوں کا تو جانی دشمن ہوں اور گذشتہ مولویوں سے' سوائے چند کے' رنجیدہ ہوں۔ کسی کو' سوائے چند کے' لکھنے اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کی تحقیق کرنے کا مطلق سلیقہ نہ تھا' صرف جنگل میں سے بھلی اور بری لکڑیاں چننے والے تھے۔ خدا ان پر رحم

کرے اور ان کی تقلید کرنے والے اندھوں کو خدا ہدایت دے①

افسوس، صد افسوس! ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف اور روشن مذہب کو ایسی لغو و مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے، اور جب کوئی چاہتا ہے کہ اس کی تحقیقات کرے اور اس پر غور کیا جائے تو اس کو کافر، لامذہب، مرتد، عیسائی، حرام خور، مری مرغی کھانے والا بتاتے ہیں②

ابیض نورانی کے سب محتاج

بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے، بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں مگر ابیض نورانی کا سب کو محتاج پایا③

قابلِ ذکر واقعات

تعصّب کے مظاہر

چلتی ریل میں نماز کا مسئلہ

مجھے یاد ہے کہ اول اول جب ریل جاری ہوئی اس وقت یہ مسئلہ پیش ہوا کہ چلتی ریل میں نماز درست ہے یا نہیں فیصلہ یہ ہوا کہ "نہیں"۔ پھر یہ امر پیش ہوا کہ ریل کا ٹھہرا لینا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، ممکن ہے کہ نماز کے وقت ریل نہ ٹھہرے اور نماز کا وقت جاتا رہے۔ اس پر یہ فیصلہ ہوا کہ ریل پر سوار ہونا ہی جائز نہیں۔ مگر چونکہ اس فیصلے کی مضرت میں مولوی اور عامی سب شامل تھے اسلئے علمائے کرام نے اس بحث کو خاموش کر دیا اور کہا "چپ چپ الضروریات تبیح المحذورات" مگر میں نے بعض مقدس لوگوں کو دیکھا ہے کہ ٹھہری ہوئی ریل سے اتر کر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر نماز پڑھتے ہیں، اور ایسی جلدی سے کہ کراما کاتبین کو بھی اس کے لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ ادھر نیت باندھی اور ادھر ریل چل دی۔ نماز کے بعد حیران بیٹھے ہیں کہ کیا کریں۔ ساتھ کا اسباب بھی ریل کے ساتھ چلا گیا۔ جب بہت سے لوگوں نے پوچھا تو غصے میں آ کر کہا کہ میاں کیا پوچھتے ہو؟ الدنیا سجن المومنین وجنت الکافرین۔ جو کچھ مصیبتیں اس دنیا میں پڑیں ان کو برداشت کرنا چاہیے۔ [1]

ایک مولانا حدیثِ تشبّہ کی زد میں

ایک بزرگ مولوی تھے جو ہر بات میں "من تشبہ بقوم فہو منہم"[۲] سے بہت لوگوں کو کافر بناتے تھے۔ وہ ایک شخص کے پاس، جو ان کے فتوے سے مخالف تھا، بحث کرنے کو تشریف لائے۔ گرمی کا موسم تھا اور دن بھی اخیر ہونے کو تھا۔ وہ شخص ایک دالان میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب بھی (یاد نہیں کہ سلام علیک کر کے یا بلا سلام علیک) آن بیٹھے۔ جب انہوں نے اس مسئلے پر گفتگو چاہی تو اس شخص نے کہا "بہتر ہے کہ ہم سب باہر صحن میں چل بیٹھیں۔ صحن میں ایک تخت اور چند کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ شخص تو تخت پر بیٹھا اور مولوی صاحب کی تعظیم و توقیر کے سبب ان سے کہا کہ آپ اس کرسی پر تشریف رکھیں۔ جب مولوی صاحب کرسی پر بیٹھ گئے تو یہ شخص اٹھا اور آداب بجالایا اور کہا کہ من تشبہ بقوم فہو منہم۔ جب اس قدر توہمات اور بے جا تعصبات قوم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہمارے علما، بعوض اس کے کہ ایسے اوہام کو دور کریں، قوم کے لوگوں میں زیادہ استحکام دیتے ہیں تو کیا توقع ہے کہ قوم کی ترقی ہو؟ خدا ہی ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم کو ثابت قدم رکھے اور ہماری مدد کرے تو کچھ ہو سکے۔ ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا وانصرنا، اس سے زیادہ میں پوری آیت پڑھنا نہیں چاہتا۔[۱]

انگریز کے ساتھ کھانے پر تعجب

بجنور فتح ہونے کے بعد میں اور مسٹر پامر مجسٹریٹ ضلع بجنور نجیب آباد سے بجنور آتے تھے، راستے میں ایک جگہ ہم دونوں اترے اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے مسٹر پامر نے مجھ سے پوچھا کہ چائے پیو گے؟ میں نے کہا کہ یہاں چائے کہاں؟ انہوں نے کہا "ہمارے ساتھ بنی ہوئی بوتل موجود ہے۔" میں نے کہا "بہت بہتر۔" غرض کہ ہم نے چائے پی اور ایک آدھ توس کھایا۔ وہاں سے چل کر نگینے میں مقام ہوا۔ عصر کے وقت سب لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے میں بھی جا کر جماعت میں شریک ہو گیا ———

——— نماز کے بعد لوگوں نے مولوی قادر علی تحصیل دار سے، جو نماز میں شریک تھے، پوچھا کہ صدر امین نے تو انگریز کے ہاں بنی ہوئی چائے پی ہے اور توس کھائے ہیں، پھر یہ نماز میں کیونکر شریک ہوئے؟ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآنِ مجید کی رو سے انگریزوں کے ہاں کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا درست ہے۔ ان لوگوں نے میری اس روز کی تقریر کو نہایت تعجب سے سنا۔ پھر ایک روز بجنور میں رات کو مسٹر پامر کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ کھانے پر جانے والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم بھی کھانا بیٹھو، کھالو" اور خانساماں

کو اشارہ کیا کہ میرے سامنے رکابی لگا دے۔ خانساماں کو اس بات سے ایسا تعجب ہوا کہ کئی دفعہ اشارہ کرنے پر بھی نہ سمجھا کہ آج ایک مسلمان انگریز کے ساتھ کھانا کھائے گا۔[1]

مولوی مہدی علی خاں پر کرسٹان ہونے کا فتویٰ

وہ زمانہ بھی ابھی تک بھولا نہیں ہے جب کہ بعض مسلمان انگلستان سے واپس آئے تو تمام ہندوستان میں خطوط اور اشتہار جاری ہوئے کہ کوئی مسلمان ان کے ساتھ نہ کھائے کیونکہ وہ انگریزوں کے ساتھ کھا چکے ہیں اور اس لئے ان کے ساتھ کھانا حرام ہے۔ وہ زمانہ بھی یاد سے نہیں اترا کہ اگر کسی اشراف اور نیک دل آدمی نے اتفاقیہ ان کے ساتھ کھالیا تو اس کے گھر میں اور ہمسایہ میں برادری میں، محلہ میں رونا پیٹنا پڑ گیا کہ ہے ہے وہ بھی عیسائی ہو گیا۔[2]

مولوی سید مہدی علی خاں مرزاپور سے بنارس میں مجھ سے ملنے کو آئے۔ رات کا وقت تھا اور میرے ہاں کھانے کی باری تھی۔ ہم دونوں★ میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ مہدی علی آ پہنچے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ مولوی مہدی علی نے ایک مسلمان کو اس طرح ایک انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے دیکھا تھا سخت نفرت ہوئی اور باوجود میرے ہاں مہمان ہونے کے کھانا نہ کھایا اور کہا کہ میں کھا چکا ہوں "۔ صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے اس وجہ سے کھانا نہیں کھایا۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو یہ طریقہ ناپسند ہو تو دوسرا بندوبست کیا جائے؟ انہوں نے سوچا کہ شرعاً تو ممنوع نہیں ہے صرف عادت کے خلاف دیکھنے سے نفرت ہوئی ہے، آخر کو قبول کر لیا اور سب سے پہلی دفعہ دن کا کھانا میرے ساتھ میز پر کھایا۔ دن تو اس طرح گزر گیا مگر رات کو یہ مشکل پیش آئی کہ رات کا کھانا مسٹر سائتھیہ کے ہاں تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اگر آپ کو وہاں کھانے میں تامل ہو تو یہاں انتظام کیا جائے؟ انہوں نے پھر اسی خیال سے 'کہ شرعاً ممنوع نہیں' اقرار کر لیا کہ میں بھی وہیں کھالوں گا۔ چنانچہ رات کو وہیں کھانا کھایا۔ پھر ایک آدھ روز بعد مرزاپور واپس چلے گئے۔ الہ آباد میں ان کے ایک دوست کو یہ حال معلوم ہو گیا۔ انہوں نے خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا یہ خبر سچ ہے؟ مولوی مہدی علی نے سارا حال مفصل لکھ بھیجا۔ انہوں نے وہ خط بجنسہٖ ہمارے ایک نامہربان دوست کے پاس 'جو اٹاوہ میں رونق افروز تھے' بھیج دیا۔ انہوں نے تمام شہر میں ڈھنڈرا پیٹ دیا کہ مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔ مولوی صاحب کے گھر کے پاس ہی ایک پینٹھ لگا کرتی تھی۔ ہمارے شفیق نامہربان نے اس گنوار دل میں جا کر خط کا مضمون ایک ایک آدمی کو سنایا اور تمام پینٹھ میں منادی کر دی کہ بھائیو 'افسوس ہے مولوی مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔ جو سنتا تھا افسوس

(270 حیات جاوید، حصہ دوم ص)
★ [illegible] ایک انگریز [illegible] اور مسٹر سائتھیہ (

کرتا تھا اور کہتا تھا "خدا سید احمد خاں پر لعنت کرے۔"[1]★

شیعوں کا تعصب

ایک میرے نہایت دوست شیعہ مذہب تھے۔ ان کے ہاں ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو ایک بکری کا بچہ پال دیا تھا اور وہ خوب اس سے ہل گیا تھا۔ ایک دن اس بکری کے بچے کو ذبح کر ڈالا۔ وہ چھوٹا بچہ خوب رویا۔ اس کے باوا نے اس سے کہا کہ عمر یہ کام کر گیا۔ وہ بچہ عمرؓ کو برا بھلا کہتا تھا۔ یہ کام صرف اس لئے کیا تھا کہ بچپن ہی سے ان کے دل میں عمرؓ کی عداوت اور ان کے نام سے نفرت پیدا ہو[2]

ہندوؤں مسلمانوں کی جداگانہ راہوں کی بنیاد

ہمیشہ میری خواہش یہ تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کے کاموں میں کوشش کریں مگر جب سے ہندو صاحبان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو، جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے، مٹا دیا جائے اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے[3]●

ان ہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے، آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا "اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ

★۔ حالی لکھتے ہیں: "اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کمانا، سقے نے پانی بھرنا اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر والوں نے ان کو لکھا کہ تمہاری بدولت ہم پر سخت تکلیف گزر رہی ہے۔ تم جلدی آؤ اور اس تکلیف کو رفع کرو۔ انہوں نے ایک طول طویل خط ان ہی بزرگ کو، جنہوں نے یہ افواہ اڑائی تھی، حلتِ طعامِ اہلِ کتاب کے باب میں لکھا اور پھر خود اٹاوہ میں آئے اور سب کو سمجھایا کہ میں کرشان نہیں ہوں، جیسا پہلے مسلمان تھا ویسا ہی اب ہوں۔ غرض بڑی مشکل سے لوگوں کا شبہ رفع کیا۔" (حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص 271)

●۔ حالی لکھتے ہیں: "1867ء میں بنارس کے بعض سربر آوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی کے خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔" (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص 140)

ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا"۔ انہوں نے کہا، "اگر آپ کی یہ پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔" میں نے کہا "مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"①

مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہو گا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔②

علمی مجلسیں

سنت اور بدعات کے درجات

ایک دفعہ جناب مولوی محمد صدر الدین خاں بہادر مرحوم کی مجلس میں سنت بدعت کا تذکرہ ہوا اور میں نے کہا کہ گو بدعت اعتقاد سے متعلق ہے مگر حکماً عقائد و اعمال دونوں سے علاقہ رکھتی ہے حتیٰ کہ افعالِ عبادت و عادت و معاملت و کتابت تمام امور سے متعلق ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ آں حضرت صلعم نے کبھی آم نہیں کھایا تو تم آم کھانے کو بھی بدعت کہو گے اور آم نہ کھانے والے کو متبع سنت؟ میں نے عرض کیا کہ ہاں، مگر جیسے درجے فرض و واجب و سنت و مستحب و مباح کے اعمالِ جائز میں ہیں اور جیسے حرام و مکروہ تحریمی و مکروہ تنزیہی اعمالِ ناجائز میں ہیں اسی طرح بدعت کے بھی درجات ہیں کفر سے لے کر ادنیٰ درجہ ترکِ اولیٰ تک۔ جو چیزیں کہ آں حضرت نے تناول فرمائی ہیں جب ان کا کھانا غالباً آپ بھی سنت فرمائیں گے تو جو چیزیں آنحضرت کو ناپسند تھیں ان کا کھانا مکروہ تو ضرور کہا جائے گا اور جو چیزیں اس وقت موجود نہ تھیں ان کا پسند یا ناپسند ہونا مشتبہ ہے۔ پس آم کھانا مکروہ نہ سہی ترکِ اولیٰ تو ہے، اس لئے کہ نہ کھانے میں تو صریح آنحضرت کے ساتھ مطابقت ہے اور کھانے میں امر مشتبہ ہے اور اس لئے ترکِ اولیٰ تو ضرور ہے۔ مولانا اس تقریر سے کسی قدر خفا ہوئے اور فرمایا کہ تم آم کھانے والوں کو کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ان کو تو میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ امر مشتبہ ہے، لیکن اگر آپ نہ کھانے والوں کی نسبت استفسار فرمائیں تو میں عرض کروں۔ مولانا نے فرمایا کہ ان ہی کی نسبت کہو۔ میں نے عرض کیا کہ قسم اس خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر کوئی شخص اس خیال سے آم نہ کھائے کہ آں حضرت صلعم نے نہیں کھایا تو فرشتے اس کے پھوسنے پر اس کے قدم چومیں۔ یہ بات میں نے

نہایت دلی جوش سے کہی۔ مولانا اس کو سن کر چپ ہو رہے .... اخیر کلمہ جس پر مولانا مرحوم خاموش رہے اس کو میں اب بھی ایسا ہی سچ جانتا ہوں جیسا کہ اس وقت جانتا تھا مگر اتنا فرق ہے کہ ایسے شخص کو، جس کا ایسا حال ہو، آں حضرت صلعم کی محبت میں دیوانہ و مرفوع القلم سمجھتا ہوں بشرطیکہ اس نے صرف آم ہی نہ کھانے میں یہ جوشِ محبت نہ ظاہر کیا ہو بلکہ اور تمام باتوں میں بھی اسی طرح عاشقِ رسول اللہ اور آپ کی ہر بات پر دیوانہ ہو۔ مگر یہ ایک خاص حالت ہے، مذہب سے اس کو کچھ تعلق نہیں۔[1]

مولوی نذیر حسین دہلوی اور رفع یدین

جناب مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کو میں نے ہی نیم چڑھا وہابی بنایا ہے، وہ نماز میں رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر اس کو سنت ہدیٰ جانتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو آپ نیک جانتے ہیں لوگوں کے خیال سے اس کو نہیں کرتے۔ جناب ممدوح میرے پاس تشریف لائے تھے جب یہ گفتگو ہوئی۔ میں نے سنا کہ میرے پاس سے اٹھ کر وہ جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھنے گئے اور اس وقت سے رفع یدین کرنے لگے۔[2]

زمین کی ہیئت پر یقین کا نرالا فلسفہ

میں ایک بہت بڑے عالم اور مقدس اور نیک، فرشتہ خصلت کی مجلس کا ذکر کرتا ہوں جو ہمارے شہر میں، بلکہ ہندوستان میں، مقتدا تھے۔ ان کے مدرسہ میں ایک طالب علم نے پوچھا کہ حضرت، تمام علماء علم ہیئت نے تسلیم کیا ہے کہ زمین گول ہے اور بعض حدیثوں سے پایا جاتا ہے کہ مسطح ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ اگر تم اپنی آنکھ سے دیکھ لو کہ زمین گول ہے تو بھی یقین رکھو کہ مسطح ہے۔ لوگوں نے کہا "سبحان اللہ، قوتِ ایمان کے یہ معنی ہیں!" اس وقت ہمارے دل پر بھی ایسا ہی اثر ہوا جو اور لوگوں کے دلوں پر تھا مگر جب آدمی غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا بات ہوئی![1]

مولوی اسمٰعیل دہلوی کی تکفیر

ایک مجلسِ علما میں جناب مولوی اسمٰعیل صاحب مرحوم کی تکفیر کی نسبت گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" کے چند مقام پڑھے اور فرمایا کہ اس سے تحقیر و اہانتِ رسول لازم آتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ لازم آتی ہے یا انہوں نے کی ہے؟ مولانا نے فرمایا "جب کہ الفاظ اہانت پر دال ہیں تو قائل نے اہانت کی ہے ان کی مدلولات سے عدول کی کوئی وجہ نہیں۔" میں نے عرض کیا کہ وجہ تو ہے کہ قائل ان الفاظ کا محمد رسول اللہ کا قائل ہے، جس کی تصدیق، تحقیر و اہانت کے منافی ہے، پس قائل نے تو تحقیر و اہانت نہیں کی، مگر آپ اس سے

لازم گردانتے ہیں۔" وہذا فعلکم لیس فعل القائل" جو شخص کہ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی تصدیق کرتا ہے اسکے کسی قول سے انکارِ شہادتِ رسول یا انکارِ قرآن یا تکذیبِ رسول قرار دینا نہایت جہالت و محض نادانی ہے۔ ①

واقعات عامتہ الورود

امرِ اتفاقی اور مکاشفہ

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں جن کو اکثر ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ مگر جو لوگ کہ اہل اللہ کہلاتے ہیں وہ اور ان کے معتقدین اس کو کرشمۂ ربانی سمجھتے ہیں، اور جو لوگ اہلِ دنیا کہلاتے ہیں وہ ان کو واقعاتِ اتفاقی سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرتے...... ایک واقعہ ہم پر قریب قریب اس کے گزرا ہے۔ میں جب دہلی سے رہتک جانے والا تھا، حضرت شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں رخصت کے لئے حاضر ہوا۔ اس وقت ایک عورت ایک نہایت تروتازہ رنگترہ لائی اور شاہ احمد سعید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس کو لے کر رکھ لیا۔ میرے دل میں یہ بات آئی کہ اگر شاہ صاحب یہ رنگترہ مجھ کو دے دیں تو میرے سفر کے لئے ایک فال نیک ہو گی۔ جب میں رخصت ہو کر جانے لگا تو شاہ صاحب نے وہ رنگترہ اٹھا کر مجھ کو دے دیا کہ آپ اس کو لیتے جائیے۔ میں چونکہ ایک دنیادار تھا، اور گو شاہ صاحب کی خدمت میں مجھ کو عقیدت تھی اور ہے، مگر اس کو ایک امرِ اتفاقی سمجھا، اور جو لوگ کہ مریدانِ خاص شاہ صاحب کے تھے انہوں نے اس امر کو خطراتِ قلب پر بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا قرار پایا۔ ②

احساسِ مؤاخذہ

بنارس میں ایک نہایت مقدس اور بزرگ شخص مجھ کو ملنے کو آئے جب کہ میں انگلستان سے واپس آیا تھا، اور ان بزرگ کا ارادہ تھا کہ میرے ہاں رات کو رہیں مگر کھانا دوسری جگہ کھائیں۔ مجھ کو یہ امر پسند نہ آیا اور میں نے کہا کہ جہاں آپ کھانا کھائیں گے وہیں رات کو بھی رہیں۔" وہ بزرگ تھوڑی دیر مل کر چلے گئے۔ اُن کے جانے کے بعد مجھ کو نہایت رنج و افسوس ہوا کہ میں نے یہ بات نہایت خلافِ آدمیت اور خلافِ مروّت اور خلافِ اخلاق کی، مگر چونکہ میں دنیادار تھا اس لئے میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ خدا نے مجھ سے مؤاخذہ کیا ہے۔ پس یہ عام واقعات ہیں جو کم و بیش ہر ایک کو پیش آتے ہیں۔ اہل اللہ ان کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اہلِ دنیا ان کو اتفاقی بات سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ ③

قومی مسائل

فاضلِ دیوبند اور جمعرات کی روٹیاں

میرے ایک دوست کا ایک رشتہ دار دیوبند ضلع سہارن پور کے مدرسہ میں، جو لوگوں کے ماہواری یا سالانہ چندہ سے ان ہی قدیم علموں کی تعلیم کے لئے قائم ہے، تعلیم پاتا تھا۔ اس نے تمام علوم پڑھ کر فراغت حاصل کی، فضیلت کی پگڑی سر پر باندھی، مدرسہ سے علیحدہ ہو کر اس نے میرے دوست کو لکھا کہ اب میں کیا کروں؟ میرے دوست نے، جو اُن کا رشتہ مند ہے، جواب دیا کہ دنیا میں کام آنے کے لائق تو تم نے کوئی چیز سیکھی نہیں۔ اب بجز اس کے اَور کوئی چارہ نہیں کہ کسی مسجد یا چوپال میں جا کر بیٹھو اور مُردوں کے فاتحوں کی اور جمعرات کی روٹی پر گزر کرو، اور دن رات ان ہی الفاظ کو یاد کرتے رہو جو بجز فرضی اور اصطلاحی معنوں کے اَور کوئی حقیقت اصلی نہیں رکھتے۔ (1)

کرشانی کے خطاب پر خوشی

ہمارے ایک دوست نے ہم سے نقل کی کہ ضلع سہارن پور میں ہمارے حال پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے کہا کہ اس کے مسلمانوں کے دوست ہونے میں تو کچھ شک نہیں مگر نادان دوست ہے۔" ایک صاحب نے کہا کہ "ہے تو وہ کرشان، مگر ہماری قوم کی بھلائی اور ترقی اگر ہوگی تو اسی کرشان سے ہوگی۔ یہ نقل سن کر میں نہایت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہو تو اس کرشانی کے خطاب پر ہزار مسلمانی نثار ہے۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگان بدعا آرزو کنند (2)

دہلی کی باتیں

لوہے کی لاٹ پر تماشا

جب کہ عوام الناس اس لاٹ کے دیکھنے کو آتے ہیں اس وقت بڑا تماشا ہوتا ہے یعنی عوام الناس میں یہ مشہور ہے کہ جس شخص کی کولی میں یہ لاٹ آجاتی ہے وہ تو حلال کا ہوتا ہے اور جس کی کولی میں نہیں آتی وہ حرام کا ہوتا ہے، اور اس سبب سے کہ وہ لاٹ گاؤدم بنی ہوئی ہے یعنی لمبے قد کے آدمی کی تو کولی میں آجاتی ہے اور ٹھگنے قد کے آدمی کی کولی میں نہیں آتی اور لوگ اس کو چھیڑتے ہیں اور "حرام کا ہے حرام کا ہے" کہتے ہیں اور وہ کھسیانا ہوتا ہے۔ میں اس لاٹ کا حال بیٹھا ہوا لکھ

رہتا تھا کہ یکایک بہت عورتیں جوان جوان خوب صورت آئیں اور اس لاٹ کو کولی میں لیا۔ اتفاق سے ان میں ایک عورت کی کولی میں' جو سب سے خوب صورت تھی' یہ لاٹ نہ آئی اور سب نے اس کو چھیڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ روٹھی ہو گئی۔ میں ایک کونا میں بیٹھا ہوا چپکا نقشہ کھینچ رہا تھا اور حال لکھتا تھا خدا جانے ان عورتوں نے کیا جانا' کوئی مُلّا یا سیانا یا خادم سمجھ کر مجھ سے پوچھا کہ کیوں میاں جی' جس کی کولی میں یہ لاٹ نہ آئے وہ حرام کا ہوتا ہے یا نہیں؟ میں اپنے دل میں بہت ہنسا اور اپنے دل سے کہا کہ خوب منصفی کرنی پڑی! لاچار میں نے ان سے کہا کہ بیس برس کی عمر سے سوا میں ناپنے کا اعتبار کیا جاتا ہے' اگر تمہاری عمریں اتنی ہیں تو میں بتاؤں۔ چونکہ ان میں سے کسی کی عمر اس قدر نہ تھی' ہنس کر چلی گئیں۔ میں پھر اپنا کام کرنے لگا۔

علی الصباح چو مردم بکاروبار روند
بلا کشان محبت بکوئے یار روند[11]

پرانے حکیموں کی خصلت

دہلی جو مدت دراز سے مخزن طبِ یونانی کا ہے اور کوئی شہر اور قصبہ ایسا نہیں جس نے دہلی کے حکما سے فیض نہ پایا ہو اس زمانہ میں جیسا دہلی مخزن علمِ حدیث کا تھا ویسا ہی علم طب کا بھی ضرور تھا کہ مدرسہ دہلی میں بنے اور دہلی کے خاندان کے لوگ اس کو چلائیں.....ہمارے دہلی کے طبیبوں اور علی الخصوص حکیم محمود خاں مرحوم والد عبدالمجید خاں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ بیمار فقیر سے فقیر ہو' چمار یا حلال خور ہو' امیر سے امیر ہو کوئی فرق علاج میں نہیں کرتے تھے۔ خدا بخشے حکیم احسن اللہ خاں کو' جو بادشاہ کے ہاں بڑے حکیم تھے' ایک روز بادشاہ کے ہاں پالکی میں جاتے تھے۔ ایک حلال خور نے کہا کہ میری جورو بیمار ہے۔ پالکی میں سے اترے اور جا کر مریضہ کو دیکھا اور نسخہ لکھ دیا۔ یہ خاص صفت ہمارے اس ویران دہلی کے خاندانوں کی ہے میں بھی مدت سے دہلی میں رہتا تھا۔ مجھ کو یاد نہیں کہ ہمارے حکیم جو لوگوں کے گھر جاتے تھے وہ ایک پیسہ بھی کسی مسلمان خاندان سے لیتے ہوں۔ وہ اپنا فرض سمجھتے تھے کہ ہم حکیم ہیں اور علاج کرنا ہمارا فرض ہے۔[12]

غدر سے پہلے لوگوں کی بے خبری کا عالم

ایک دفعہ جو میں رہتک سے کسی تحصیل میں دِلّی آیا تو یہاں کے ایک معزز آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کہاں گئے تھے؟ اور جب میں نے رہتک کا نام لیا تو انھوں نے تعجب سے کہا کہ کیا رہتک بھی انگریزوں کی عملداری میں ہے؟.......دِلّی کے اکثر پڑھے لکھے آدمی ہر ایک بستی کو

مٹکاف کہتے تھے کیونکہ پہلے مجسٹریٹ کا نام مٹکاف تھا۔①

متفرق

مذہب اور ترکِ دنیا

لندن میں ایک یورپین لامذہب میرا دوست تھا۔ اس کو اس بات کے معلوم ہونے سے کہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کو اور ان کی وعظ و نصائح کو، جو انجیلوں میں مندرج ہیں، مانتا ہوں، نہایت تعجب تھا۔ لندن میں دستور ہے کہ کہ اتوار کے دن تمام دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور اگر ایک دن پہلے نہ خرید لیں تو کھانے پینے کی بھی کوئی چیز نہیں ملتی۔ ایک دفعہ وہ دوست اتوار کے دن کھانے کے وقت مجھ سے ملنے آیا اور میز پر تمام کھانے کی چیز چنی ہوئی دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگا کہ آج سب چیزیں آپ کو کیونکر میسر ہوئیں؟ میں نے کہا کہ ہفتہ کے دن سب کچھ لے رکھا تھا۔ وہ ہنس کر بولا کہ خوب ہوا جو آپ نے حضرت مسیح کے اس قول پر کہ "اس بات کی فکر مت کرو کہ کل کیا کھاؤ گے" عمل نہیں کیا ورنہ آج بھوکے رہ جاتے۔ میں نے ہنس کر یہ کہا کہ یہ مطلب اس کا نہیں۔ پس جو مسلمان کہ خلافِ قانونِ قدرت ترکِ دنیا کا وعظ فرماتے ہیں وہ اسی طرح سے اپنے مذہب کو مضحکہ بناتے ہیں۔②

مرض مراق اور سورہ یٰسین

ہمارے خالہ زاد ایک بھائی تھے۔ انکو نہایت درجہ کا مراق تھا یہاں تک کہ وہ ہائے ہائے کر کے چلایا کرتے تھے۔ ایک نہایت بزرگ نے ان سے کہا کہ میاں، تم خود ہر روز سورہ یٰسین پڑھ کر اپنے پر دم کر لیا کرو اور دل پر پھونک لیا کرو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور صحتِ کامل ہو گئی۔ وہ ہمیشہ وہ سورہ پڑھ لیا کرتے تھے اور پھر ان کو کبھی مراق نہیں ہوا۔③

مسمریزم کے مشاہدات

معمول بنانے کا عمل

چند سال ہوئے کہ پروفیسر بشل، جو اس فن میں بہت مشاق تھا ہندوستان میں آیا تھا اور بنارس میں اس نے تین جلسے اس فن کی تاثیرات دکھانے کو کیے تھے۔ پہلی شب میں بنارس کے ٹاؤن ہال میں جو ایک بہت وسیع کمرہ ہے جلسہ ہوا تھا۔ کمرے میں روشنی معمول سے زیادہ تھی اور بہت کثرت سے ہندوستانی اور انگریز اور لیڈیاں جمع تھیں۔ پروفیسر بشل نے اول ایک مختصر لیکچر دیا جس میں بیان کیا کہ [illegible]

جو دوسرے یعنی معمول پر اثر کرتی ہے۔ اس کے بعد اس نے حاضرین سے درخواست کی کہ جن صاحبوں کو معمول ہونا منظور ہو وہ اٹھ کر میرے پاس آ جائیں چنانچہ بارہ چودہ آدمی اٹھ کر گئے جن میں دو یا تین فوجی گورے اور ایک نہایت معزز جنرل فوج جس کا نام مجھ کو یاد نہیں رہا اور چند ہندوستانی شامل تھے۔ پروفیسر نے ان کو کرسیوں پر بٹھا دیا اس طرح پر کہ ان کی پیٹھ مجمع کی طرف تھی اور ہر ایک ہاتھ پر چمک دار پیسہ یا اور کوئی چیز رکھ دی اور ان سے درخواست کی کہ آپ دلی توجہ سے اس کو دیکھتے رہیں اور اسی طرف خیال رکھیں اور دوسری طرف نہ توجہ کریں، نہ خیال بھٹکائیں۔ پروفیسر بشل ان کے سامنے ٹہلتا تھا اور ان کو گھورتا جاتا تھا اور اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا تھا اور شاید پھونکتا بھی جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہر ایک کا پوٹا اٹھا کر ان کی آنکھ کو دیکھا، چند آدمیوں کی نسبت جن میں وہ گورے اور جنرل اور چند ہندوستانی شامل تھے، کہا کہ یہ معمول ہو گئے، ان کو علیحدہ کرسیوں پر بٹھا دیا اور باقیوں کو اٹھا دیا کہ یہ معمول نہیں ہوئے، دیر میں ہو سکتے ہیں مگر اس قدر دیر ہونے سے لوگوں کو تکلیف ہو گی جو لوگ معمول ہوئے تھے وہ اس کی مرضی کے تابع تھے اور جو کہتا تھا کرتے تھے۔[1]

ہاتھوں کی بے حرکتی

اس نے ایک گورے کو کھڑا کیا، اس کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا "خشک ہو جا۔" اس کا ہاتھ ویسے کا ویسا ہی رہ گیا اور کسی طرح نیچا نہیں ہو سکتا تھا اور ہاتھ کے جوڑوں میں بھی کچھ حرکت نہ تھی۔ جب اس نے کہا کہ درست ہو جا، ہاتھ بدستور سابق ہو گیا اس گورے نے ہاتھ نیچا کر لیا اور سب جوڑ معمولی طور پر حرکت کرتے تھے۔[2]

پاؤں کا انجماد

پھر اس نے ایک کو کھڑا کیا اور اس کے پاؤں پر ہاتھ لگا کر کہا کہ یہاں سے نہ ہلے، نہ اٹھے۔ اس کا پاؤں زمین پر ایسا جم گیا کہ کسی طرح وہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا جب تک اس نے اجازت نہیں دی۔[3]

خود فراموشی

پھر اس نے ایک کو کھڑا کیا اور کن پٹی پر انگلی رکھ کر کہا کہ تم سب کچھ بھول گئے۔ اس کو کوئی چیز یاد نہ تھی۔ نہ اس کو اپنا نام یاد تھا، نہ اپنا عہدہ، نہ وہ پلٹن جس سے وہ متعلق تھا۔ پروفیسر نے غلط نام لے کر کہا کہ تیرا نام یہ ہے۔ وہ گورا وہی اپنا غلط نام بتاتا تھا، اسی طرح غلط مسکن اور غلط پلٹن۔ غرض کہ جو پروفیسر کہتا تھا وہی کہتا تھا جب تک کہ اس نے اس کے دماغ کو درست نہیں

فوجی جنرل کی بے چارگی

اس نے جنرل کو بھی متعدد دفعہ دق کیا تھا۔ اخیر کو جنرل کو کھڑا کیا اور کہا کہ تمہارے کوٹ میں آگ لگ گئی۔ جنرل بے تاب ہو کر پہلے ہاتھوں سے کوٹ کو ملنے لگا' گویا آگ بجھاتا ہے' اخیر جلدی سے کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ پھر پروفیسر نے کہا "کچھ نہیں' کوٹ اٹھالو اور پہن لو۔" یہ جنرل کوٹ پہن کر کرسی پر جا بیٹھا مگر ایسا دق ہو گیا تھا کہ چپکے سے کرسی پر سے اٹھ کر بھاگ چلا۔ کمرے سے باہر برانڈے تک گیا تھا کہ پروفیسر نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو ٹیڑھا کر کے اس کی طرف کیا۔ وہ جنرل اسی طرح پر کھنچا چلا آیا کہ گویا اس میں رسیاں بندھی تھیں اور ان سے کھنچا چلا آیا۔①

ناکام مجلس

دوسرا جلسہ مہاراجہ وزیانگرام کی کوٹھی پر ہوا۔ ایک سہ دری تھی اور اس کے آگے وسیع چبوترا تھا اور سب لوگوں کی نشست چبوترے پر تھی۔ آدمی کثرت سے تھے۔ سہ دری میں اور چبوترے پر روشنی کثرت سے تھی۔ جب پروفیسر بشل آ گیا تو اس نے مکان کو' جو صرف سہ دری اور کھلا ہوا چبوترہ تھا' اور کثرت سے روشنی ہونے کو ناپسند کیا۔ روشنی کسی قدر کم کی گئی مگر لوگوں میں محض خاموشی اور سکوت نہ ہوا اور لوگوں کی کھُس پھُس سے بلاشبہ دھیان بٹتا تھا۔ پروفیسر نے چند آدمی اپنے سامنے بٹھائے اور ہر چند کوشش کی مگر ایک بھی معمول نہ ہوا۔ پروفیسر نے کہا " نہ مکان ٹھیک ہے' نہ روشنی درست ہے اور کھُس پھُس بند ہوتی ہے' عمل ہونا غیر ممکن ہے۔" پس مجلس برخاست ہو گئی۔②

الٹی کرسی کا گھوڑا

تیسرا جلسہ مہاراجہ بنارس کی کوٹھی ٹکسال والی میں ہوا۔ ایک وسیع کمرے میں' اس میں معمولی روشنی اور بخوبی خاموشی تھی' بعد معمولی کارروائی کے چند شخص معمول ہوئے...... پروفیسر نے ایک کرسی الٹ دی اور ایک شخص سے' جو معمول ہو چکا تھا اور وہ ایک گورا تھا' اس کو کہا کہ گھوڑا موجود ہے' اس پر سوار ہو۔ وہ اچک کر اُس پر جا بیٹھا اور گھوڑے کی طرح ہانکنے لگا۔ اس نے غالباً اس کو گھوڑا سمجھا مگر اور دیکھنے والے سب اس کو الٹی ہوئی کرسی دیکھتے تھے۔③

لکڑی کا سانپ

ایک لکڑی ہاتھ میں رکھنے کی ڈال دی اور اسی گورے سے' جو گھوڑے پر چڑھا تھا' کہا کہ سانپ ہے' سانپ کو مارو۔ گورے نے ایک لکڑی سے اس کو مارنا شروع کیا۔ غالباً وہ اس کو سانپ سمجھا مگر ہم سب کو وہ لکڑی جو وہ کھلائی دی تھی۔④

جسم کا تناؤ

پروفیسر نے ایک ہندوستانی آدمی کو، جو معمول ہو گیا تھا، چت لٹایا اور ہاتھوں سے اشارہ کیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کا سارا بدن مثل لکڑی کے سخت ہو گیا۔ پروفیسر نے دو کرسیاں آمنے سامنے بقدر اس شخص کے قد کے فاصلے کے رکھیں اور دو آدمیوں نے اس شخص کی لاش کو اٹھایا۔ اس کا سر ایک کرسی پر اور پاؤں کی ایڑھیاں دوسری کرسی پر رکھ دیں اور اس کی لاش مثل لکڑی کے سیدھی تنی رہی، اور وہ بالکل بے ہوش تھا۔ اس کے بعد پروفیسر نے ایک بابو بنگالی کو، جو وہاں موجود تھا اور غالباً وہ من جملہ ان لوگوں کے نہیں تھا جو معمول ہوئے تھے، کہا کہ اس شخص پر بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا مگر اس کی لاش میں کچھ خم نہیں ہوا، مثل لکڑی کے کرسیوں پر تنی ہوئی تھی۔ اس وقت مہاراجہ صاحب بنارس نے پروفیسر سے کہا کہ دیکھو، یہ شخص مرجائے گا، اس کو تکلیف ہوگی۔ پروفیسر نے کہا کہ اس کو کچھ تکلیف نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اس کے منہ کے سامنے ہاتھ نچائے۔ اس شخص نے آنکھیں کھول دیں مگر اس کا سارا جسم بدستور لکڑی کی مانند کرسیوں پر تنا ہوا تھا۔ پروفیسر نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کچھ تکلیف ہے؟ اس نے کہا "کچھ نہیں۔" اس نے پوچھا کہ تمہارے بدن کو کیا ہوا؟ اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں۔"[1]

چند خواب

(صیغہ متکلم میں★)

قیدی دیو کا اٹھا کر پٹک دینا

میں نے اپنے نہایت چھٹ پن کے زمانہ میں پہلے ہی پہل حالت بیداری میں قیدیوں کو دیکھا جو جیل خانہ کے کپڑے پہنے ہوئے اور بیڑیاں پاؤں میں پڑی ہوئی، پریشان سر کے بال سڑک

★۔ حالی لکھتے ہیں "جس زمانہ میں سرسید سورہ یوسف کی تفسیر لکھتے تھے تو خواب پر اپنی رائے قائم کرنے کے لئے لوگوں سے ان کے خوابوں کا حال پوچھتے تھے اور ان پر غور کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں انہوں نے اپنے گزشتہ زمانے کے خواب جہاں تک کہ ان کو یاد آئے، جمع کیے تھے اور ان کو کاتب سے صاف کرایا.......... سرسید نے خواب ایسے طور پر لکھوائے ہیں کہ گویا دوسرا شخص ان کے خواب لکھ رہا ہے۔" (حیات جاوید، ضمیمہ نمبر 3، صفحہ 7)

چونکہ بیان اور واقعات سرسید کے اپنے ہیں لہٰذا راقم نے کتاب ہذا کے عنوان کو مدنظر رکھتے ہوئے مطالعہ میں روانی کی خاطر ان کے بیان میں کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر ان سے متعلق صیغہ غائب کو متکلم میں بدل دیا ہے۔ اصل الفاظ کے تعین کے لئے سرسید سے منسوب الفاظ صیغہ متکلم کو جمع غائب میں بدل دینے کے بعد بعض جگہ انہوں

[illegible]

ہے مگر کٹی ہوئی پوروں کے سرے، جہاں سے کٹے ہیں، نہایت سرخ لہو کی مانند ہو رہے ہیں۔ میں نہایت حیران ہوا کہ اب کیا کروں۔ اتنے میں ایک بزرگ آئے اور انہوں نے ان کٹی ہوئی انگلیوں کے سروں پر اپنا لب مبارک لگا دیا۔ اسی وقت ان انگلیوں میں نمو شروع ہوا اور سب انگلیاں درست ہو گئیں اور ان میں چاند سے زیادہ روشنی تھی۔ میں چاند کو دیکھتا اور ان نئی انگلیوں کو دیکھتا اور ان میں چاند سے زیادہ روشنی پاتا تھا۔ خواب ہی میں مجھ کو کسی طرح یقین ہوا کہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جنھوں نے لب مبارک لگایا تھا۔[1]

مرحوم بیوی کا نورانی جسم

مراد آباد میں میری بیوی کا انتقال ہوا۔ چند روز بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک نہایت عمدہ مکان میں بیٹھی ہیں اور نہایت عمدہ سبز لباس پہنے ہوئے ہیں اور ان کا بدن اور چہرہ چاند کے مانند روشن ہے۔ میں نے ان کو ہاتھ سے چھونا چاہا۔ انہوں نے کہا "یہ جسم ہاتھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ نورانی جسم اور لباس ہے۔ دنیا میں جو جسم اور لباس تھا وہ نہیں ہے"[2]

شاہ غلام علی کی دعوتِ بیعت

جب میں دہلی میں منصف تھا میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب میرے کمرے میں موجود ہیں اور جس طرح وہ خانقاہ میں بیٹھتے تھے اسی طرح ایک سوزنی پر، جو صدر مقام پر بچھی ہوئی تھی، بیٹھے ہیں۔ میں ان کے پاس بیٹھا ہوں۔ شاہ صاحب مجھ پر اسی طرح، جیسی کہ ان کی عادت تھی، مہربانی فرماتے ہیں اور یہ کہا کہ اب تم بھی بیعت کر لو۔[3]

شاہ احمد سعید کے درسِ حدیث میں شمولیت کی ہدایت

دہلی میں میں نے دیکھا کہ میں خانقاہ میں گیا ہوں۔ وہاں میرے والد اور شاہ ابو سعید صاحب جو بعد حضرت شاہ غلام علی صاحب کے ان کے سجادہ نشین ہوئے اور جن کا اس زمانہ میں انتقال ہو چکا تھا اور لوگ جو خانقاہ میں ہوتے تھے، موجود ہیں اور شاہ احمد سعید صاحب، جو بعد شاہ ابو سعید صاحب کے سجادہ نشین ہوئے، علیحدہ ایک طرف بیٹھے ہوئے ہاشم علی خاں کو، جو میرے ماموں کے بیٹے تھے، حدیث کی کسی کتاب کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ میرے والد نے یا شاہ ابو سعید صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم بھی ہاشم علی خاں کے ساتھ سبق میں شریک ہو جاؤ۔[4]

شاہ غلام علی کی روح سے استفسار

میں دہلی میں منصف تھا اور مجھ کو کچھ تردد لاحق اور رنج تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم بیس رکعتیں نماز کی تین دن تک بطور تراویح کے پڑھو اور

پہلی رکعت میں فلاں سورۃ اور دوسری میں فلاں سورۃ پڑھو اور رکعتوں کے بعد کے جلسہ میں یہ آیت پڑھو، کوئی رنج و تردد کی بات نہیں مگر میں جب اٹھا تو بھول گیا کہ کون سی سورتیں اور کون سی آیت پڑھنے کو بتلائی تھی۔ میں نے شاہ احمد سعید صاحب کو ایک رقعہ لکھا کہ میں وہ سورتیں اور آیت بھول گیا ہوں۔ چار پانچ روز تک شاہ احمد سعید نے کچھ جواب نہیں بھیجا۔ اس کے بعد ایک پرچہ پر ان سورتوں کے نام اور ایک آیت لکھ بھیجی۔ اس وقت میرے خیال میں یہ بات آئی کہ یہی سورتیں اور آیت بتلائی تھی۔ میں نے جس طرح خواب میں دیکھا تھا نماز پڑھی۔ چند روز بعد جب شاہ احمد سعید صاحب سے ملا تو پوچھا کہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ وہ سورتیں اور آیت بتلائی تھی؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کی روح سے پوچھا تھا اور ان کی روح نے بتلایا کہ یہ سورتیں اور آیت بتائی تھی۔[1]

شاہ عبدالغنی کا انگریز کے نوکر سے نذرانہ لینے سے انکار

میں دلی میں منصف ہی تھا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میں گویا بیعت کے ارادے سے خانقاہ جانے کو اپنے کمرے پر سے اترا ہوں۔ تھوڑی دیر چلا تھا کہ مجھ کو خیال ہوا کہ نذر کے لئے کچھ لے لینا چاہئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک ہندو دوست میرے پاس کھڑا ہے۔ میں نے پندرہ روپیہ اس سے قرض لئے اور خانقاہ میں گیا۔ وہاں دیکھا کہ شاہ ابو سعید صاحب اور ان کے پاس شاہ احمد سعید اور ان کے پاس شاہ عبدالغنی صاحب اور سب کے پیچھے میاں محمد مظہر بیٹھے ہیں۔ شاہ ابو سعید صاحب نے بیعت کر لینے کو فرمایا۔ میں نے کہا "میں تو اسی ارادے سے آیا ہوں لیکن بالکل جو طریقہ مسنون ہے اسی پر بیعت کرنی چاہتا ہوں۔ فرض کرو کہ اس قسم کے زہد و مجاہدہ میں، جو مسنون نہیں ہیں، صفائی قلب جلد حاصل ہوتی ہو اور جو طریقہ مسنون ہے اس میں بہ دیر حاصل ہوتی ہو تو مجھے وہ جلدی نہیں بلکہ وہ دیر پسند ہے۔" ہنوز شاہ صاحب نے جواب نہیں دیا تھا کہ میاں مظہر بولے کہ دیکھئے حضرت، یہ کیسی وہابیوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ اسکے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ نقش بندی طریقے میں کوئی امر بھی خلافِ سنت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ اس وقت میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر بعد بیعت کے نذر دی جائے گی تو گویا اس کا معاوضہ ہو گا۔ بہتر ہے کہ پہلے نذر دی جائے اور اس کے بعد بیعت ہو۔ پس میں نے پانچ روپیہ نکال کر شاہ ابو سعید صاحب کی نذر کئے اور پانچ روپیہ شاہ احمد سعید صاحب کے۔ دونوں صاحبوں نے نذریں لے لیں۔ جب شاہ عبدالغنی صاحب کو نذر دی تو انہوں نے کہا کہ تم انگریزوں کے نوکر ہو، میں نہیں لیتا۔ میں نے کہا "میری تنخواہ کا روپیہ نہیں ہے، میں تو ایک ..." انہوں نے لینے سے انکار کیا۔ شاہ ابو سعید صاحب نے

فرمایا کہ یہ نہیں لیتے تو ان کی والدہ کے پاس بھیج دو۔ اس گفتگو کے بعد نوبتِ بعیت نہیں پہنچی تھی کہ آنکھ کھل گئی۔[1] ★

شاہ غلام علی سے عقیدت کی شدت کا عالم

علی گڑھ میں میں نے دیکھا کہ میں دہلی میں کسی مقام پر ہوں اور شاہ غلام علی صاحب کی نسبت، جو کہ بیمار ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ اب اخیر وقت ہے۔ میں نہایت بے قرار ہوا اور اس خیال سے کہ ان کی اخیر زیارت کرلوں اس جگہ گیا جہاں شاہ غلام علی صاحب تھے۔ دیکھا کہ پلنگ پر لیٹے ہیں، منہ اور پاؤں کھلے ہوئے ہیں اور سارا بدن کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے..... میں نے بعینہٖ وہی حالت دیکھی اور ویسا ہی پلنگ اور تمام چیزیں دیکھیں جیسے کہ حضرت کے انتقال کے دو ایک روز پہلے میں نے دیکھا تھا۔ غرض کہ میں مضطرب ہو کر ان کے پاؤں کی انگلیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تم سید ہو، ایسا مت کرو۔ ایک عجیب بات میں نے یہ کی کہ اس خواب کے چند روز بعد جب میں دہلی گیا تو شاہ غلام علی صاحب کے مزار پر گیا اور کہا کہ دادا حضرت، اب آپ تو زندہ نہیں ہیں ورنہ میں آپ کے پاؤں سے آنکھیں ملتا، مگر میں آپ کی قبر سے آنکھیں ملتا ہوں۔ یہ کہہ کر قبر کی پائنتی سے آنکھیں ملیں۔ میری اس حرکت کو سن کر لوگ نہایت متعجب ہوں گے مگر میری یہ حرکت صرف محبت کی وجہ سے تھی، نہ کسی اَور خیال سے۔[2]

★۔ شاہ عبدالغنی کے اس نذر لینے سے انکار کے پس منظر میں سرسید لکھتے ہیں "دہلی میں جو لوگ مقدس تھے وہ انگریزوں کی ایسی نوکری کو، جس میں انفصالِ مقدمات کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ بطور عملہ کے کام کرنا ہوتا تھا، اور نیز پولیس کی نوکری کو جائز سمجھتے تھے۔ اور جن عہدوں میں انفصالِ مقدمات کا کام ہوتا تھا، جیسے منصفی اور صدر الصدوری، اس نوکری کو ناجائز سمجھتے تھے کیونکہ خلافِ شرع بموجب انگریزی قانون کے مقدمات فیصل کرنے پڑتے تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحب کا بھی یہی حال تھا اور اسی سبب سے انہوں نے نذر لینے سے انکار کیا تھا۔" (حیاتِ جاوید، ضمیمہ نمبر ۲، ص ۲۰۰)

ذاتی اوصاف

شکل وشباہت اور طرزِ بُود وباش★

گلے میں رسولی

میرے گلے میں ایک رسولی ہے اور اسی جگہ میرے باپ کے بھی رسولی تھی' ایک مسلمان درویش کی توجہ سے وہ رسولی بالکل جاتی رہی تھی۔①

اوضاع واطوار

میری کوٹھی ظاہراً خوش فضا ہے۔ ہمیشہ دو کمرے عمدہ مع تمام ضروریاتِ متعلقہ کے خالی

❀ حالی سرسید کے حلیے کی تفصیل یوں لکھتے ہیں۔ "رنگ سرخ و سفید' پیشانی بلند' سر بڑا اور موزوں' بھویں جدا جدا ' آنکھیں روشن نہ چھوٹی نہ بڑی' ناک نسبتاً چہرہ کی شان کے مقابلہ میں کسی قدر چھوٹی' کان لمبے' گلے میں دائیں جانب رسولی جو ہمیشہ ڈاڑھی میں چھپی رہتی تھی...... جسم بہت فربہ' قد لمبا مگر جسم کی فربہی کے سبب میانہ نما' ہڈی چکلی' ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء نہایت قوی اور زبردست اور متناسب' بدن ٹھوس' وزن ساڑھے تین من۔" (حیاتِ جاوید' حصہ دوم' ص 445)

★ 1885ء میں کرنل گراہم لکھتے ہیں کہ "سرسید اب کئی سال سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہتے ہیں۔ یہ مکان ان کے لئے ان کے بیٹے سید محمود نے خرید کیا اور اس کو یورپین طرز پر سجایا ہے یہاں پر وہ اپنے بے شمار دوستوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں جن میں مسلمان' سکھ' ہندو اور انگریز سب شامل ہیں اور یہ دوست ہندوستان کے ہر حصہ سے ان کے پاس آتے ہیں۔ اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس پر ادبی ماحول چھایا ہوا ہے۔ ان کے بیٹھنے کے کمرہ میں جہاں وہ اپنے دن کا زیادہ حصہ گزارتے ہیں ایک میز ہے جو کتابوں اور کاغذوں سے لدی ہوئی ہے۔ ان کے کھانے کے کمرہ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں

(باقی اگلے صفحہ کے حاشیہ میں)

رہتے ہیں..... دو وقت ہوا خوری کو گاڑی جوڑی بھی موجود ہے، .....مدرسہ میرے مکان کے نہایت

(بقایا پچھلے صفحہ کے حاشیہ سے)
کی الماریاں لگی ہیں جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک لائبریری بھی ہے جس کا کمرہ بہت شاندار ہے۔ اس میں انواع و اقسام کی مگر زیادہ ترمذہبی کتابیں ہیں جن کی مدد سے انہوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر اور شرح انجیل لکھی ہے۔ ان میں ایک کتاب سید محمود کا وہ مضمون بھی ہے جس پر ان کو کیمبرج یونیورسٹی میں انعام ملا تھا۔ ان کے گول کمرہ میں وہ ڈپلوما لگا ہوا ہے جو اُن کو فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ہونے پر ملا اور اس پر ان کو بہت ناز بھی ہے۔ دیوار پر ان کے دوست سرجان اسٹریچی کی ایک قدِ آدم تصویر آویزاں ہے۔ علاوہ اس کے دیگر تصاویر سرسالار جنگ، لارڈ لٹن اور ہزہائی نس نظام حیدر آباد کی آویزاں ہیں۔ ان کے دن خوشگواری سے گزرتے ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ان تھک قوت و طاقت ہے۔ علاوہ قومی اہمیت کے مسائل پر وسیع النظری کے ان میں کام کرنے کی ایک خاص طاقت ہے کہ کام کے متعلق وہ باریک سے باریک تفصیل بھی نظر انداز نہیں کرتے وہ صبح 4 بجے اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے اخباری آرٹیکل لکھتے ہیں یا کتابوں اور پمفلٹوں وغیرہ کی تصنیف کرتے ہیں۔ پھر آنے والوں سے ملتے ہیں جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ کالج کی کمیٹیوں کے معتمدی کے فرائض بھی ادا کرتے ہیں جو نہ صرف دن تک محدود رہتے ہیں بلکہ اکثر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتے ہیں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت اچھی صحت اور طویل زندگی کی ضامن ہے۔ ان کا کھانا یورپین طرز پر ہوتا ہے اور وہ کسی قسم کی نشہ آور مشروبات استعمال نہیں کرتے بلکہ صرف پانی پیتے ہیں۔ رات کے کھانے پر یا کھانے کے بعد ان کے بعض احباب آ جاتے ہیں اور زیرِ گفتگو مسائل میں فوکس، مذہب و سیاست، فارسی شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف ہوتے ہیں۔ ان کا اوسط قد ہے مگر جسم گٹھا ہوا ہے اور وزن 19 اسٹون سے نکلتا ہوا ہے۔ ان کا چہرہ شاندار ہے، اس سے ان کا عزم اور قوت ارادی ظاہر ہوتی ہے۔ جب وہ آرام کرتے ہیں تو چہرہ پر سختی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں مگر جب وہ بات کرتے ہیں تو چہرہ پر دل کا جوش جھلکنے لگتا ہے یہ ان کی خصوصیت ہے وہ قہقہے بھی لگاتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح مذاق بھی پسند کرتے ہیں۔ بعض دفعہ کھانے کی میز کے نیچے اپنی لکڑی چھپا دیتے ہیں اور ایک دم سے سانپ سانپ پکار اٹھتے ہیں تاکہ لوگ یکدم چونک پڑیں۔ اکثر اوقات قوم کی اصلاح پر ہی گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے ایک دوست کو اونگھنے کی عادت ہے وہ ان کو چھیڑتے ہیں مگر ان دوست کا اصرار ہوتا ہے کہ وہ سب سن رہے ہیں مگر پھر اونگھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان کے چڑ نکالنے کے لئے وہ ایک دم شور مچا دیتے ہیں اور پھر زور سے قہقہہ مارتے ہیں۔ ان کی بیوی کو مرے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے بعض وقت آنکھ مار کر کہتے ہیں کہ میرا ارادہ پھر شادی کرنے کا ہے مگر اب کسی انگریز عورت سے کروں گا تاکہ انگریزی سوسائٹی میں زیادہ گھل مل سکوں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ 80 برس کی بوڑھی ہو اور اس کے کوئی دانت نہ ہو۔ وہ ایک پیدائشی مقرر اور خطیب ہیں۔ وہ جس وقت گرمجوشی سے تقریر کرتے ہیں تو ان کا طرزِ تقریر گلیڈ اسٹون کا سا ہو جاتا ہے۔ جذبات سے ان کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے اور بدن کانپنے لگتا ہے۔ شدتِ جذبات کا یہ اظہار سننے والوں پر خاص اور فوری اثر رکھتا ہے۔" (دی لائف اینڈ ورک آف سر سید احمد خاں، ص 265-266، ترجمہ منقول از "تذکرہ سرسید")

قریب ہے[1]

عادات وخصائل★

وطن اور دوستوں سے محبت

دِلی چھوڑے ہوئے مجھ کو دو جگ سے زیادہ ہو گئے[2]

......جہاں میں پیدا ہوا' جہاں میرے بزرگوں کی' جہاں میرے عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے دوست اور میرے عزیز اب تک رہتے ہیں' جس کی مٹی سے لوگوں نے خیال کیا تھا کہ میں بنا ہوں اور پھر اس میں میری خاک مل جائے گی[3]

وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے' آزردہ کی دلچسپ و دلربا فصاحت سے' شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے' صہبائی جاں نواز کے مے خانہ' محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا[4]

یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں۔ کجا وہ صحبتیں اور کجا وہ مجلسیں' کہاں وہ آزردہ اور کہاں وہ شیفتہ اور کہاں وہ صہبائی' کہاں وہ علما اور کہاں وہ صلحا' صرف یاد ہی یاد ہے[5]

اگرچہ دہلی کی مفارقت اور احباب کی جدائی طبیعت کو سخت ناگوار گزرتی ہے مگر راضی برضائے الٰہی ہوں[6]

وہاں کے مسلمانوں......کی طبیعت ان کے اخلاق' راہ و رسم' سوشل حالت ایسی تبدیل ہو گئی ہے کہ جب کبھی دِلی جاتا ہوں اور کسی سے ملاقات ہوتی ہے تو اُن کی باتیں سن کر متعجب ہوتا ہوں کہ یہ لوگ کس ملک اور کس دیس کے رہنے والے ہیں! خدا نے دِلی سے سب کچھ چھین لیا' ذلک تقدیر العزیز العلیم[7]

کہاں ہے وہ دِلی اور کہاں ہیں وہ دِلی والے؟ جو نقش کہ مٹ گیا اس کا اب کیا نام لینا ہے[8]

والدہ کی اطاعت

میں اپنی کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا۔ وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لئے مجھ کو دے دیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات ان کے ذمہ تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں' پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں' کھا لیتا تھا[9]

★ کتاب ہذا میں دی گئی سرسید کی بہت سی تحریروں میں ان کے عادات و خصائل کا عکس پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عنوان کے تحت مزید حوالوں کو یک جا کر دیا گیا ہے اور تکرار سے گریز کیا گیا ہے۔

اپنے حسب ونسب پر فخر

میں آں حضرتؐ کے ذریات میں ہوں جس کا بلاشبہ مجھ کو بڑا فخر ہے۔①

علمی انکساری

میں ایک جاہل آدمی ہوں۔ نہ مولوی ہوں، نہ مفتی، نہ قاضی اور نہ واعظ۔②

نہ میں مقدس ہوں، نہ مقدس ہونے کا دعویٰ ہے، نہ کسی کا ہادی بننا چاہتا ہوں۔③

جو لوگ کہ میرے نام کے ساتھ مولوی کا لفظ لگاتے ہیں وہ محض غلطی کرتے ہیں اور غلط صفت میری نسبت لگاتے ہیں، ہٰذا بہتانٌ عظیم۔④

میں ایک واعظ مذہب بننا نہیں چاہتا، نہ ایسے جلسوں میں جو مذہبی نام سے ہوں، شریک ہونا یا ان میں لیکچر دینا پسند کرتا ہوں۔⑤

متعصبانہ بحث سے گریز

میری عادت کسی کی تحریر کے جواب دینے کی نہیں۔ البتہ جو لوگ درحقیقت بلا تعصب اور بلا نفسانیت صرف بھلائی کی غرض سے کچھ کہتے ہیں ان کا جواب دینے میں اپنی عزت سمجھتا ہوں۔⑥

اسلام پر یقین کا درجہ

جیسا کہ میں خود اپنی تحقیق سے، نہ تقلید سے، دینِ اسلام کو حق پر سمجھتا ہوں اس قدر یقین..... بڑے بڑے لمبی ڈاڑھی والوں کو اور ہزار ہزار دانہ کی تسبیح والوں کو اور جو مکہ مدینہ سے پیر و خلیفہ و مرشد کا جبہ و دستارے کر آتے ہیں، ان کو بھی نہیں ہے۔⑦

اگر دینِ اسلام کے حق ہونے میں مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں فوراً اسلام کو ترک کر دیتا۔⑧

مسلک

میں اہلِ سنت و جماعت سے ہوں۔⑨

میرے چند لائق اور فائق دوست اس بات کو سن کر نہایت متحیر ہوں گے کہ میں بھی بڑا پکا وہابی ہوں اور وہابیت کا حامی ہوں لیکن مجھ کو امید ہے کہ وہ مجھ کو وہابی بمعنی مفسد کے نہ خیال کریں گے۔⑩

میں نے وہابیوں کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک وہابی، دوسرے وہابی اور کریلا، تیسرے وہابی کریلہ اور نیم چڑھا۔ میں اپنے تئیں تیسری قسم میں قرار دیتا ہوں اور بجز حق حق حق، جو میرے

نماز میں کوتاہی پر ندامت

میں ایک گناہ گار آدمی ہوں' نماز پڑھتا بھی ہوں قضا بھی ہو جاتی ہے۔ جب قضا ہو جاتی ہے شامتِ اعمال سے اس کی ندامت ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا ہوں" خدا سے معافی چاہتا ہوں۔[1]

میں کسی وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور کسی وقت کی نہیں پڑھتا اور وقت بے وقت کا بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکھٹی بھی ملا کر پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں لمبا سفر ہو تو مجھ سے ادا نہیں ہوتی۔ یہ سب باتیں مجھ میں ہیں اور نالائقی اور شامتِ اعمال سے ایسی سستی نماز میں ہے۔[2]

خدا کی رحمت پر یقین

میں ایک گنہ گار شخص ہوں' میرے اعمال اچھے نہیں ہیں مگر میرا دل خدا کی رحمت اور بخشش سے مایوس نہیں ہے۔[3]

محنت اور جاں فشانی

مجھے اس بات کے کہنے سے شرم آتی ہے کہ یہ میری ہی محنت اور جاں فشانی اور تدبیر تھی جو آپ آج کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی اس قدر عالی شان عمارتیں بنی ہوئی دیکھتے ہیں جن کو دیکھ کر نہ صرف ہندوستان کے لوگ بلکہ یورپ اور امریکہ کے سیاح بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ جو محنت و مشقت میں نے کی ہے اور جاڑے' گرمی' برسات میں محنت اٹھائی ہے' قلی کا کام میں نے کیا ہے' اوور سیئر کا کام میں نے کیا ہے' انجینئر کا کام میں نے کیا ہے' اپنا ذاتی روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا......[4]

قومی کاموں میں خود رائی کا ارتکاب

میں اپنے تئیں سب سے اول ان شخصوں میں سمجھتا ہوں اور قرار دیتا ہوں کہ قومی کاموں میں بھی لوگوں پر حسد کرتا ہوں' خلاف رائے سے ناراض ہوتا ہوں' مخالف رائے دینے والوں سے عداوت شروع کرتا ہوں اور تمام الزاموں خود رائی' نفسانیت وغیرہ کا مرتکب ہوتا ہوں اور بایں ہمہ یہ سمجھتا ہوں کہ ان تمام بدیوں سے پاک ہوں۔[5]

لعنت پھٹکار میں بھی خوش' مگر......

مجھ کو تو اپنے ہم وطنوں اور بالتخصیص ہم مذہبوں سے بجز لعنت اور پھٹکار سے اور جوتی پیزار کے اور کسی چیز کی توقع نہیں ہے اور میں اس کے سننے اور کھانے میں خوش ہوں' نہ میرا دل رنجیدہ

ہوتا ہے، نہ میں ان کو برا جانتا ہوں[1]

جہاں تک مدرستہ العلوم کی، کہ جس میں قوم کی فلاح و بہبود مضمر ہے، مخالفت کا تعلق ہے تو اس معاملے میں در گزر میرے بس میں نہیں[2]

طریقہ اور عمل

میں اپنی دانست میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا[3]

میری عادت کسی سے منافقانہ ملنے کی نہیں ہے[4]

میرا مذہب اور میرا طریقہ اور عمل اس شعر پر ہے ؎

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن[5]

غیر مذاہب دوستوں سے تعلقات کا پاس و لحاظ

ہم کو چند سال تک اپنے ایک شیعہ دوست کے ساتھ، جو شیعہ غالی مشہور تھے، ایک جگہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ اکثر ایسا اتفاق ہوا کہ ہم نے اور انہوں نے ایک جاء نماز پر نماز پڑھی ہے۔ انہوں نے خاکِ شفا کی ایک ٹکیہ ماتھا ٹیکنے کو رکھ لی، ہم نے اسی جاء نماز پر سجدہ کیا۔ کبھی آپس میں نہیں پوچھا کہ تم نے ٹکیہ کیوں رکھی، اور تم نے جاء نماز پر سجدہ کیوں کیا، تم نے ہاتھ باندھ کر نماز کیوں پڑھی اور تم نے ہاتھ کھول کر............؟ ہم نے جناب سر ولیم میور صاحب کی کتاب کی تردید میں کتاب لکھی جن سے ہماری نہایت دوستی تھی لیکن باہمی ملاقات میں کبھی ذکر نہیں آیا اور نہ اس دوستی میں، جو تھی، کبھی فرق ہوا۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ وہ اپنے خیالات ہیں تا سٹر رام چندر صاحب حدِ اعتدال سے بڑھ کر اسلام کے برخلاف کتابیں لکھتے ہیں اور ہم بدستور ان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ ان کے خیالات ہیں۔ غایت مافی الباب یہ ہے کہ ان خیالات کو غلط جانتے ہیں۔ ہم سے آج تک کسی غیر مذہب کے شخص سے باہمی دوستانہ ملاقات میں مذہبی گفتگو نہیں ہوئی۔ ۳۵ سال تک ایک اخبار کی ادارت کی مگر کوئی مضمون ایسا نہیں لکھا جس میں تعصب کی بو پائی جاتی ہو[6]

دوستوں کے ساتھ خلوص کی انتہا

میں رشتہ وناتے کی کچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا............ میں تو اس شخص کو کافر و بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس نے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات [illegible] دوستی پر محمول کرنا

ہوں.......... میری تو وہ مثل ہے کہ دوست کو جان وایمان دونوں دیتا ہوں۔[1]

ظاہر و باطن اور قول و فعل میں یکسانیت

پھوٹ جائے وہ آنکھ جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے جو اُس کے دل میں نہیں ہے' گل جائے وہ زبان جو وہ کہے جو اُس کے دل میں نہیں ہے' ٹوٹ جائے وہ ہاتھ جو وہ لکھے جو اُس کے دل میں نہیں ہے۔[2]

میں جس مسئلہ کو حق اور سچ سمجھتا ہوں بلا خوف اس کو کرتا ہوں' بقول شخصے "از خدا شرم دار و شرم مدار"[3]

تائید اس کام کی نہیں کرتا جس کو میں خود برا جانتا ہوں۔[4]

نہایت کمینہ وہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو یوں سمجھے کہ در حقیقت شرع کا حکم یہ ہے اور پھر رسم و رواج کی شرم یا لوگوں کی لعن طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے اس لئے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے میں' بشرطیکہ شراب اور سؤر کا گوشت یا اَور کوئی حرام چیز نہ ہو' کچھ بھی تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے یہاں آتے ہیں اور میرے گھر ٹھہرتے ہیں اور ہم اور وہ ایک دستر خوان پر کھاتے ہیں' اور جب میں کسی اپنے انگریز دوست کے ہاں مہمان ہوتا ہوں ان کے ہاں ایک میز پر کھاتا ہوں۔[5]

گورنمنٹ کی خیر خواہی

میں گورنمنٹ انگریزی کا سچا اور پکا خیر خواہ ہوں۔[6]

برٹش رُول کے ساتھ میری وفاداری اور محبت کی آزمائش ۱۸۵۷ء کے مصائب میں ہوئی تھی۔[7]

ایام مفسدہ میں گورنمنٹ نے میرا خوب امتحان کر لیا ہے کہ میں کیسا گورنمنٹ کا خیر خواہ ہوں۔[8]

عزت دینے والوں کی شکر گزاری

میں اپنی عالی گورنمنٹ کا شکر گزار ہوں جس نے میری ناچیز خدمتوں کی عزت کی' مجھے بہت سے خطاب دیئے' نائٹ بنایا' عزت دی۔[9]

جلنے والوں سے کھری کھری

میں ایک مسکین آدمی ہوں' کسی کی برائی میں نہیں البتہ حکام اپنی قدر دانی سے میری عزت

اور قدر کرتے ہیں۔ پھر جو لوگ اس پر حسد کرتے ہیں وہ اپنے میں کیوں نہیں ایسی لیاقت پیدا کرتے کہ حکام کی آنکھ میں ان کی عزت و قدر ہو' واہیات بکنے اور کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ ①

سرسید احمد خاں صاحب کے سی ایس آئی نے جو اپنے آخری وقت میں اپنے موت سے تھوڑے دن پہلے میری نسبت ایک شہادت شایع کی ہے۔ اُس سے گورنمنٹ عالیہ سمجھ سکتی ہے کہ اس دانا اور مردم شناس شخص نے میرے طریق اور رویہ کو بدل پسند کیا ہے چنانچہ حاشیہ میں اُنکے کلمات کو جمع کرتا ہوں + ...

+ "مرزا غلام احمد صاحب قادیانی"

"مرزا صاحب نے جو اشتہار ۲۵ جون ۱۸۹۷ء کو جاری کیا ہے اُس اشتہار میں مرزا صاحب نے ایک نہایت عمدہ تقریر گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی اور وفاداری کی نسبت لکھا ہے۔ ہمارے نزدیک ہر ایک مسلمان کو جو گورنمنٹ انگریزی کی رعیت ہے ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا مرزا صاحب نے لکھا ہے اس لئے ہم اُس فقرہ کو اخباروں میں چھاپتے ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی کی نسبت جو میری تحریر [illegible] ہے یہ خیال میری محض شرارت ہے سلطان روم کے حقوق بجائے خود ہیں مگر اس گورنمنٹ کے حقوق بھی ہمارے سر پر ثابت شدہ ہیں اور ناشکر گذاری ایک بے ایمانی کی قسم ہے۔ اے نادانو! گورنمنٹ انگریزی کی تعریف تمہاری طرح میری قلم سے منافقانہ نہیں نکلتی بلکہ میں اپنے اعتقاد اور یقین سے جانتا ہوں کہ حقیقت میں خدا تعالیٰ کے فضل سے اس گورنمنٹ کی پناہ ہمارے لئے بالواسطہ خدا تعالیٰ کی پناہ ہے۔ اس سے زیادہ اس گورنمنٹ کی پر امن سلطنت ہونے کا اور کیا میرے نزدیک ثبوت ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ پاک سلسلہ اس گورنمنٹ کے ماتحت برپا کیا ہے۔ وہ لوگ میرے نزدیک سخت نمک حرام ہیں جو حکام انگریزی کے روبرو ان کی خوشامدیں کرتے ہیں ان کے آگے گرتے ہیں اور پھر گھر میں آکر کہتے ہیں کہ جو شخص اس گورنمنٹ کا شکر کرتا ہے وہ کافر ہے۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ ہماری یہ کارروائی جو اس گورنمنٹ کی نسبت کی جاتی ہے منافقانہ نہیں ہے ولعنة اللہ علی المنافقین بلکہ ہمارا یہی عقیدہ ہے جو ہمارے دل میں ہے"

علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق ۲۴ جولائی ۱۸۹۷ء۔

[illegible]

سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی کی ہم نوائی کا ایک اقتباس

(مؤخر الذکر کی تالیف "کشف الغطاء" مطبوعہ قادیان سے عکس)

حرفِ آخر

ضُعف اور پیری کا عالم

میں اب زیادہ تر ضعیف ہو گیا ہوں...... عمر بھی زیادہ ہو گئی۔[1]

زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے' خصوصاً مجھ سے شخص کی جو ایک حد تک زندگی پہنچ گئی ہے' چند روز یا چند برس اَور باقی ہیں۔[2]

اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہو گا اس لئے خاموش رہنے کی عادات ڈالتا ہوں۔[3]

یہ عالم ...... ایک گزر گاہ

اسی زمین پر اور اسی آسمان کے تلے ہزاروں لاکھوں نبی اور ولی اور شہدا اور صالحین آئے اور گزر گئے' سکندر و دارا' جمشید و فریدوں بھی ہوئے اور گزر گئے' بہت سے کفر کے فتوے دینے والے پیدا ہوئے اور گزر گئے' بہت سے مسلمان خدا و رسول پر دل و جان سے ایمان رکھنے والے کافر بنائے گئے اور گزر گئے' ہزاروں کافر و مرتد اور خدا کے وجود کے منکر پیدا ہوئے اور گزر گئے' اور ایک دن ہم بھی اور ہمارے کفر کے فتوے دینے والے بھی گزر جائیں گے۔[4]

مرتے دم بھی قوم کا غم ...... ایک دعا

میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ میں اس پاک شخص کی ذریت میں ہوں جس کے لب مبارک سے آخری وقت پر جبکہ تھے تو "اُمتی اُمتی" کہتے تھے۔ میں اس ذریت میں ہونے کا دعا اسی وقت

بلکہ جب تک میں اس دنیا میں ہوں، فخر کروں گا اور مرنے کے بعد مجھ کو اس کا فخر ہو گا۔ مگر میں ٹھیک اس ذُرّیت میں ہونے کا اور اپنے فخرِ عالم دادا کے پوتے ہونے کا حق اس وقت ادا کروں گا جب میں بھی مرتے وقت، ایسی حالت میں کہ سانس کو سینہ میں گنجائش نہ رہی ہو اور ہونٹ بھی نہایت آہستہ اور خفیف حرکت کرتے ہوں، "قومی، قومی" کہتا ہوا مروں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ایسا ہی کرے۔ آمین[1]★

میری خاکِ مرقد کا کتابہ

دنیا میں کوئی نہیں رہا، نہ پیر، نہ پیغمبر، نہ زاہد خدا پرست و نہ فاسق نفس پرست، سب کو گزرنا ہے مگر میں سمجھتا ہوں، بشرطیکہ میری سمجھ کی غلطی نہ ہو، کہ مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ (جن کو بہ لحاظ ان نسبتوں کے، جو مجھے اس خانوادہ سے ہیں، ناز سے پردادا کہنا زیبا ہے) ان کا یہ شعر میری خاکِ مرقد کا کتابہ ہو گا۔

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول راجز بے گناہی نیست تقصیرے[2]

★۔ مولوی عبدالحق سرسید کے آخری ایام کے متعلق لکھتے ہیں "ان کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب والم میں گزرے۔ پہلا صدمہ کالج کے روپے کے غبن کا ہوا اور دوسرا اس سے بڑھ کر سید محمود کا۔ کثرتِ شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ مختل کر دیا تھا اور وہ عالمِ دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھیں۔ سرسید کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تیس سال سے مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے اور ایک غیر گھر میں جا کر رہنا پڑی۔" (سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار ص 85)

میر ولایت حسین اپنی آپ بیتی میں یوں تحریر کرتے ہیں "حاجی اسمٰعیل خاں، صاحب (سرسید) کو اپنی چھوٹی کوٹھی میں لے گئے۔ سید صاحب کو بے گھر ہونے سے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ منشی ناظر خاں اور نجم الدین، جو سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ جس وقت سید صاحب حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے...... ایک آہ کھینچی اور کہا کہ ہائے افسوس ہم کو کیا معلوم تھا کہ سید محمود آخر عمر میں ہم کو گھر سے نکال دیں گے، ورنہ کیا ہم اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک جھونپڑی بنا لیتے" اس روحانی صدمے کا اثر سید صاحب پر ایسا ہوا کہ حاجی اسمٰعیل خاں صاحب کی کوٹھی پر چند ہی دن رہنے پائے تھے کہ ان کا پیشاب بند ہو گیا۔" (بحوالہ سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ" ص 306)

حالی لکھتے ہیں " 24 مارچ 1898ء کو احتباسِ بول کا عارضہ لاحق ہوا...... 27 مارچ کی صبح سے نہایت سخت سرد درد لاحق ہوا...... اسی دن شام کو شدید لرزہ کے ساتھ تپ چڑھی اور تھوڑی سی دیر میں ہذیان کی صورت پیدا ہو گئی...... تین گھنٹے سخت کرب اور بے چینی رہی اور رات کے دس بجے حاجی اسمٰعیل خاں کی کوٹھی میں، جہاں مرنے سے دس بارہ روز پہلے حالتِ صحت میں وہ سید محمود کی کوٹھی سے اٹھ گئے تھے، وفات پائی۔" (حیاتِ جاوید،
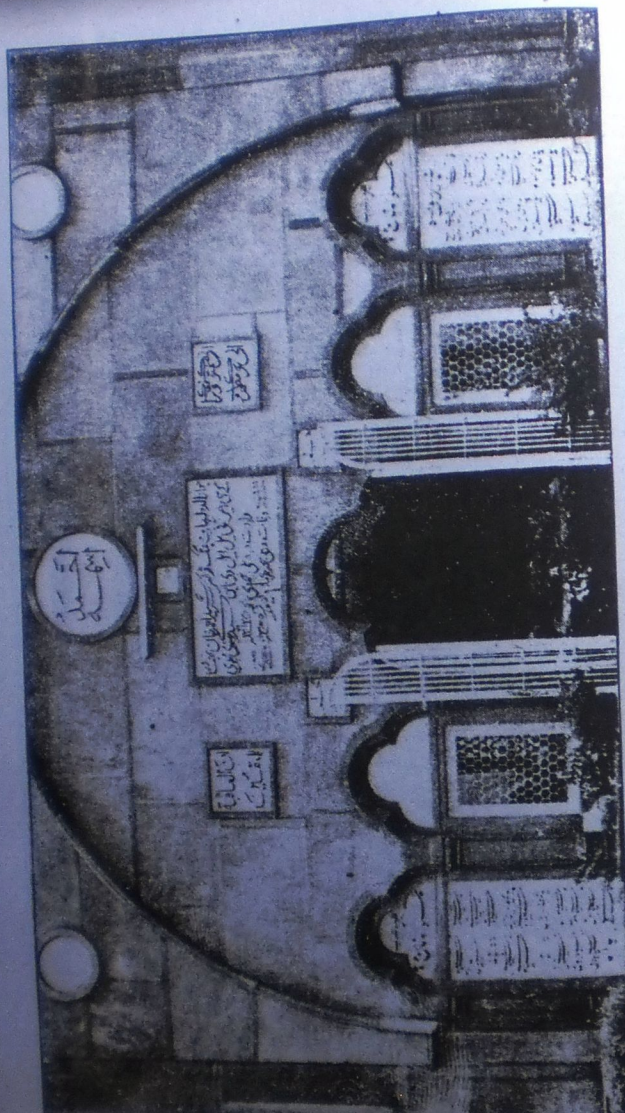
سرسید کی آخری آرام گاہ
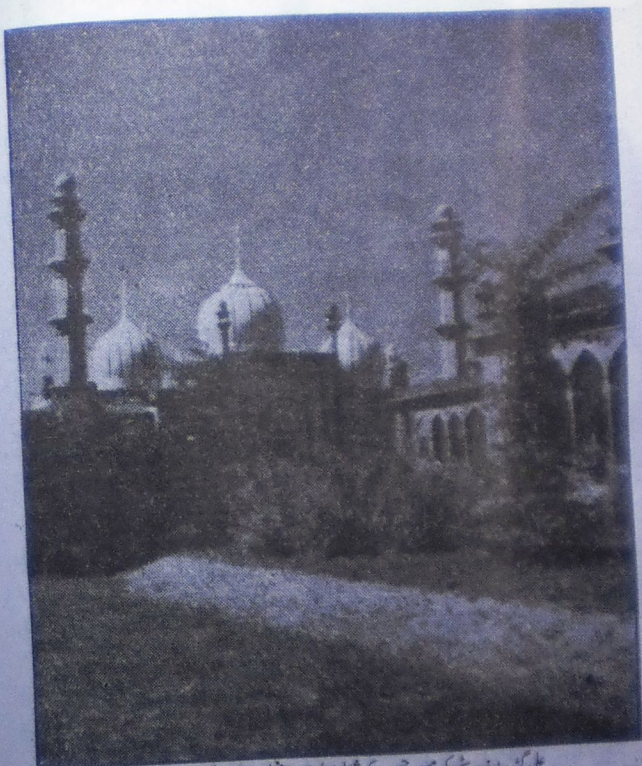
علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد جس کے شمالی پہلو میں فاضل مولف محوخواب ہیں

علی گڑھ میں سرسید کی رہائش گاہ جہاں انھوں نے اپنی انقلابی زندگی کا ایک طویل حصہ بسر کیا مگر حیاتِ فانی کے آخری ایام میں بقول مولوی عبدالحق
"ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا .... اور ایک غیر گھر میں جاکر پناہ لینا پڑی"

سرسید کی بے لوث خدمات انگریز آقاؤں کی نظر میں

ٹی۔ڈبلیو۔آرنلڈ

"برٹش گورنمنٹ کی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے سرسید کی قدرومنزلت ہوئی' لیکن یہ عزت اور خطاب ہمیشہ بے طلب آئے۔ دنیا کے سگ طینت لوگ اس بات پر جس قدر ان کا جی چاہے بھونکیں لیکن میں جو برسوں سے سرسید کو جانتا ہوں اس بات کو پچ سمجھتا ہوں ---- یہی وجہ ہے کہ یہاں آج ہم اس کی موت پر روتے ہیں' اب اس جیسا کوئی کہاں ملے گا!"

(حیاتِ جاوید' حصہ اول' ص 312)

سرجان اسٹریچی

"کسی شخص نے اس سے زیادہ شریفانہ طور پر دلیری اور وفاداری کا ثبوت برٹش گورنمنٹ کے ساتھ نہیں دیا جیسا کہ 57ء میں انہوں نے دیا۔ میں کوئی لفظ بھی ایسا استعمال نہیں کر سکتا جس سے ان کی جاں نثاری کا کافی طور پر اظہار ہو سکے"

(ایضاً' حصہ دوم' ص 29)

سرآک لینڈ کالوِن

"کسی زندہ شخص نے' عام اس سے کہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی' برٹش گورنمنٹ کے استحکامِ سلطنتِ ہندوستان کے بارے میں اس قدر کوشش نہیں کی ہے جس قدر کہ سرسید نے کی ہے۔"

(ایضاً' ص 32)

پال مال گزٹ

"سرکار انگریزی اور باشندگانِ ہند کے تعلقات کی کہانی میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس پر ہم دل سے اپنے تئیں اس قدر مبارک باد دے سکیں جس قدر سرسید احمد خان کی لائف پر۔ وہ ابتدا سے آخر دم تک سرکار انگریزی کے راج کا پکا دوست رہا اور جو خدمتیں اس نے کیں ان کی قدروقیمت کا اندازہ کرنا مشکل ہو گا۔"

(ایضاً' ص 36)

کتابیات

فہرست حوالہ جات

صفحہ/اشارہ	حوالہ
	حرف اول
41 / 1	بروایت حالی 'حیات جاوید' حصہ اول 'ص 26
41 / 2	ایضاً 'ص 12
41 / 3	تہذیب الاخلاق 'جلد دوم 'ص 617
42 / 1	ایضاً 'ص 597
42 / 2	ایضاً 'ص 617- 618
42 / 3	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید 'ص 488
42 / 4	تہذیب الاخلاق 'جلد دوم 'ص 618
42 / 5	سفرنامہ پنجاب 'ص 262
42 / 6	تہذیب الاخلاق 'جلد دوم 'ص 604
42 / 7	ایضاً 'ص 617
	خاندان
43 / 1	تسہیل فی جراثقیل 'ص 1
43 / 2	سلسلۃ الملوک 'ص 2
43 / 3	خطبات احمدیہ 'ص 352
43 / 4	لائف محمڈنز آف انڈیا 'حصہ اول 'ص 11
44 / 1	مکتوبات سرسید 'ص 187
44 / 2	لائف محمڈنز آف انڈیا 'حصہ اول 'ص 12
44 / 3	ایضاً 'ص 11
44 / 4	مکتوبات سرسید 'ص 631
44 / 5	لائف محمڈنز آف انڈیا 'حصہ اول 'ص 11
44 / 6	سفرنامہ پنجاب 'ص 198
45 / 1	خطبات احمدیہ 'ص 352
45 / 2	لائف محمڈنز آف انڈیا 'حصہ اول 'ص 11
46 / 1	جام جم 'ص 9
46 / 2	بروایت حالی 'حیات جاوید 'حصہ اول 'ص 17
46 / 3	جام جم 'ص 10
47 / 1	سیرت فریدیہ ص 2- 4
47 / 2	ایضاً 'ص 4- 5
48 / 1	بروایت حالی 'حیات جاوید 'حصہ اول 'ص 21
48 / 2	سیرت فریدیہ 'ص 5
48 / 3	ایضاً 'ص 8

صفحہ/اشارہ	حوالہ
48 / 5	ایضاً 'ص 14- 16
48 / 6	ایضاً 'ص 18
48 / 7	لائف محمڈنز آف انڈیا 'حصہ اول 'ص 11
49 / 1	سیرت فریدیہ 'ص 24
50 / 1	ایضاً 'ص 25
50 / 2	ایضاً 'ص 26- 27
51 / 1	ایضاً 'ص 27- 28
51 / 2	ایضاً 'ص 31
51 / 3	ایضاً 'ص 37
52 / 1	ایضاً 'ص 32
52 / 2	ایضاً
52 / 3	سیرت فریدیہ 'ص 16
52 / 4	ایضاً 'ص 23
52 / 5	ایضاً 'ص 34
	بچپن
53 / 1	بروایت حالی 'حیات جاوید 'حصہ اول 'ص 36
53 / 2	ایضاً
54 / 1	ایضاً
54 / 2	ایضاً 'ص 39
55 / 1	ایضاً 'ص 35
55 / 2	آثار الصنادید 'طبع اول 'باب چہارم 'ص 16- 17
55 / 3	ایضاً 'ص 21
55 / 4	بروایت حالی 'حیات جاوید 'حصہ اول 'ص 39
55 / 5	ایضاً 'ص 41
56 / 1	سیرت فریدیہ 'ص 50
56 / 2	بروایت حالی 'حیات جاوید 'ضمیمہ 3 'ص 13
56 / 3	ایضاً 'حصہ اول 'ص 39
56 / 4	سیرت فریدیہ 'ص 29
56 / 5	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ '4 اگست 1876ء 'ص 476
[illegible]	بروایت حالی 'حیات جاوید 'حصہ اول 'ص 39- 40

صفحہ/اشارہ	حوالہ
58/1	سیرت فریدیہ، ص 46
58/2	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 40
58/3	ایضاً، ص 41
59/1	سیرت فریدیہ، ص 45
59/2	ایضاً، ص 35
60/1	ایضاً، ص 36
60/2	ایضاً، ص 37
60/3	ایضاً، ص 35
60/4	ایضاً

آغازِ شباب

صفحہ/اشارہ	حوالہ
61/1	ایضاً، ص 43
61/2	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 37
62/1	ایضاً، ص 38
62/2	سیرت فریدیہ، ص 44
62/3	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 38
62/4	سیرت فریدیہ، ص 44
62/5	ایضاً، ص 41
64/[illegible]	[illegible]
65/1	بروایت حالی، حیات جاوید، [illegible]

غدر 1857ء

صفحہ/اشارہ	حوالہ
67/1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 399
67/2	سرکشی ضلع بجنور، ص 141
67/3	مکتوبات سرسید، جلد اول، ص 409
68/1	سفرنامہ پنجاب، ص 261-262
68/2	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 10
68/3	سرکشی ضلع بجنور، ص 5
68/4	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 13
68/5	سرکشی ضلع بجنور، ص 5
70/1	ایضاً
70/2	ایضاً، ص 6
70/3	ایضاً
70/4	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 13
71/1	سرکشی ضلع بجنور، ص 6
71/2	ایضاً، ص 7

صفحہ/اشارہ	حوالہ
71/3	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 15
71/4	سرکشی ضلع بجنور، ص 7
72/1	ایضاً
72/2	ایضاً، ص 8
72/3	ایضاً، ص 8-9
73/1	ایضاً، ص 11
73/2	ایضاً
74/1	ایضاً، ص 12
75/1	ایضاً، ص 13
75/2	ایضاً، ص 15
76/1	ایضاً، ص 16
76/2	ایضاً، ص 21
76/3	ایضاً، ص 19
77/1	ایضاً، ص 20
77/2	ایضاً، ص 22
78/1	ایضاً
[illegible]/2	ایضاً، ص 23
[illegible]/1	ایضاً، ص 24
[illegible]/1	ایضاً، ص 24-26
81/1	ایضاً، ص 26
81/2	ایضاً، ص 21
81/3	ایضاً، ص 27
82/1	ایضاً، ص 28
82/2	ایضاً، ص 27
83/1	ایضاً، ص 29
83/2	ایضاً، ص 30
83/3	ایضاً، ص 31
83/4	ایضاً، ص 26
83/5	ایضاً، ص 31
84/1	ایضاً، ص 32
84/2	ایضاً
85/1	ایضاً، ص 34
86/1	ایضاً
86/2	ایضاً، ص 35

صفحہ/اشارہ	حوالہ
87 / 1	ایضاً ص 37
87 / 2	ایضاً
88 / 1	ایضاً ص 38
88 / 2	ایضاً ص 38-39
88 / 3	ایضاً ص 42
89 / 1	ایضاً ص 39
89 / 2	ایضاً ص 40-41
90 / 1	ایضاً ص 53
90 / 2	ایضاً ص 54
91 / 1	ایضاً ص 61
91 / 2	ایضاً ص 56
91 / 3	ایضاً ص 55
92 / 1	ایضاً ص 56
92 / 2	ایضاً ص 57
92 / 3	ایضاً ص 61
93 / 1	ایضاً ص 62
94 / 1	ایضاً ص 63
94 / 2	ایضاً ص 64
95 / 1	ایضاً ص 64-66
95 / 2	ایضاً ص 68
95 / 3	ایضاً ص 70
95 / 4	ایضاً ص 69
95 / 5	ایضاً ص 70
96 / 1	ایضاً ص 105
96 / 2	ایضاً ص 74
96 / 3	ایضاً ص 106
96 / 4	ایضاً ص 94
97 / 1	ایضاً
97 / 2	ایضاً
97 / 3	ایضاً ص 95
97 / 4	ایضاً ص 106
98 / 1	ایضاً ص 95
98 / 2	ایضاً ص 106
98 / 3	ایضاً ص 82
99 / 1	ایضاً ص 97
100 / 1	ایضاً
100 / 2	ایضاً ص 98-100
100 / 3	ایضاً ص 99
101 / 1	ایضاً
101 / 2	ایضاً ص 100
101 / 3	ایضاً ص 100-101
102 / 1	ایضاً ص 101
102 / 2	ایضاً
102 / 3	ایضاً
103 / 1	ایضاً ص 102
103 / 2	ایضاً
103 / 3	ایضاً
104 / 1	ایضاً ص 103
104 / 2	ایضاً
104 / 3	ایضاً ص 104
104 / 4	ایضاً
104 / 5	ایضاً ص 106
104 / 6	ایضاً ص 104
105 / 1	ایضاً ص 106
105 / 2	ایضاً ص 104
106 / 1	ایضاً ص 67
106 / 2	ایضاً ص 106-107
106 / 3	ایضاً ص 112-113
107 / 1	ایضاً ص 113-115
107 / 2	ایضاً ص 115
107 / 3	ایضاً ص 116
108 / 1	ایضاً ص 118
108 / 2	ایضاً
109 / 1	ایضاً ص 120-[illegible]
109 / 2	ایضاً ص 122-123
110 / 1	ایضاً ص 123
110 / 2	ایضاً
110 / 3	ایضاً ص 124

صفحہ/اشارہ	حوالہ
111 / 2	ایضاً، ص 126
111 / 3	ایضاً، ص 129-131
111 / 4	ایضاً، ص 131
112 / 1	ایضاً، ص 131-133
112 / 2	ایضاً، ص 133
112 / 3	ایضاً، ص 133-134
112 / 4	ایضاً، ص 134
113 / 1	ایضاً، ص 135
113 / 2	ایضاً
113 / 3	ایضاً، ص 136
114 / 1	ایضاً
114 / 2	ایضاً
114 / 3	ایضاً
114 / 4	ایضاً، ص 137
115 / 1	ایضاً
115 / 2	ایضاً
115 / 3	ایضاً، ص 139
116 / 1	ایضاً
116 / 2	ایضاً
116 / 3	ایضاً
116 / 4	ایضاً، ص 139-140
117 / 1	ایضاً، ص 140
118 / 1	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 14-16
118 / 2	ایضاً، ص 16-17
118 / 3	سرکشی ضلع بجنور، ص 145
118 / 4	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 17
119 / 1	سرکشی ضلع بجنور، ص 145
119 / 2	ایضاً، ص 57
120 / 1	ایضاً، ص 58
120 / 2	ایضاً
120 / 3	ایضاً، ص 59
121 / 1	ایضاً
121 / 2	ایضاً، ص 142
122 / 1	ایضاً
122 / 2	ایضاً

صفحہ/اشارہ	حوالہ
123 / 1	ایضاً، ص 59
123 / 2	اسباب سرکشی ہندوستان، ص 42-43
124 / 1	ایضاً، ص 43
124 / 2	ایضاً، ص 44
125 / 1	ایضاً، ص 9-10
125 / 2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 355
125 / 3	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم، ص 32
125 / 4	سرکشی ضلع بجنور، ص 144
126 / 1	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ اول، ص 5
126 / 2	ایضاً، حصہ دوم، ص 45
126 / 3	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 66
127 / 1	ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر، ص 23
127 / 2	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 66
127 / 3	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم، ص 10
127 / 4	ایضاً، ص 13
127 / 5	ایضاً، ص 18
128 / 1	ایضاً، ص 23
128 / 2	ایضاً، ص 30
128 / 3	ایضاً، حصہ سوم در مقالات سرسید، حصہ نہم، ص 151
128 / 4	ایضاً، حصہ دوم، ص 13
128 / 5	ایضاً، ص 15
128 / 6	اسباب سرکشی ہندوستان، ص 8
128 / 7	ایضاً، ص 6-7
128 / 8	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ سوم در مقالات سرسید، حصہ نہم، ص 186
129 / 1	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم، ص 40
129 / 2	سرکشی ضلع بجنور، ص 30
129 / 3	ایضاً
130 / 1	ایضاً، 31
130 / 2	ایضاً، ص 21
130 / 3	لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم، ص 43
130 / 4	سرکشی ضلع بجنور، ص 39
130 / 5	اسباب سرکشی ہندوستان، ص 9
131 / 1	ایضاً، ص 8

صفحہ/اشارہ	حوالہ
131 / 3	ایضاً
131 / 4	ایضاً، ص 4
131 / 5	ایضاً
131 / 6	ایضاً، ص 9
131 / 7	ایضاً
131 / 8	ایضاً
131 / 9	ایضاً، ص 42
132 / 1	دی پریذنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس، ص 62
132 / 2	آخری مضامین، ص 78
132 / 3	دی پریذنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس، ص 75
132 / 4	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 24
133 / 1	مکتوبات سرسید، ص 625
134 / 1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 349
134 / 2	اسباب سرکشی ہندوستان، ص 41
134 / 3	شکریہ، ص 1
135 / 1	ایضاً
135 / 2	ایضاً، ص 2
135 / 3	ایضاً، ص 3-4
136 / 1	ایضاً، ص 4
136 / 2	ایضاً
136 / 3	ایضاً
136 / 4	ایضاً، ص 5
137 / 1	ایضاً
137 / 2	ایضاً

والدہ کی یاد میں

صفحہ/اشارہ	حوالہ
145 / 1	سیرت فریدیہ، ص 54
146 / 1	ایضاً، ص 55
147 / 1	ایضاً، ص 56
147 / 2	ایضاً
147 / 3	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 488
147 / 4	سیرت فریدیہ، ص 57
148 / 1	ایضاً، ص 45
149 / 1	ایضاً، ص 47
149 / 2	ایضاً، ص 51
150 / 1	ایضاً، ص 50
150 / 2	ایضاً، ص 52
150 / 3	ایضاً
151 / 1	ایضاً، ص 53

قومی ہمدردی کے کاموں کا آغاز

صفحہ/اشارہ	حوالہ
153 / 1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 399
154 / 1	ایضاً
155 / 1	ایضاً، ص 400
155 / 2	ایضاً
155 / 3	ایضاً
155 / 4	ایضاً، ص 401
155 / 5	ایضاً
155 / 6	خطبات سرسید، جلد دوم، ص 496
156 / 1	ایضاً، ص 497
158 / 1	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 41
158 / 2	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 9 جنوری 1897ء، ص 81

لندن کا سفر

صفحہ/اشارہ	حوالہ
159 / 1	بحوالہ گراہم، دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص 68
159 / 2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 401
159 / 3	سفرنامہ پنجاب، ص 176
160 / 1	خطوط سرسید، ص 53
160 / 2	حیات جاوید، حصہ اول، ص 149
161 / 1	مسافران لندن، ص 27
161 / 2	ایضاً، ص 28
161 / 3	ایضاً
162 / 1	ایضاً، ص 29
162 / 2	ایضاً، ص 30
163 / 1	ایضاً، ص 31-33
163 / 2	ایضاً، ص 31
163 / 3	ایضاً، ص 34
164 / 1	ایضاً، ص 37

صفحہ/اشارہ	حوالہ
165/1	ایضاً ص 39
165/2	ایضاً ص 40
166/1	ایضاً ص 41-42
166/2	ایضاً ص 42
167/1	ایضاً ص 43
167/2	ایضاً ص 44-45
167/3	ایضاً ص 45
168/1	ایضاً
168/2	ایضاً ص 46
169/1	ایضاً ص 47
169/2	ایضاً ص 129
169/3	ایضاً ص 52
169/4	ایضاً ص 53
169/5	ایضاً ص 52
170/1	ایضاً ص 50
170/2	ایضاً ص 47
170/3	ایضاً ص 48
171/1	ایضاً ص 129
171/2	ایضاً ص 57
171/3	ایضاً ص 58
171/4	ایضاً ص 85
172/1	ایضاً ص 75
172/2	ایضاً ص 76
172/3	ایضاً ص 56
173/1	ایضاً ص 73
173/2	ایضاً ص 74
174/1	ایضاً
174/2	ایضاً ص 60
175/1	ایضاً ص 61-62
175/2	ایضاً ص 63-65
176/1	ایضاً ص 65
177/1	ایضاً ص 67
177/2	ایضاً ص 67-68
177/3	ایضاً ص 71
178/1	ایضاً ص 68-69
179/2	ایضاً ص 78
179/3	ایضاً ص 86
180/1	ایضاً
180/2	ایضاً ص 58
180/3	ایضاً ص 87
180/4	ایضاً ص 87-90
181/1	ایضاً ص 90
181/2	ایضاً ص 38
181/3	ایضاً ص 90
181/4	ایضاً ص 94
181/5	ایضاً
182/1	ایضاً ص 95
182/2	ایضاً ص 97
183/1	ایضاً ص 98
183/2	ایضاً ص 99
184/1	ایضاً ص 79
184/2	ایضاً ص 99
185/1	ایضاً ص 100-102
185/2	ایضاً ص 102
185/3	ایضاً ص 103
186/1	ایضاً ص 106
186/2	ایضاً ص 106-107
186/3	ایضاً ص 107
187/1	ایضاً
187/2	ایضاً ص 130
187/3	ایضاً ص 108
187/4	ایضاً ص 112-113
187/5	ایضاً ص 113
188/1	ایضاً ص 114
188/2	ایضاً ص 115
189/1	ایضاً ص 117-118
189/2	ایضاً ص 121-123
190/1	ایضاً ص 124
190/2	ایضاً
190/3	ایضاً ص 130
190/4	ایضاً ص 112

صفحہ/اشارہ — حوالہ

191/1 ایضاً، ص 127
191/2 ایضاً، ص 128
191/3 ایضاً، ص 130
192/1 ایضاً، ص 131
192/2 ایضاً
193/1 ایضاً، ص 133
193/2 ایضاً، ص 134
193/3 ایضاً، ص 136
194/1 ایضاً، ص 137
194/2 ایضاً، ص 138-139
195/1 ایضاً، ص 139
196/1 ایضاً، ص 140-142
196/2 ایضاً، ص 142-145
197/1 ایضاً، ص 149
197/2 ایضاً
197/3 ایضاً، ص 150
197/4 ایضاً، ص 152
198/1 ایضاً، ص 153-156
198/2 ایضاً، ص 156
198/3 ایضاً
199/1 ایضاً، ص 157
199/2 ایضاً، ص 158
200/1 ایضاً
200/2 ایضاً، ص 159
201/1 ایضاً، ص 159-160

قیام لندن

203/1 مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 20
204/1 ایضاً، ص 30
204/2 ایضاً، ص 21-22
204/3 ایضاً، ص 22
205/1 ایضاً، ص 31
205/2 ایضاً، ص 31-33
206/1 خطوط سرسید، ص 32
206/2 مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 25
206/3 ایضاً، ص 26

صفحہ/اشارہ — حوالہ

206/4 خطوط سرسید، ص 46
206/5 ایضاً، ص 35
206/6 ایضاً، ص 50
206/7 ایضاً، ص 39
207/1 ایضاً، ص 36
207/2 ایضاً، ص 45
207/3 ایضاً، ص 92
207/4 ایضاً، ص 31
208/1 ایضاً، ص 32
209/1 بحوالہ دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص 66
209/2 خطوط سرسید، ص 50
209/3 بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 158
209/4 مسافران لندن، ص 268
209/5 ایضاً، ص 269
210/1 ایضاً، ص 273-274
210/2 ایضاً، ص 275
211/1 ایضاً، ص 166-167
211/2 ایضاً، ص 167
212/1 ایضاً، ص 168
212/2 ایضاً
212/3 ایضاً، ص 169-170
213/1 ایضاً، ص 170
213/2 ایضاً
213/3 ایضاً، ص 175
214/1 تحریر فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم، ص 30-39
214/2 علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 13 [illegible] 1871ء، ص 18
214/3 ایضاً، ص 24
215/1 ایضاً
215/2 خطوط سرسید، ص 52
215/3 مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 16
216/1 ایضاً، ص 17
216/2 ایضاً، ص 24
217/1 مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 26

صفحہ/اشارہ	حوالہ
217/2	خطوطِ سرسید، ص 30
217/3	خطباتِ احمدیہ، ص 191
217/4	خطوطِ سرسید، ص 53

تحریک علی گڑھ

صفحہ/اشارہ	حوالہ
219/1	آخری مضامین، ص 36
219/2	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 618
221/1	خطبات سرسید، جلد دوم، ص 273
221/2	آخری مضامین، ص 37
221/3	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، یکم ستمبر 1876ء، ص 543
221/4	سفرنامہ پنجاب، ص 255
221/5	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 401
222/1	ایضاً، ص 402
222/2	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 618
222/3	ایضاً، ص 597
222/4	مقالات سرسید، حصہ دہم، ص 74
222/5	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 402
222/6	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 518
222/7	ایضاً، ص 519
222/8	ایضاً، ص 619
223/1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 403
223/2	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 28 مئی 1875ء، ضمیمہ ص 6
223/3	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 403
223/4	ایضاً
223/5	مقالات سرسید، حصہ 16، ص 771
223/6	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 547
223/7	ایضاً، ص 403
224/1	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 12 جون 1877ء، ضمیمہ ص 1
224/2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 401
224/3	ایضاً، ص 405
224/4	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 12 جون 1877ء، ضمیمہ ص 1
[illegible]	[illegible]
225/2	ایضاً، ص 406
225/3	ایضاً
227/1	خطبات سرسید، جلد دوم، ص 454
227/2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 479
227/3	ایضاً، ص 508
227/4	سفرنامہ پنجاب، ص 255
228/1	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ، 28 مئی 1875ء، ضمیمہ ص 6
228/2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 508
230/1	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 28 مئی 1875ء، ضمیمہ ص 6
230/2	سفرنامہ پنجاب، ص 17
230/3	بحوالہ حیات جاوید، حصہ اول، ص 249
230/4	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 509
231/1	ایضاً، ص 406
231/2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 509
231/3	مقالات سرسید، حصہ 13، ص 371
231/4	سفرنامہ پنجاب، ص 179
231/5	مکتوبات سرسید، جلد دوم، ص 278
231/6	سفرنامہ پنجاب، ص 278
231/7	مقالات سرسید، حصہ 13، ص 371
231/8	سفرنامہ پنجاب، ص 86
232/1	ایضاً، ص 278
232/2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 156
232/3	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 12 نومبر 1875ء، ضمیمہ ص 3
232/4	ایضاً
232/5	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 90
232/6	مقالات سرسید، حصہ دہم، ص 223
232/7	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 90
232/8	ایضاً، ص 149-150
232/9	مقالات سرسید، حصہ دہم، ص 196
233/1	بحوالہ حیات جاوید، حصہ دوم، ص 494
233/2	ایضاً، حصہ اول، ص 20
234/1	خطوط سرسید، ص 237
[illegible]	[illegible]، ص 97

صفحہ/اشارہ	حوالہ
2 / 235	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 522- 523
3 / 235	ایضاً ص 153
1 / 236	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 595
2 / 236	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 28 مئی 1875ء ضمیمہ ص 6
3 / 236	ایضاً ص 7
1 / 237	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 162
2 / 237	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 448
3 / 237	مقالات سرسید، حصہ دہم ص 197
4 / 237	ایضاً ص 198
5 / 237	ایضاً ص 199
6 / 237	ایضاً ص 200
7 / 237	ایضاً ص 201
8 / 237	ایضاً
9 / 237	ایضاً
10 / 237	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 526
1 / 238	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 418- 419
1 / 239	ایضاً ص 419- 420
1 / 240	ایضاً ص 420- 421
2 / 240	ایضاً ص 402
3 / 240	ایضاً ص 421
4 / 240	مکتوبات سرسید، جلد دوم ص 309
1 / 241	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 421
2 / 241	ایضاً ص 422
1 / 243	ایضاً ص 435
1 / 244	خطوط سرسید ص 135
2 / 244	ایضاً ص 279
3 / 244	مقالات سرسید، حصہ دہم ص 179
1 / 245	ایضاً ص 180- 181
2 / 245	ایضاً ص 181
1 / 246	ایضاً ص 182
2 / 246	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 417- 418
1 / 247	ایضاً ص 416
2 / 247	ایضاً ص 418
3 / 247	ایضاً ص 429

صفحہ/اشارہ	حوالہ
2 / 248	ایضاً ص 431
1 / 249	بحوالہ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج، دیباچہ ص 2
2 / 249	مقالات سرسید، حصہ دہم ص 154
3 / 249	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 506
4 / 249	مقالات سرسید، حصہ دہم ص 228
5 / 249	بحوالہ مجموعہ لیکچرز محسن الملک ص 323
1 / 250	مکتوبات سرسید، جلد اول ص 310
2 / 250	مکتوبات سرسید، جلد دوم ص 131
3 / 250	خطبات سرسید، جلد دوم ص 461- 462
1 / 251	سفرنامہ پنجاب ص 86
2 / 251	ایضاً ص 166- 167
1 / 252	مکتوبات سرسید، جلد دوم ص 426
2 / 252	رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، اجلاس نہم ص 170
3 / 252	دی لائف اینڈ ورک آف سرسید، ص 179
1 / 253	مکتوبات سرسید ص 577
2 / 253	خطوط سرسید ص 335
3 / 253	ایضاً ص 303
4/253	ایضاً ص 153
5/253	ایضاً ص 304
1/254	ایضاً ص 168
2/254	ایضاً ص 200
3/254	مکتوبات سرسید ص 317
4 / 254	خطوط سرسید ص 258
5 / 254	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 129
1 / 255	مکتوبات سرسید، جلد اول ص 201
2 / 255	ایضاً ص 202
3 / 255	مکتوبات سرسید ص 376
1 / 256	بحوالہ دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص 189

انجمن سائنٹفک

صفحہ/اشارہ	حوالہ
1 / 257	مکاتیب سرسید احمد خاں ص 41
2 / 257	خطبات سرسید جلد دوم ص 496
3 / 257	[illegible]

صفحہ/اشارہ — حوالہ

257/4 خطبات سرسید، جلد دوم ص 497

258/1 ایضاً ص 498

258/2 ایضاً ص 499

259/1 مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 24-27

259/2 خطبات سرسید، جلد دوم ص 500

259/3 خطوط سرسید ص 276

260/1 خطبات سرسید، جلد دوم ص 503

260/2 ایضاً ص 500

260/3 ایضاً ص 505-506

260/4 ایضاً ص 508

261/1 ایضاً ص 508-509

261/2 مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 324

261/3 ایضاً ص 458

261/4 ایضاً ص 325

261/5 پانیئر، 10 نومبر 1888ء بحوالہ سرسید احمد خاں (سیاسی مطالعہ) ص 230

262/1 مکتوبات سرسید ص 629

262/2 مکاتیب سرسید احمد خاں ص 304

263/1 رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف سرسید احمد خاں، ص 245

263/2 ایضاً ص 109

264/1 مکاتیب سرسید احمد خاں ص 72-75

264/2 مکمل مجموعہ لیکچرز ص 386-387

تصنیف و تالیف

267/1 تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 2

267/2 سفرنامہ پنجاب ص 175

269/1 قواعد صرف و نحو زبان اردو ص 40-41

269/2 تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 19

269/3 جلاء القلوب بذکر المحبوب ص 64

269/4 تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 20

270/1 ایضاً ص 19

270/2 ایضاً ص 21-22

270/3 تسہیل فی جر الثقیل ص 2-3

271/1 تحفہ حسن مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 24

صفحہ/اشارہ — حوالہ

271/2 فوائد الافکار فی اعمال الفرجار مشمولہ مقالات سرسید، حصہ 16، ص 98

272/1 آثار الصنادید (طبع اول)، دیباچہ ص 2

272/2 بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 55

272/3 بروایت شبلی، مقالات شبلی، جلد دوم، ص 58

273/1 آخری مضامین، ص 48

273/2 کلمۃ الحق مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 78

273/3 تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول، ص 135-136

274/1 سلسلۃ الملوک، ص 2

274/2 ایضاً ص 15

274/3 بروایت حالی، حیات جاوید، ضمیمہ 3، ص 14

275/1 ترجمہ کیمیائے سعادت مشمولہ تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 145

275/2 آثار الصنادید (طبع دوم)، دیباچہ ص 3

275/3 بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول ص 61

275/4 مقالات سرسید، حصہ 15، ص 169

277/1 سرکشی ضلع بجنور ص 1

277/2 مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 400

277/3 اسباب سرکشی ہندوستان ص 1

277/4 سفرنامہ پنجاب ص 176

277/5 اسباب سرکشی ہندوستان ص 1

278/1 بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم ص 32

279/1 لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم ص 1

279/2 ایضاً، حصہ اول ص 2

279/3 ایضاً ص 3

279/4 ایضاً، حصہ دوم ص 10

280/1 مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 400

280/2 لائل محمڈنز آف انڈیا، حصہ دوم ص 1

280/3 ایضاً، حصہ اول ص 9

280/4 دیباچہ تصحیح تاریخ فیروز شاہی مشمولہ مقالات سرسید، حصہ 16، ص 510-511

281/1 مکتوبات سرسید ص 19-21

282/1 تبیین الکلام، حصہ دوم ص 341

صفحہ/اشارہ	حوالہ
2 / 282	احکام طعام اہل کتاب ص 3
3 / 282	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 328
4 / 282	مکتوبات سرسید، جلد اول ص 76
5 / 282	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 148
6 / 282	ایضاً ص 328
1 / 283	خطبات احمدیہ ص 7
1 / 284	ایضاً ص 11-13
1 / 285	خطوط سرسید ص 83
2 / 285	خطبات احمدیہ ص 13
3 / 285	مکتوبات سرسید، جلد اول، ص 72
4 / 285	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 141
5 / 285	ایضاً ص 188
6 / 285	ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ص 1
7 / 285	ایضاً ص 4
1 / 287	ایضاً ص 100
2 / 287	قدیم نظام دیہی ہندوستان ص 1
1 / 288	تحریر فی اصول التفسیر ص 3-4
1 / 289	خطوط سرسید ص 180
2 / 289	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 543
3 / 289	مکتوبات سرسید، جلد دوم ص 181
4 / 289	خطوط سرسید ص 339
5 / 289	ایضاً ص 340
6 / 289	مکتوبات سرسید ص 379
7 / 289	تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول ص 2
1 / 290	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 18 مئی 1878ء ص 573
2 / 290	خطبات احمدیہ ص 448
3 / 290	النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی، باب ہشتم ص 3
4 / 290	ازالۃ الغین عن ذی القرنین ص 2
1 / 291	ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم ص 2
2 / 291	ایضاً ص 3
3 / 291	خطوط سرسید ص 242
4 / 291	ایضاً ص 329
5 / 291	تحریر فی اصول التفسیر ص 30
1 / 292	فضائل الامام سید مسائل جدید الکلام، سرورق

صفحہ/اشارہ	حوالہ
2 / 292	خطوط سرسید ص 301
3 / 292	تبرئۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام، سرورق
1 / 293	آخری مضامین ص 7
2 / 293	خطوط سرسید ص 341
3 / 293	ایضاً
4 / 293	سرورق ہائے کتب مذکورہ
1 / 295	دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں، ص 268
1 / 296	مکتوبات سرسید، جلد دوم ص 175

مطاعن و فتاوی

صفحہ/اشارہ	حوالہ
1 / 297	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 523
2 / 297	ایضاً ص 530
1 / 298	ایضاً ص 514
2 / 298	مقالات سرسید، حصہ 13 ص 365
3 / 298	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 514
4 / 298	مکاتیب سرسید احمد خاں ص 305
5 / 298	خطوط سرسید ص 274
6 / 298	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید ص 127-128
1 / 299	مقالات سرسید، حصہ ہفتم ص 287
2 / 299	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 523
3 / 299	ایضاً ص 166
4 / 299	مقالات سرسید، حصہ ہفتم ص 288
5 / 299	ابطال غلامی ص 142
6 / 299	تفسیر السموات ص 26
1 / 303	مقالات سرسید، جلد سوم ص 21
2 / 303	ایضاً ص 20-22
3 / 303	تہذیب الاخلاق، شوال 1292ھ ص 6
1 / 304	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 163
2 / 304	ایضاً ص 467
3 / 304	مقالات سرسید، حصہ ہفتم ص 288
4 / 304	ایضاً، حصہ ہفتم ص 162
5 / 304	تہذیب الاخلاق، جلد دوم ص 567
6 / 304	ایضاً ص 173
1 / 305	ایضاً ص 569

صفحہ/اشارہ	حوالہ
305 / 2	مقالات سرسید، حصہ 15، ص 158
305 / 3	ایضاً، حصہ پنجم، ص 158
305 / 4	ایضاً، حصہ 15، ص 3
306 / 1	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 78- 79
306 / 2	ایضاً، ص 154
306 / 3	النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی، باب ہشتم، ص 10
306 / 4	مقالات سرسید، حصہ پنجم، ص 5
306 / 5	بحوالہ برگ گل کراچی، سرسید نمبر (نقش ثانی)، ص 346
307 / 1	مقالات سرسید، حصہ 15، ص 3
307 / 2	النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی، باب ہشتم، ص 9
307 / 3	سفرنامہ پنجاب، ص 196
308 / 1	خطوط سرسید، ص 99
308 / 2	ایضاً، ص 78
308 / 3	مکتوبات سرسید، ص 227

قابل ذکر واقعات

صفحہ/اشارہ	حوالہ
309 / 1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 570
310 / 1	ایضاً
311 / 1	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 146
311 / 2	مقالات سرسید، جلد نہم، ص 75
312 / 1	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 270
312 / 2	تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول، ص 24
312 / 3	خطبات سرسید، جلد دوم، ص 512
313 / 1	حیات جاوید، حصہ اول، ص 140
313 / 2	خطوط سرسید، ص 88
314 / 1	تصانیف احمدیہ، حصہ اول، جلد اول، ص 135- 136
314 / 2	خطوط سرسید، ص 222
314 / 3	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، 30 جون 1976ء، ص 405
315 / 1	النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی، باب ہشتم، ص 43
315 / 2	آخری مضامین، ص 91- 92
315 / 3	ایضاً، ص 92
316 / 1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 119

صفحہ/اشارہ	حوالہ
317 / 1	آثار الصنادید (طبع اول)، باب اول، ص 142
317 / 2	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 483- 484
318 / 1	حیات جاوید، حصہ دوم، ص 492
318 / 2	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 174
318 / 3	خطوط سرسید، ص 318
319 / 1	مقالات سرسید، حصہ چہارم، ص 293
319 / 2	ایضاً، ص 294
319 / 3	ایضاً
319 / 4	ایضاً
320 / 1	ایضاً، ص 295
320 / 2	ایضاً
320 / 3	ایضاً، ص 296
320 / 4	ایضاً
321 / 1	ایضاً
322 / 1	حیات جاوید، ضمیمہ 3، صفحہ 7
322 / 2	ایضاً، ص 8
323 / 1	ایضاً
323 / 2	ایضاً، ص 9
323 / 3	ایضاً 10
324 / 1	ایضاً
324 / 2	ایضاً
324 / 3	ایضاً
324 / 4	ایضاً، ص 11
325 / 1	ایضاً
326 / 1	ایضاً، ص 12
326 / 2	ایضاً، ص 13

ذاتی اوصاف

صفحہ/اشارہ	حوالہ
327 / 1	مکتوبات سرسید، جلد اول، ص 55
329 / 1	ایضاً، جلد دوم، ص 166- 167
329 / 2	خطوط سرسید، ص 259
329 / 3	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، یکم ستمبر 1876ء، ص 543
329 / 4	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 573

صفحہ/اشارہ	حوالہ
329 / 6	مکتوبات سرسید، جلد اول، ص 159
329 / 7	مکتوبات سرسید، ص 692
329 / 8	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 490
329 / 9	ایضاً، حصہ اول، ص 53
330 / 1	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 183
330 / 2	سفرنامہ پنجاب، ص 187
330 / 3	خطوط سرسید، ص 328
330 / 4	مقالات سرسید، جلد پنجم، ص 303
330 / 5	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 138
330 / 6	ایضاً، ص 90
330 / 7	مکتوبات سرسید، ص 38
330 / 8	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ دوم، ص 477
330 / 9	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 392
330 / 10	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 62
330 / 11	خطوط سرسید، ص 222
331 / 1	ایضاً، ص 328
331 / 2	ایضاً، ص 109
331 / 3	سفرنامہ پنجاب، ص 75
331 / 4	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 413
331 / 5	خطوط سرسید، ص 141
332 / 1	ایضاً، ص 67
332 / 2	مکتوبات سرسید، جلد دوم، ص 88
332 / 3	مقالات سرسید، جلد 13، ص 359
332 / 4	خطوط سرسید، ص 134
332 / 5	ایضاً، ص 195
332 / 6	بحوالہ تذکرہ سرسید، ص 339
333 / 1	خطوط سرسید، ص 62-64
333 / 2	ایضاً، ص 63
333 / 3	تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص 163
333 / 4	مکتوبات سرسید، ص 684
333 / 5	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 281
333 / 6	مکتوبات سرسید، جلد اول، ص 109
333 / 7	مکتوبات سرسید، ص 631
333 / 8	مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص 26
333 / 9	سفرنامہ پنجاب، ص 45
334 / 1	مکاتیب سرسید احمد خاں، ص 11

حرفِ آخر

صفحہ/اشارہ	حوالہ
335 / 1	خطوط سرسید، ص 200
335 / 2	ایضاً، ص 313
335 / 3	بروایت حالی، حیات جاوید، حصہ اول، ص 303
335 / 4	تفسیر السموات، ص 98
336 / 1	سفرنامہ پنجاب، ص 78
336 / 2	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 7 دسمبر 1878ء، ص 1396

مطالعہ سرسید کے ماخذ

(بلحاظ ترتیب حروف تہجی)

تصانیفِ سرسید

آثار الصنادید (طبع اول) مطبع سید الاخبار دہلی 1847ء

......ایضاً...... طبع دوم (برائے حوالہ متن) مطبع سلطانی و مطبع احمدی دہلی 1854ء

......ایضاً...... (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی 1966ء

آئینِ اکبری (تصحیح) مطبع اسمٰعیلی دہلی 1272ھ (1856ء)

ابطالِ غلامی مطبع مفید عام آگرہ 1893ء

احکام طعام اہلِ کتاب۔ مطبع منشی نول کشور کانپور 1868ء

ازالۃ الغین عن ذی القرنین۔ مطبع مفید عام اکبر آباد 1307ھ (1890ء)

اسباب بغاوتِ ہند (مرتبہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی) اردو اکیڈمی سندھ کراچی 1957ء

......ایضاً...... (مرتبہ فوق کریمی) یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ 1958ء

اسباب سرکشی ہندوستان (اسباب بغاوت ہند) مفصلائٹ پریس آگرہ 1859ء

التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان درباب ترقی تعلیم ہند۔ پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور 1863ء

الدعا والاستجابہ۔ مطبع مفید عام آگرہ 1892ء

النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی۔ مطبع مفید عام آگرہ 1889ء

تاریخ فیروز شاہی (تصحیح)۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ 1862ء

تبریئۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام ۔ مطبع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ 1895ء

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام

(حصہ اول) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور 1862ء

(حصہ دوم) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور علی گڑھ 1865ء

(حصہ سوم) مشمولہ تصانیف احمدیہ 'حصہ اول' جلد دوم

تحریر فی اصول التفسیر۔ مطبع مفید عام آگرہ 1892ء
تحفۂ حسن (ترجمہ) مشمولہ تصانیف احمدیہ' حصہ اول' جلد اول
ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم۔ مطبع مفید عام آگرہ 1307ھ (1890ء)
تسہیل فی جر الثقیل (ترجمہ) تیموں کا چھاپہ خانہ آگرہ 1844ء
تصانیف احمدیہ۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ
(حصہ اول' جلد اول) 1883ء
(حصہ اول' جلد دوم) 1887ء
(حصہ اول' جلد سوم تا جلد نہم) دیکھئے تفسیر القرآن جلد اول تا جلد ہفتم بالترتیب
تفسیر الجن والجان علی مافی القرآن۔ مطبع مفید عام آگرہ 1309ھ (1892ء)
تفسیر السمٰوات۔ مطبع مفید عام آگرہ 1898ء
......ایضاً (برائے حوالہ متن) نول کشور سٹیم پریس لاہور 1909ء
تفسیر القرآن - انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ
(جلد اول) 1880ء
(جلد دوم) 1882ء
(جلد سوم) 1885ء
(جلد چہارم) 1888ء
(جلد پنجم) 1892ء (جلد ششم) 1895ء
(جلد ہفتم) مطبع مفید عام آگرہ 1904ء
توزک جہانگیری (تصحیح) پرائیویٹ پریس سرسید غازی پور و علی گڑھ 1864ء
جام جم۔ چھاپہ خانہ مستقر الخلافت اکبر آباد 1840ء
جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ لیتھوگرافک پریس سید محمد خان بہادر دہلی 1843ء
خطبات احمدیہ (الخطبات الاحمدیہ علی العرب والسیرۃ المحمدیہ) مسلم پرنٹنگ پریس لاہور
خلق الانسان علی مافی القرآن۔ مطبع مفید عام اکبر آباد 1309ھ (1892ء)
راہ سنت در رد بدعت۔ مشمولہ تصانیف احمدیہ حصہ اول' جلد اول
رسالہ خیر خواہان مسلمانان (دیکھئے لائل محمڈنز آف انڈیا)
ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر۔ ہنری ایس کنگ لندن 1872ء
سرکشی ضلع بجنور (برائے حوالہ متن) مفصلائٹ پریس آگرہ 1858ء
......ایضاً ...... (مرتبہ شرافت حسین مرزا) ندوۃ المصنفین دہلی 1964ء
......ایضاً ...... (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) سلمان اکیڈمی کراچی 1962ء

سلسلۃ الملوک۔ مطبع شرف المطابع دہلی 1852ء
سیرتِ فریدیہ۔ مطبع مفید عام آگرہ 1896ء
ایضاً...... (مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی) پاک اکیڈمی کراچی (1964ء)
شکریہ (مراد آباد کے مسلمانوں کا) مفصلائٹ پریس میرٹھ (1859ء)
فضائل الامام من رسائل حجۃ الاسلام (تصحیح و تدوین) مطبع مفید عام اکبر آباد 1310ھ (1893ء)
فوائد الافکار فی اعمال الفرجار (ترجمہ) چھاپہ خانہ سید الاخبار دہلی 1846ء
قدیم نظام دیہی ہندوستان۔ مطبع سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ 1878ء
قواعد صرف و نحو زبان اردو (مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری) ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان کراچی 1990ء
قولِ متین در ابطالِ حرکتِ زمین۔ مطبع سید الاخبار دہلی 1265ھ (1848ء)
کتابِ فقرات۔ مطبع ضیائی میرٹھ (1870ء)
کلمۃ الحق۔ مشمولہ تصانیف احمدیہ 'حصہ اول' جلد اول
کیمیائے سعادت (جزوی ترجمہ) مشمولہ تصانیف احمدیہ 'حصہ اول' جلد اول
لائل محمڈنز آف انڈیا (رسالہ خیر خواہان مسلمانان) مفصلائٹ پریس میرٹھ
(حصہ اول) 1860ء
(حصہ دوم) 1860ء
(حصہ سوم) 1861ء
نمیقہ فی بیان مسئلہ تصورِ شیخ۔ مشمولہ تصانیف احمدیہ 'حصہ اول' جلد اول

سرسید کی تحریروں اور تقریروں کے مجموعے

آخری مضامین (برائے حوالہ متن) مرتبہ امام الدین گجراتی رفاہِ عام پریس لاہور 1898ء
ایضاً...... (مرتبہ امام الدین گجراتی و احمد بابا مخدومی) کواپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور (طبع سوم)
انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (مرتبہ اصغر عباس) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982ء
تفسیر القرآن (جلد ہشتم) مشتمل بر متفرق مضامین مذہبی۔ فیروز پرنٹنگ پریس لاہور 1921ء
تہذیب الاخلاق (جلد دوم) مرتبہ منشی فضل الدین۔ مصطفائی پریس لاہور 1893ء
خطباتِ سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور
(جلد اول) 1972ء
(جلد دوم) 1973ء

خطوطِ سرسید (مرتبہ سید راس مسعود) نظامی پریس بدایوں 1924ء
سفرنامہ پنجاب (سید احمد خاں کا) مرتبہ سید اقبال علی۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ 1884ء
مسافرانِ لندن (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور 1961ء
مقالاتِ سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور

حصہ اول	1962ء
حصہ دوم	1961ء
حصہ سوم	1961ء
حصہ چہارم	1962ء
حصہ پنجم	1962ء
حصہ ششم	1962ء
حصہ ہفتم	1962ء
حصہ ہشتم	1962ء
حصہ نہم	1962ء
حصہ دہم	1962ء
حصہ یازدہم	1963ء
حصہ دوازدہم	1963ء
حصہ سیزدہم	1963ء
حصہ چہاردہم	1965ء
حصہ پانزدہم	1963ء
حصہ شانزدہم	1965ء

مقالاتِ سرسید (مرتبہ محمد عبداللہ خاں خویشگی) نیشنل پرنٹرز کمپنی علی گڑھ 1952ء
مکاتیبِ سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) یونین پرنٹنگ پریس دہلی 1960ء
مکتوباتِ سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور 1959ء
مکتوباتِ سرسید (طبع دوم) مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور
(جلد اول) 1976ء
(جلد دوم) 1985ء
مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور 1900ء

کتب بمتعلق حیات و افکارِ سرسید

پاکستان کا معمار اول (صفدر سلیمی) ادارہ طلوع اسلام لاہور 1967ء

تذکرہ سرسید (محمد امین زبیری) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور 1961ء

حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور 1901ء

حیاتِ سرسید (سید نور الرحمٰن) انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1950ء

سرسید احمد خاں (عبد السلام خورشید) قومی کتب خانہ لاہور 1963ء

سرسید احمد خاں...... ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی 1977ء

سرسید احمد خاں...... حالات و افکار (مولوی عبد الحق) انجمن ترقی اردو کراچی 1975ء

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد (ثریا حسین) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1993ء

سرسید اور اردو صحافت (طاہر تسیم) مکتبہ عالیہ لاہور 1980ء

سرسید اور اصلاح معاشرہ (شاہد حسین رزاقی) ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1963ء

سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی نثر (ڈاکٹر سید عبد اللہ) مکتبہ کارواں لاہور 1960ء

سرسید اور علی گڑھ تحریک (خلیق احمد نظامی) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ 1983ء

سرسید پر ایک نظر (صلاح الدین احمد) اکادمی پنجاب لاہور 1960ء

سرسید کا علمی کارنامہ (قاضی احمد میاں اختر) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی 1964ء

سرسید کی تعلیمی تحریک (اختر الواسع) مکتبہ عالیہ لاہور 1991ء

سرسید کی صحافت (ڈاکٹر اصغر عباس) انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1975ء

سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی (ضیاء الدین لاہوری) ادارہ تصنیف و تحقیق کراچی 1982ء

سرسید کے سیاسی افکار (ڈاکٹر فوق کریمی) ایشیایک سنٹر لاہور 1990ء

مضحکات و مطائبات سرسید (شیر علی خاں سرخوش) گیلانی برقی پریس لاہور

(جلد اول) طبع اول

(جلد دوم) طبع اول

مطالعہ سرسید احمد خاں (عبد الحق) الرائیس ٹریڈرز لاہور

حدیثِ دیگراں

اوراقِ گم گشتہ (رئیس احمد جعفری) محمد علی اکیڈمی لاہور 1968ء

ایڈریس اور اسپیچیں (متعلق ایم اے او کالج) مرتبہ نواب محسن الملک۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ 1898ء

تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) علی گڑھ 1938ء

تصفیۃ العقائد (محمد قاسم نانوتوی) دار الاشاعت کراچی 1976ء

تفسیرِ حقانی (تفسیر فتح المنان) جلد دوم (محمد عبدالحق حقانی) دار الاشاعت تفسیر حقانی دہلی (1938ء) 1357ھ

تہذیب الاخلاق (جلد چہارم) مرتبہ ملک فضل الدین۔ حجازی پرنٹنگ پریس لاہور۔

جنگِ آزادی 1857ء (محمد ایوب قادری) پاک اکیڈمی کراچی 1976ء

غدر کی صبح شام (مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی) ہمدرد پریس دہلی 1926ء

غدر کے فرمان (مرتبہ خواجہ حسن نظامی) اہل بیت پریس دہلی 1944ء

مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک (مرتبہ ملک فضل الدین) نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس پریس لاہور 1904ء

مضامینِ جمال الدین افغانی (مترجمہ محمد عبدالقدوس قاسمی) ادارہ فروغ اردو لاہور (طبع دوم)

مقالاتِ حالی (مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی) جامع پریس دہلی
(حصہ اول) 1934ء
(حصہ دوم) 1936ء

مقالاتِ شبلی (جلد دوم) مطبع معارف اعظم گڑھ 1931ء

مقالاتِ یوم شبلی (مرتبہ عبداللہ خاں) اردو مرکز لاہور 1961ء

مکاتیبِ شبلی (حصہ اول) مرتبہ سید سلیمان ندوی۔ مطبع شاہی لکھنؤ 1916ء

موجِ کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور 1940ء

موعظہ حسنہ (ڈپٹی نذیر احمد) مرتبہ عبدالغفور شہباز۔ مطبع انصاری دہلی (1890ء) 1308ھ

میکالے کا نظریہ تعلیم (مرتبہ و مترجمہ عبدالحمید صدیقی) روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی 1965ء

نصرۃ الابرار (مرتبہ مولوی محمد لدھیانوی) مطبع صحافی لاہور (1888ء)

یادگارِ شبلی (شیخ محمد اکرام) ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور 1970ء

روئدادیں، اخبارات و رسائل

برگِ گل کراچی، سرسید نمبر (نقش ثانی) 69-1968ء

تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے متذکرہ شمارے

روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ 1895ء

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اخبار سائنٹفک سوسائٹی) کے متذکرہ شمارے

WORKS IN ENGLISH

Books written by Sir Syed

A Series of Essays on the Life of Mohammad
Trubner & Co., London. (1869-70)

Review on Dr. Hunter's Indian Musalmans
Premier Book House, Lahore.

Strictures upon the Present Educational System in India
Henry S. King & Co., London. (1869)

The Causes of the Indian Revolt
The Book House, Lahore.

Compiled Writings and Speeches of Sir Syed

Political Profile of Sir Sayyid Ahmad Khan
(Ed. Hafeez Malik) Islamic University, Islamabad. (1982)

Sir Sayyid Ahmad Khan's Educational Philosophy:
(A Documentary Record) Ed. Hafeez Malik
National Instt. of Historical & Cultural Research, Islamabad. (1989)

Sir Syed Ahmad Khan on the Present State of Indian Politics
(Ed. Theodore Beck) Pioneers Press Allahabad. (1888)

Writings and Speeches of Sir Syed Ahmad Khan
(Ed. Shan Muhammad) No-Chiketa Publications, Bombay. (1972)

Book on Sir Syed's Life and Thoughts

Hayat-i-Javed
(By Altaf Hussain Hali) Translated by K.H Qadri and D.J Matthews Idarah-i-Adbiyat-I Delhi, Delhi. (1979)

Religious Thoughts of Sayyid Ahmad Khan
(By B.A. Dar) Institute of Islamic Culture, Lahore. (1971)

Sayyid Ahmad Khan
(By K.A Nizami) Govt of India, New Delhi. (1980)

Sayyid Ahmad Khan: A Reinterpretation of Muslim Theology
(By C.W. Troll) Vikas Publishing House, New Delhi. (1978)

Sir Syed Ahmad Khan - A Political Biography
(By Shan Mohammad) Universal Books, Lahore. (1976)

Syed Ahmad Khan
(By Naz) Ferozesons, Lahore. (1971)

Syed Ahmad Khan: Pioneer of Muslim Resurgence
(By M. Hadi Hussain) Institute of Islamic Culture, Lahore. (1970)

Successors of Sir Syed Ahmad Khan
(By Shan Muhammad) Idarah-i Adbiat-i Delhi, Delhi. (1981)

The Founder of Aligarh
(By M. Sadiq) Oxford University Press Karachi (1968)

The Life and Work of Syed Ahmed Khan
(By G.F.I Graham) William Blackwood & Sons, London. (1885)

The Life and Work of Sir Syed Ahmed Khan
(By G.F.I Graham) Hedder & Stoughton, London. (1909)

The Living Influence of the Dead
(By Shah Din) Imperial Press, Allahabad. (1902)

The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan
(By J.M.S. Baljon Jr.) Sh. M. Ashraf, Lahore. (1964)

Miscellanea

Amir Ali
(By K.K. Aziz) Publishers United, Lahore. (1968)

My Life - A Fragment
(By Muhammad Ali Jauhar) Sh.M. Ashraf, Lahore. (1942)

Selected Documents from the Aligarh Archives
(Ed. Yusuf Hussain) University Press, Aligarh. (1966)

The Letters of Sir Walter Raleigh (Vol.1)
(Ed. Lady Raleigh) Mathuen & Co., London. (1926)

AN ESSAY
ON THE
CAUSES OF THE INDIAN REVOLT;
BY
SYUD AHMED KHAN,
PRINCIPAL SUDDER AMEEN OF MORADABAD.

AGRA:

شکریہ

جو مراداباد کے مسلمانوں نے ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۵۹ ع کو کیا

مولفہ

سید احمد خاں صدرالصدور مراداباد

THE
BIJNOUR REBELLION
BY
SYUD UHMUD KHAN,
SUDDER AMEEN OF BIJNOUR.

سرکشی ضلع بجنور
تصنیف
سید احمد خان صدر امین بجنور

AGRA:
1858.

SCHOOL OF ORIENTAL STUDIES

ڈاکٹر هنٹر صاحب کی کتاب

موسوم بہ

"همارے هندوستان کے مسلمانوں پر
کیا از روی ایمان کے ملکہ معظمہ سے بغاوت کرنی
فرض ہے"

پر

سید احمد خان صاحب بہادر سی ایس آئی
کے نکتہ چینی
جسکو ایک مسلمان نے جمع کرکے طبع کیا

اور

هنری ایس کنگ اینڈ کو واقع لندن نے مشتهر کیا

AN ACCOUNT
OF THE
LOYAL
MAHOMEDANS OF INDIA.
Part II.
BY
SYUD AHMED KHAN,
PRINCIPAL SUDDER AMEEN OF MORADABAD.

1860.

AN ACCOUNT
OF THE
LOYAL
MAHOMEDANS OF INDIA.
Part I.

MEERUT:
1860.

SYED AHMED BAHADOOR, C.S.I.,
ON
DR. HUNTER'S "OUR INDIAN MUSSULMANS—
ARE THEY BOUND IN CONSCIENCE TO REBEL
AGAINST THE QUEEN?"

Compiled by a Mahomedan.

PRINTED FOR PRIVATE CIRCULATION.

London:
HENRY S. KING & CO., 65, CORNHILL.

سیرۃ فریدیہ
یعنی
حالات زندگی

وزیر

مولفہ

رسالہ

قدیم نظام دیہی هندوستان

مولفہ

در مطبع

کتاب قرات

تسہیل فی جرالثقیل

بموجب حکم

اور

تصانیف احمدیہ

حصۂ اول — جلد اول

مشتمل بر

کتب و رسائل مذہبی

سنہ ۱۳۱۳ نبوی

سنہ ۱۳۰۰ ہجری — سنہ ۱۸۸۳ ع

جلاء القلوب

بذکر المحبوب صلی اللہ علیہ وسلم

جواد الدولہ سید محمد خان بہادر عارف جنگ

کی تالیف کی ہوئی ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۲۵۹

ہجری میں جناب سید محمد خان بہادر کے

چھاپہ خانہ کے لیتھوگرافک پریس میں سید

عبد الغفور کے اہتمام سے دلی میں چھپی

الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب و السیرۃ المحمدیہ

تصنیف

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب بہادر

کے سی ایس آئی، ایل ایل ڈی، ایف آر ایس

بانئے مدرسۃ العلوم مسلمین علیگڈھ

منزل نقشبندیہ

لاہور

تحریر فی اصول التفسیر

محررہ

المفتقر الی اللہ الصمد السید احمد

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خان صوفی طبع شد

سنہ ۱۸۹۲ ء

سلسلۂ تالیفات وکیل ٹریڈنگ کمپنی لمیٹڈ امرتسر

نمبر ۹

تفسیر السموات

آسمان کی فلسفیانہ و عالمانہ تحقیق کیگئی ہے

ہے کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں لفظ سماء (آسمان)

ہے اس سے کیا مراد ہے اور اہل عرب کس مفہوم کے لئے اس کو

استعمال

مؤلفہ

ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر (مرحوم)

بانی مدرسۃ العلوم علیگڈھ

۱۹۰۹ ء

مطبوعہ نولکشور سٹیم پریس لاہور

الدعاء والاستجابۃ

الفہ

المفتقر الی اللہ الصمد السید احمد

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام منشی قادر علیخان صوفی طبع شد

ابطال غلامی

المسمی

تبریۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام

معہ ایک آرٹکل کے

صنفہ

المفتقر الی اللہ الصمد سید احمد

در مطبع مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خان صوفی طبع شد

تبریۃ الاسلام عن شین الامۃ والغلام

منشہ

الدکتور سر سید احمد خان بہادر کے سی ایس آئی

ایل ایل ڈی

سنہ ۱۸۹۵ ع

وطعام الذین اوتوا الکتٰب حل لکم

احکام طعام اہل کتاب

الفہ

المفتقر الی اللہ الصمد السید احمد

مطبوعہ منشی نولکشور کانپور

سنہ ۱۲۸۵ ہجری

جلد اول] یکم شوال سنہ ۱۲۸۷ ہجری یوم المبارک عیدالفطر نمبر ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اطلاع

جو کچھ روپیہ بابت اس پرچہ کے بطور چندہ خواہ بطور قیمت
[illegible]ل ہو وہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہوگا بلکہ اس پرچہ کے
[illegible] ترقی میں صرف کیا جاویگا ۔

مسلمانوں میں سے جو شخص ساٹھہ روپیہ سالانہ پیشگی بطور
[illegible] دے وہ اس پرچہ کے متعلق معاملات میں صاحب مشورہ ہوگا ۔

علاوہ اس کے جو شخص کچھ روپیہ بطور ڈونیشن دے وہ بشکر
[illegible] قبول کیا جاویگا ۔

یہ پرچہ ہر مہینے میں ایک بار یا دو بار جیسا کہ مقتضاے
[illegible] ہوگا چھپا کریگا قیمت فی پرچہ دو آنہ اور مع محصول
[illegible] آنہ ہوگی مگر خریداروں کو کم سے کم تین روپیہ قیمت اور ایک روپیہ
آٹھ آنہ محصول جملہ چار روپیہ آٹھ آنہ پیشگی بھیجنے ہونگے ۔
اگر کوئی شخص کوئی خاص پرچہ خریدنا چاہے تو اُس کو فی پرچہ
آٹھ آنہ قیمت اور ایک آنہ محصول دینا ہوگا ۔

مضمون نگاروں کو بلا قیمت یہ پرچہ ملیگا اور اُن کو اُس کے تقسیم کا
[illegible] جسکو وہ چاہیں اختیار ہوگا ۔

اس پرچہ میں بجز مضامین متعلق تہذیب اخلاق و حسن
معاشرت کے جہاں تک کہ وہ مسلمانوں سے متعلق ہیں اور کچھہ
مندرج نہوگا ۔

مضمون نمبر ۱

تمہید

اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو
کامل درجہ کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے
تاکہ جس حقارت سے سولیزڈ یعنی مہذب قومیں اُنکو دیکھتی ہیں وہ
رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں ۔

سولیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے
مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اُس سے مراد ہے انسان کے تمام
افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدنی اور طریقہ تمدن
اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی
عمدگی پر پہونچانا اور اُن کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا
جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے اور تمکین اور وقار اور
قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں
تمیز نظر آتی ہے ۔

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ کا صفحہ اول

THE ALIGURH INSTITUTE GAZETTE

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علیگڈھ

جلد ۱ — ۶ اپریل سنہ ۱۸۶۶ع روز جمعہ — نمبر ۲

LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVT. AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS.

ازادي چھاپہ کي هى ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلي اور جبلي حق رعیت کا

NOTICE

This Paper will be issued weekly by the Scientific Society.

The rates of subscription will be as follows.

Annual subscription.	12	" "
Do. with postage.	15	" "

The paper will be distributed gratis to members of the Society.

Members of the Society pay an annual subscription of Rs. 24 and are entitled to receive, without further payment, all the Society's publications, books, lectures, and newspapers.—

اطلاع

یہہ اخبار سیں ٹیفک سوسائٹي علیگڈہ سے هفتہ وار جاري هوتا هى قیمت اسکي حسب تفصیل ذیل هى مگر جو لوگ سیں ٹیفک سوسائٹي کے ممبر هیں اُنکو بلا قیمت ملتا هى ۔

سالانہ قیمت اخبار	۱۲ روپیہ
سالانہ محصول	۳ روپیہ

جو لوگ هماري سوسائٹي کے ممبر هوتے هیں اُنکو چوبیس روپیہ سالانہ دینا پڑتا هى اور کل کتابیں اور اخبار جو سوسائٹي چھاپتي هى بلا قیمت اُنکو ملتي هیں ۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے دوسرے شمارہ کا صفحہ اول*

"خودنوشت افکارِ سرسید" سے چند اہم اقتباسات

انگریزی حکومت

"خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ہندوستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا طرزِ حکومت زیادہ قانونِ عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالیٰ کی تھی۔"

"گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر در حقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکروفریب سے، بلکہ در حقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی۔ سوا اسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنادیا۔"

"ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی کی توقع ہے وہ انگریزوں سے ہے۔"

"ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک نہیں بلکہ اٹرنل (دائمی) ہونی چاہئے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا اُن کی خوشامد کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کے لئے ہے۔"

نظریہ "قوم"

"تمام انسان بالکل شخصِ واحد ہیں اور میں "قوم" کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ نہیں پسند کرتا۔"

"وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔"

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں مَیں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔"

"یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔"

(حوالہ جات کی تفصیل "خودنوشت افکارِ سرسید" میں)